متاعِ دین و دانش

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے مختلف ومتنوع موضوعات
پر لیے گئے تاثراتی، تجزیاتی، علمی وادبی اور فکر انگیز انٹرویوز کا ایک حسین مرقع!

مقدمہ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ترتیب وتدوین

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

طبع اول

جمادی الاخری ۱۴۳۵ھ مطابق اپریل ۲۰۱۴ء

نام کتاب : متاعِ دین ودانش

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے لیے گئے انٹرویوز کا مجموعہ)

ترتیب وتدوین : عبدالہادی اعظمی ندوی

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

صفحات : ۳۵۱

کمپوزنگ : الحمد گرافکس، علی گڑھ

ملنے کے پتے:

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبة الشباب العلمية الجديدة، ندوہ روڈ، لکھنؤ

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرست

﴿۴﴾
میری علمی ومطالعاتی زندگی
(۷۵-۶۳)

۹

مسلم پرسنل لا اور جدید تقاضے

(۱۳۷-۱۴۳)

۱۰

اسلامی شریعت-حقائق اور غلط فہمیاں

(۱۴۵-۱۵۱)

۱۱

پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ اور اسلامی قوانین کی تدوین ایک بڑا کارنامہ ہوگا

(۱۵۳-۱۶۳)

۱۲

عالم اسلام - اِمکانات اور اَندیشے!

(۱۸۳-۱۶۵)

۱۳

امریکہ، مغرب اور اسرائیل بمقابلہ عالم اسلام

(۱۹۲-۱۸۵)

۱۴

دنیا کو سچے اور باکردار مسلمانوں کی ضرورت ہے!

(۱۹۳-۲۰۵)

۱۵

عالمی اسلامی کانفرنسوں کے نتائج وفوائد

(۲۰۷-۲۱۵)

۱۶

عصرِ حاضر میں حضرت مجدد الف ثانی کے حکیمانہ طرزِ دعوت کی ضرورت

(۲۱۷-۲۲۱)

۱۷

۱۹۶۷ء کا المیہ اور ہماری ذمہ داریاں

(۲۲۳-۲۲۸)

﴿۱۸﴾
اسلامی بیداری - داعیوں اور حکومتوں کے فرائض
(۲۳۶-۲۲۹)

﴿۱۹﴾
نوجوانوں کی بے چینی کے اسباب اور اس کا علاج
(۲۴۸-۲۳۷)

﴿۲۰﴾
اخلاقی قیادت کر کے ہی مسلمان اس ملک کی ناگزیر ضرورت بن سکتے ہیں!
(۲۵۶-۲۴۹)

﴿۲۱﴾

ملک کی خدمت اور اس کے لیے قربانی۔مسلمانوں کی ذمہ داری

(۲۵۷-۲۶۲)

﴿۲۲﴾

ایجوکیشن، پولیس اور پریس درست ہوجائیں تو اس ملک میں جینا آسان ہوجائے

(۲۶۳-۲۶۷)

﴿۲۳﴾

مختلف ملّی مسائل، انتخابات، ایرانی انقلاب، قذافی کی بے راہ روی، اور فیصل ایوارڈ قبول کرنے سے متعلق ایک چشم کشا گفتگو

(۲۶۹-۲۸۴)

﴿۲۴﴾

ندوۃ العلماء کا طریقِ کار، عالم اسلام کی چند قائدانہ کردار کی حامل شخصیات کی وفات اور ہندوستان کا ایٹمی تجربہ

(۲۸۵-۳۰۰)

﴿۲۵﴾

دو ہفتے مغرب اقصی (مراکش) میں

(۳۱۲-۳۰۱)

﴿۲۶﴾

دیارِ مغرب میں چند روز

(۳۲۲-۳۱۳)

﴿۲۷﴾

مولانا محمد الیاس کاندھلوی، شیخ حسن البنا شہید، علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے بارے میں تاثرات

(۳۲۸-۳۲۳)

﴿۲۸﴾

رابطہ عالم اسلامی-خدمات واقدامات

(۳۳۴-۳۲۹)

﴿اشاریے﴾

(۳۵۱-۳۳۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و دعوت نے عالم اسلام ہی پر نہیں پوری دنیا پر جو نقوش چھوڑے ہیں، وہ آج بھی تازہ ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس معتدل فکر کی ضرورت موجودہ حالات میں اور زیادہ محسوس کی جاری ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے فکر کی پختگی اور توازن و اعتدال کے ساتھ جو ایمانی بصیرت و فراست عطا فرمائی تھی، وہ مولانا کا امتیاز ہے، انھوں نے اپنی نگاہ بصیرت سے عالم اسلام کے مستقبل کو جھانک کر دیکھا تھا، اور اپنی کتابوں میں بہت سے ان خطرات و خدشات سے آگاہ کیا تھا جو آج ایک حقیقت بن کر سامنے آرہے ہیں، عالم عربی مولانا کی فکر وسعی کی جولان گاہ رہا ہے، وہ اپنی نگاہوں سے عالم عربی کو پھر اس مقام پر دیکھنا چاہتے تھے جو اس کی اصل جگہ تھی، انھوں نے سیکڑوں بار عالم عربی کو اس نقطۂ وحدت و اتصال سے وابستہ ہونے پر زور دیا جو عالم عربی کے لیے رہا ہے اور اسی سے دنیا میں اس کی عزت ہے، انھوں نے اقبالؔ کے اس شعر کو بڑے درد کے ساتھ عربوں کے سامنے سنایا، اور ان کے دلوں پر دستک دی ہے۔

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی

ان کی دعوت و فکر کے آفاق بہت وسیع ہیں، انھوں نے یورپ کو بھی خطاب کیا ہے اور دنیا کے مختلف ملکوں کو ان کی کامیابیوں کے نسخے بتائے ہیں، ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی وہ آبرو رہے ہیں، اور بلا تفریق مذہب و ملت انھوں نے یہاں کی آبادی کو خطاب کیا ہے اور انسانوں کے اصل جوہر انسانیت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے، اور انسانوں کے ضمیر کو للکارا ہے۔

حضرت مولانا کی یہ تحریریں اور تقریریں بار بار چھپی ہیں، اور ان شاء اللہ چھپتی رہیں گی، لیکن اس کی ضرورت تھی کہ موضوعات کی ترتیب سے ان کو الگ الگ شائع کیا جائے، بڑی خوشی کی بات ہے کہ مرکز الإمام أبي الحسن الندوي، دار عرفات کے ایک باحث عزیزی عبدالہادی سلمہ

نے اس کا بیڑا اٹھایا، الحمد للہ آٹھ کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں، اور متعدد زیر ترتیب ہیں۔

پیش نظر کتاب ''متاع دین و دانش'' حضرت مولانا کے ان اہم انٹرویوز کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ان سے لیے جاتے رہے ہیں، اس میں ان کے دل کا درد بھی ہے، اور فکر کی بلندی بھی، دعوت کا توازن واعتدال بھی ہے اور روح کی بالیدگی بھی، اور اس میں بہت سے ایسے تاریخی حقائق آ گئے ہیں جو شاید مشکل سے ایک جگہ نظر آئیں۔

عزیز القدر مولوی عبد الہادی سلمہ کی یہ بہت مفید کوشش ہے، انھوں نے اس میں ذیلی عناوین بھی قائم کیے ہیں، اور ضرورت کی جگہ حواشی بھی تحریر کیے ہیں، اور انڈکس بھی تیار کر دیا ہے، اس طرح یہ ایک متاع گراں مایہ ہے جو دعوت وفکر میں مشغول ہونے والوں کے لیے بیش بہا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس کو سب کے لیے مفید بنائے۔

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ

بلال عبد الحی حسنی ندوی

مركز الإمام أبي الحسن الندوي

دار عرفات، رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
(معتمد تعلیمات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى، أما بعد!

پیشِ نظر رسالہ "متاعِ دین و دانش" مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے اُن اِنٹرویوز کا مجموعہ ہے جو مختلف مناسبتوں سے اُنھوں نے بعض تعلق والوں کو دیے، جن میں ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی، مولانا اسحاق جلیس ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

انٹرویو لینے والوں نے عالمی حالات اور مسلمانوں کے مسائل، خاص طور سے بلادِ عربیہ کے مسائل، اور ملکی سطح پر ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کے مسائل کو موضوع بنایا ہے، اور خود ان کی شخصیت سے متعلق بھی سوالات کیے ہیں کہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں کیا عوامل رہے، اور کن کتابوں اور کن شخصیات نے ان پر زیادہ اثر ڈالا۔ مولانا نے ان سارے سوالات کے جوابات بے تکلف اور واضح انداز سے دیے ہیں۔

اسی طرح بلادِ عربیہ اور مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش سے متعلق اُن کا جو نظریہ تھا، وہ بھی واضح انداز میں ان سوالات کے جواب میں ملتا ہے۔ ان میں سے بہت سے مسائل پر وہ کتابوں میں تفصیل سے ان حقائق و امکانات اور خدشات کا اظہار کر چکے ہیں، خاص طور پر "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"، "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں، مگر وہ کتابیں خواص کے لیے ہیں۔ ان انٹرویوز کے جواب میں

مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ان مسائل اور قضایا اور مولاناؒ کے نقطۂ نظر کو عوام بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، بعض واقعات پر مولانا کا نقطۂ نظر اُس وقت عوام کیا خواص کے بھی سمجھ میں نہیں آیا، مگر بعد کے واقعات اور حالات نے مولانا کے نقطۂ نظر کی تصدیق کی جس سے مولاناؒ کی بصیرت اور عالم اسلام کے حالات کے رخ پر گہری نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے: ''اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ''۔

پندرہویں صدی کے شروع میں اور اس سے قبل عالم اسلام میں حالات نے جو رخ اختیار کیا، اور اسلامی بیداری کے خوف سے مغربی ملکوں نے اور ان کے اشارے پر مسلم قیادتوں نے جو اقدامات کیے، ان کے نتائج اب کھل کر سامنے آ گئے ہیں، اور جو شخصیتیں ہیرو بن کر سامنے آئیں، وہ تخریب کار اور اسلام دشمن ثابت ہوئیں، مغربی ملکوں خاص طور پر امریکہ کے بارے میں دانشور طبقہ میں جو حسن ظن پایا جاتا تھا اور ان کی تقلید کا جو ذہن علمی حلقوں میں تھا، اور ان کی رواداری، آزادیٔ رائے اور علم میں موضوعیت، بحث و تحقیق میں انصاف اور عرق ریزی کا جو تصور جدید علمی اداروں اور ترقی پسند حلقوں میں تھا، وہ سراب ثابت ہوا۔

ملکی مسائل سے متعلق ''پیام انسانیت'' کے پلیٹ فارم سے مولاناؒ کی تقریریں، ملک کے خطرناک رخ اور دانشوروں کی ذمہ داریوں سے متعلق رہنما تقریریں ہیں، اس پر مستزاد ان کی کتاب ''کاروان زندگی'' سات حصوں میں منظر عام پر آئی، جس میں اُنھوں نے یہ ساری باتیں تفصیل سے بیان کردی ہیں۔

انٹرویو کے ذریعہ بات سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے، اور بعض وقت بے تکلف گفتگو کے درمیان بعض ایسے مسائل بھی آ جاتے ہیں، یا اشارے آتے ہیں جو علمی کتابوں میں نہیں آ سکتے، اس لیے اس کی ضرورت تھی کہ یہ جمع کر دیے جائیں۔ عزیزی مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی سلمہٗ کو عزیزی مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے۔ جن کو مولانا کے کام اور مشن سے خصوصی دلچسپی ہے، اور مولانا کا اُنھیں اعتماد و تعلق خاص بھی حاصل رہا ہے۔ یہ ذمہ داری سپرد کی، اور اُنھوں نے مركز الإمام أبي الحسن الندوي میں ایک باحث کی حیثیت سے کام کیا اور

محنت اور سلیقہ سے یہ کام انجام دیا ہے، جو کہ افادیت سے خالی نہیں، اس سے خود اُن کو ذاتی طور پر علمی اور فکری فائدہ پہنچا ہوگا، اور قارئین کے لیے ایک گمشدہ سرمایہ بھی مہیا ہوگیا۔

ہمیں امید ہے کہ اس مجموعہ سے عوام اور خواص دونوں فائدہ اٹھائیں گے، اور قدیم اور عصری مسائل کو سمجھنے میں اس سے مدد ملے گی۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی

۲۷/شوال ۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے مضامین و تقاریر کو جمع کرنے کے دوران ان سے لیے گئے انٹرویوز کی بھی ایک تعداد جمع ہوگئی تھی، ان انٹرویوز کو دو سال قبل ہی شائع ہو جانا تھا، ان کی کمپوزنگ بھی ہوگئی تھی، اور استاد محترم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی حفظہ اللہ نے مقدمہ بھی تحریر فرمادیا تھا، لیکن حضرت مولاناؒ کے مضامین و تقاریر کے دوسرے مجموعوں کی ترتیب میں مشغولیت کی وجہ سے ان انٹرویوز کی مزید تہذیب و تنقیح پر توجہ نہ دے سکا، اور ان کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔

زیر نظر مجموعے میں مختلف و متنوع موضوعات پر لیے گئے (۲۸) انٹرویوز ہیں، ان میں سے بعض باقاعدہ انٹرویو تو نہیں، لیکن چونکہ وہ کسی خاص موضوع پر سوالات کے جواب ہیں، اس لیے ان کو بھی شامل کرلیا گیا۔

ان انٹرویوز میں حضرت مولاناؒ کی فکر کا بڑی حد تک خلاصہ آگیا ہے۔ 'کاروان زندگی' کی تصنیف سے پہلے کے ایک انٹرویو میں حضرت مولانا نے اپنے حالات زندگی بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ تنہا ایسا انٹرویو ہے جس کے شائع ہونے کے بعد حضرت مولانا نے اس پر نظر ثانی فرمائی، اور جابجا تصحیح اور اضافے کیے۔

اسی طرح مسلم پرسنل لا بورڈ، تحریک پیام انسانیت، مسلم مجلس مشاورت کے بارے میں بھی تفصیلی انٹرویوز ہیں، عالم اسلام اور اس کو درپیش چیلنجز اور خطرات، مسلم ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ، مغرب کی فکری یلغار کا مقابلہ، مکمل اسلامی معاشرے کا قیام، ہندوستانی مسلمان اور ان کی ذمہ داریوں جیسے موضوعات کے علاوہ سفر یورپ (۱۹۶۳ء) اور سفر مراکش (۱۹۷۶ء) سے متعلق انٹرویوز بھی ہیں۔ ایک انٹرویو میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مفتی امین الحسینی اور شیخ ابوزہرہ مصری کی وفات پر تفصیلی تاثرات آگئے ہیں۔

ان انٹرویوز میں کثرت سے طباعتی اغلاط تھیں، ان کی تصحیح کردی گئی ہے، استفادہ آسان کرنے کے لیے ذیلی عناوین کا اضافہ کیا گیا ہے، کتاب میں دو جگہ حضرت مولانا کے حواشی ہیں، وہاں اس کی وضاحت کردی گئی ہے، بہت سے مقامات پر توضیحی حواشی کی ضرورت تھی، لیکن میں چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہ کرسکا، بہرحال جتنا بھی مجھ سے ہوسکا، میں نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماکر اس کے نفع کو عام فرمائے۔

۲/جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ
۴/مارچ ۲۰۱۴ء

عبدالہادی اعظمی ندوی
علی گڑھ
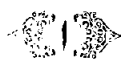
مقصدِ حیات

ایک مرتبہ نائر میڈیکل کالج (ممبئی) کے سالانہ میگزین "TONAMEC" کے لیے اس سال کے طالب علم ایڈیٹر ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین نے مشاہیر ملک وقوم کے نام ایک سوال لکھ بھیجا کہ از راہِ کرم آپ تحریر فرمائیں کہ آپ کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ اس سوال کا جواب لکھ بھیجنے والوں میں دنیا کے مشاہیر شامل تھے، جن میں ایک نمایاں نام حضرت مولاناؒ کا بھی تھا۔ حضرت مولاناؒ کا جواب انگریزی میں تھا، جس کا یہ اردو ترجمہ معروف صحافی امین الدین شجاع الدین مرحوم کے مجموعۂ مضامین "نقوش فکر وعمل" (شائع کردہ: دارین بک ڈپو، لکھنؤ، غیر مورخہ، ص ص ۳۱۴-۳۱۵) سے ماخوذ ہے۔

''میری زندگی کا مقصد اور نصب العین؛ بلکہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین، کائنات کے خالق و مالک کے حضور مکمل خودسپردگی اور تسلیم و نیاز کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔!

میں زندگی کو ایک امانت سمجھتا ہوں جس کا ہر لمحہ بیش قیمت ہے۔ دنیا میرے لیے امتحان گاہ ہے اور یہ زندگی ایک آزمائش۔!

میں اپنے ہر قول و فعل کے لیے خود کو اللہ کے حضور جواب دہ سمجھتا ہوں، جس کے سلسلے میں آخرت میں مجھ سے سوال کیا جائے گا۔

اس لیے میری زندگی کا بنیادی مقصد اپنے رب کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے، اس کی اطاعت و بندگی کے ذریعہ بھی اور حقوق العباد کی ادائیگی کی راہ سے بھی، سب کے ساتھ منصفانہ و ہمدردانہ رویہ اور تعاون و خیر خواہی کا جذبہ اپنا کر، اور اپنی مقدور بھر صلاحیت کے مطابق نسل انسانی کی وحدت و مساوات اور اس کی عظمت و حرمت کے لیے جدوجہد کے راستے سے بھی۔''
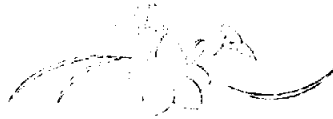
حالاتِ زندگی

ندوۃ العلماء کے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ کے فرزند ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی (ولادت: ۱۹۴۱ء- وفات: ۲۰۰۱ء) کا حضرت مولاناؒ سے خصوصی اور گہرا ربط و تعلق تھا، انھوں نے ۶۵-۱۹۶۴ء میں ملک کے ممتاز علماء و صاحب فکر حضرات سے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا تھا، یہ انٹرویو وقتاً فوقتاً پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے، بعد میں ان انٹرویوز کا مجموعہ بعنوان: ''خیالات'' مکتبہ طیبہ، لکھنؤ سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

پیش نظر انٹرویو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جو انھوں نے ۱۹۶۵ء میں خود حضرت مولاناؒ کے وطن رائے بریلی جا کر لیا، ہمارے علم میں حضرت مولاناؒ سے ان کی حیات کے بارے میں اردو میں لیا گیا یہ پہلا انٹرویو ہے، یہ انٹرویو پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/اپریل ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا، نیز ''خیالات'' (ص ص ۲۰-۳۲) میں بھی شامل ہے۔

پنجاب میل اپنی پوری تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا، سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے چند حضرات میرا اردو ڈائجسٹ پڑھنے میں مصروف تھے، میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، آم کے پیڑوں پر بور آچکے تھے، کھیتوں میں گیہوں کی سنہری بالیاں جھوم رہی تھیں، کہیں دور سے آتی ہوئی کوئل کی خوبصورت و میٹھی کوک میرے کان کے پردوں سے ٹکرا گئی؛ لیکن مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس آواز کے پیچھے صدیوں پرانا درد و غم چھپا ہوا ہے؛ ایک ایسا غم کہ جس کا غمگسار کوئی نہ ہو، ساز کے ان تاروں کی طرح؛ کہ جن سے نکلی ہوئی دُھنیں تو سب کو پسند ہیں؛ لیکن ان تاروں پر کیا بیت جاتی ہے، اس کا کسی کو پتہ بھی نہیں۔

میں انھی خیالات میں غرق تھا کہ اچانک ٹرین اس اسٹیشن کو پار کر گئی جہاں سے میرا قصبہ و میرا وطن صرف چند میل کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے، دل میں ایک ہلکی سی کسک پیدا ہوئی، بے شمار یادیں ہجوم کرنے لگیں، ایسی یادوں کا ہجوم کہ جن کے بیچ کسی خوشی کا پتہ نہ تھا؛ کیونکہ یہ یادیں ان لوگوں سے وابستہ تھیں جن پر موت کا پردہ پڑ چکا تھا، اٹھتی ہوئی جوانیاں، کھلتے ہوئے پھول سب مرجھا چکے تھے، اب صرف چاروں طرف ایک بے پناہ مُہیب سناٹے کی حکمرانی تھی۔ بے اختیار میرے منھ سے نکل گیا: اے اللہ! تیری مصلحتوں سے ہم نا آشنا ہیں، تو جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک ہی ہوگا، لیکن ہم لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ تیرے امتحان پر پورے اتر سکیں، بس اب ضرورت ہے تو صرف تیری رحمت کی۔!!

میں نے گھڑی دیکھی، شام کے چار بج رہے تھے، رائے بریلی کا اسٹیشن اب آنے ہی والا تھا۔ ہینڈ بیگ میں اپنا سامان رکھ رہا تھا کہ میں نے سنا، ایک صاحب اپنے ہم سفر ساتھی سے کہہ رہے تھے: ''یہ رائے بریلی ہے، سید احمد شہیدؒ کی تحریک یہیں سے اٹھی تھی، یہ بڑا تاریخی مقام ہے''، میں نے سوچا یہ اہلِ عزیمت اور اللہ والے اس دنیا سے تو چلے جاتے ہیں؛ لیکن ان کی یاد اور ان کا خیال لوگوں کے دلوں کو گرمائے رکھتا ہے۔!

اس مرتبہ رائے بریلی میرے آنے کا مقصد ''علی میاں'' صاحب سے انٹرویو لینا تھا، ناظرین معاف فرمائیں کہ اس وقت میں نے صرف ''علی میاں'' لکھا ہے، ''مولانا'' یا ''علامہ'' وغیرہ کے القاب جان بوجھ کرنہیں استعمال کیے ہیں، ذاتی طور مجھ کو اس چھوٹے سے لفظ ''علی میاں'' میں جتنی اپنائیت اور محبت معلوم ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں اور الفاظ کو تہی دامن سمجھتا ہوں، یا دوسرے الفاظ استعمال کر کے میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاید ان جذبات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکا جو ''علی میاں'' کے بارے میں میرے دل میں موجزن ہیں۔

جس زمانے میں ندوہ میں مَیں زیر تعلیم تھا، کبھی بھی پابندی سے ''علی میاں'' کی مجلس میں - جو بعد نماز عصر مہمان خانہ کے صحن میں ہوتی تھی - حاضری نہیں دے سکا، ہاں! کبھی کبھار ضرور چلا جاتا تھا؛ لیکن ان کی محبت اور سب سے بڑھ کر ان کی کتابوں سے عقیدت ہر حال میں رہی، ادھر کوئی کتاب چھپی؛ جب تک پوری ختم نہ کرلی، دم نہ لیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجلس میں حاضر تو نہ ہوتا تھا؛ لیکن اس خاندان کی علمی و اصلاحی عظمت اور ڈاکٹر صاحب مرحوم (۱) کا تذکرہ اور ''علی میاں'' صاحب کی بے نفسی اور اخلاص کی دولت کے تذکرے ہر روز ہی گھر میں جاری رہتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کا تذکرہ آیا نہیں کہ والد صاحب (۲) کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول سے متأثر ہوئے بغیر میں نہیں رہ سکا۔ اس کے علاوہ یہ محبت کے رشتے یوں بھی اور مضبوط ہیں کہ میرے دادا مرحوم شاگرد ہیں ''حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ'' کے، اور یہ خادمی ومخدومی کا سلسلہ بھی اب تک ویسے ہی جاری ہے۔

بات دور نکل گئی، تذکرہ چل رہا تھا میری اس نالائقی کا: میں مولانا کی مجلس میں پابندی سے حاضر نہیں ہوتا تھا۔ جس زمانہ میں مَیں مدینہ یونیورسٹی میں تھا، علی میاں صاحب بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر کے تشریف لائے اور تقریباً دو ماہ قیام رہا، اس دو ماہ کے عرصے میں دن ورات مَیں مولانا کے ساتھ رہا، اور وہ سارا ظاہری بُعد جو اب تک تھا، سب ختم ہوگیا۔

ایک رات مَیں اور مولانا مسجد نبوی میں بیٹھے تھے، عشاء کی اذان ہو چکی تھی، میں نے سوچا کہ اس نشست کو کسی یادگاری صورت میں محفوظ کرلیا جائے، فوراً ہی اٹھا اور ایک نسخہ سیرتِ ابن ہشام کا خرید لایا، اور مولانا سے عرض کیا کہ اس پر اپنے ہاتھوں سے کچھ تحریر فرمادیں، مولانا نے

---

(۱) حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

(۲) مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، والد ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی۔

میری اس درخواست کو قبول فرمالیا، اور یہ عبارت تحریر فرمائی:

''وہ دانائے سبل ختم الرُسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

(اقبالؔ)
بقلم ابوالحسن علی

مدینہ منورہ، مسجد نبوی ۱۰؍ذیقعدہ ۸۳ھ
درمیان اذان وفرض عشاء''

کتاب ومقام کی مناسبت سے یہ شعر کتنا برمحل ہے، اور اس وقت جو کیفیت ولطف محسوس ہوا تھا، اس کی یاد آج بھی تازہ ہے، جیسے کل کی بات ہو۔ جس وقت تکیہ (رائے بریلی) پہنچا، سب خیالات تازہ ہو چکے تھے، عصر کا وقت قریب تھا، میں نے اپنی آمد کے اطلاع بھیجی تھوڑی دیر میں مولانا تشریف لائے، مجھ کو دیکھ کر جس خوشی اور محبت کا اظہار فرمایا، وہ میری حیثیت سے بڑھ کر تھا۔ میں نے عرض کیا کہ لکھنؤ میں آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ انٹرویو کے لیے تھوڑا سا وقت عنایت فرمائیں گے۔! مولانا نے فرمایا: ''ہاں! ہاں! مجھ کو خیال ہے، انٹرویو ضرور دوں گا، لیکن بعد نماز مغرب۔''

عصر کی نماز ہو چکی تھی، شام کے سائے بڑھ رہے تھے، آم کے بور کی خوشبو اس وقت کچھ اور بڑھ گئی تھی، دریا کی سمت سے آتی ہوئی نرم نرم ٹھنڈی ہوائیں اس خوشبو کو اڑائے پھر رہی تھیں، اس کیف آگیں منظر وموسم نے عجیب لطف پیدا کر دیا تھا، تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی، نماز ادا کی گئی، اور اس کے بعد ایک کمرہ میں مَیں مولانا سے مصروفِ گفتگو تھا۔

ابتدائی تعلیم وتربیت

سوال: ابتدائی زندگی میں کیا عوامل کارفرما تھے اور گھریلو ماحول کس انداز کا تھا؟

مولانا نے فرمایا کہ ''میری عمر صرف نو سال کی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ پورے خاندان میں انگریزی تعلیم رائج تھی، اور معاشرتی طور پر بھی سب انگریزی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے۔ گھروں میں زمینداری تھی، اپنے پورے کرّ وفرّ کے ساتھ، صرف میرے گھرانے میں معمولی زمینداری تھی۔ میری ساری تربیت وتعلیم ڈاکٹر عبدالعلیؒ نے دی۔''

''لیکن ایک بات ضرور تھی، جو پورے خاندان میں موجود تھی، وہ تھی: شرک و بدعت سے

اجتناب و پرہیز، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اثر حضرت سید احمد شہیدؒ کا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عورتوں میں دینداری کا رجحان بہت تھا، اور یہ رجحان ان خواتین میں مردوں سے زیادہ تھا؛ جس کا اثر تھا کہ بچوں کی تربیت میں اور تعلیم میں شرک و بدعت کے سائے پڑنے نہیں پاتے تھے، اور وہ ہر طرح کے شرک اور اس کے اقسام سے محفوظ رہتے تھے۔ صرف میرا گھرانہ اس دور میں عربی تعلیم میں مشغول تھا، اور اسی میں اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب کچھ اور میں بڑا ہوا، تو ندوہ میں تعلیم کی تکمیل ہوئی۔''

مولانا حیدر حسن خاںؒ اور مولانا شبلی فقیہؒ کا ذکر

مولانا یہ کہہ کر خاموش ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ'' ندوہ میں تعلیم کے زمانے میں کن اساتذہ کا سب سے زیادہ اثر تھا اور وہ کن صفات کے حامل تھے؟''

میرے اس سوال نے شاید ان اساتذہ کی یاد تازہ کر دی تھی، اسی لیے مولانا کچھ دیر تو خاموش رہے، پھر غم آلود آواز میں فرمایا:

''میری طالب علمی کے زمانے میں جن اساتذہ کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر تھا، ان میں مولانا حیدر حسن خان صاحب مرحوم اور مولانا شبلی فقیہؒ کا نام سرفہرست ہے۔ ان حضرات کے اخلاص اور سادگی اور علمی ذوق کی وجہ سے میں بہت متاثر تھا، اور سب سے بڑھ کر ان لوگوں کا انداز تربیت بہت خوب تھا۔ مولانا حیدر حسن خان صاحب سے تو میں بہت ہی مانوس تھا، اور تقریباً اُنھیں کے ساتھ رہتا بھی تھا، اور ان کے روپے پیسے وغیرہ کا حساب بھی میرے ہی پاس رہتا تھا۔ ان کے اندر سادگی اس قدر تھی کہ اگر ہم لوگ بازار کسی ضرورت سے جاتے ہوتے تو خود بھی ساتھ ہو جاتے اور فرماتے: ''ہم بھی ساتھ چلتے ہیں، تاکہ تم لوگوں کو سامان گراں نہ ملے۔''

مولانا نے فرمایا کہ ''یونس! تم اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ ان کے اندر کس قدر ہمدردی اور غمگساری اور شاگردوں کے ساتھ محبت آمیز برتاؤ کرنے کا جذبہ تھا۔''

دینی دعوت کی طرف رجحان کے اسباب

اب میرا اگلا سوال تھا کہ: ''اسلامی کردار کی تعمیر میں کن شخصیات نے اثر ڈالا؟''

مولانا نے فرمایا کہ ''میرے اسلامی ذہن و کردار کی تعمیر میں مولانا خلیل عرب صاحبؒ اور مولانا احمد علی [لاہوریؒ] اور مولانا الیاس صاحب [کاندھلویؒ] کا بڑا ہاتھ تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں حضرات کی توجہ اور عنایات سے میرے اندر یہ جذبات پیدا ہوئے۔''

اس سوال کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ لگے ہاتھ یہ بھی پوچھ لوں کہ ''دینی دعوت کی طرف رجحان کے اسباب کیا تھے؟''

مولانا نے فرمایا کہ ''پہلے پہل تو میری طبیعت اس کام کی طرف بالکل راغب نہیں تھی، بلکہ ایک گونہ شرح صدر بھی نہ تھا، لیکن بھائی صاحب مرحوم [1] کو اس کام سے بہت لگاؤ تھا، خصوصاً ان کو مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں میں اسلام کی تبلیغ کی بڑی خواہش تھی، اور وہ مجھ کو برابر اس کام کی طرف مختلف انداز سے آمادہ کیا کرتے تھے۔ بہرحال کچھ تو بھائی صاحب کا اثر اور پھر مولانا الیاس صاحب کے تعلق سے اس کام کی طرف رغبت ہوئی، اور دل بھی پوری طرح آمادہ ہو گیا۔''

ندوہ میں تفسیر کا درس اور قرآن مجید کے متعلق عمومی تأثر

''مولانا! یہ فرمائیے کہ جس زمانے میں آپ ندوہ میں تفسیر قرآن کا درس دیا کرتے تھے، تو آپ کا عمومی تأثر قرآن مجید کے متعلق کیا تھا؟ اور دورانِ تدریس کن کتابوں سے زیادہ مدد ملتی تھی؟''

مولانا نے فرمایا: ''جس زمانے میں تفسیر قرآن کی خدمت میرے سپرد تھی، تو قرآن مجید کے متعلق جو میرا تأثر تھا، وہ تھی اس کی دعوتی اسپرٹ اور رنگ؛ چنانچہ میں بھی اس کو اسی انداز میں بیان کیا کرتا تھا، پھر جب مرکز [2] میں بھی درسِ قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا تو یہ دعوتی رنگ اس درس میں جاری ہو گیا اور یہاں ندوہ میں تدریسی رنگ غالب آ گیا، اور رہا تمہارا یہ سوال کہ کن کتابوں سے مدد ملتی رہی، تو اس سلسلے میں تقریباً متقدمین و متأخرین سب ہی کی تفسیریں زیر مطالعہ رہیں، اور ''المنار'' اور ''ترجمان القرآن'' سے بھی کافی مدد ملتی رہی۔''

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا حقیقی لگاؤ قرآن مجید سے تھا

ابھی یہ گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ کھانا لگ چکا تھا، مولانا نے فرمایا: ''پہلے کھانا کھا لو پھر اس انٹرویو کو پورا کر لینا۔'' تقریباً بیس منٹ تک یہ سلسلہ منقطع رہا، اور اب میرا خیال تھا کہ عشاء کی نماز کا وقت بھی قریب آ گیا تھا، اس لیے کھانے کے فوراً ہی بعد میں نے دریافت کیا کہ ''علامہ سیّد سلیمان ندویؒ سے آپ کس حیثیت سے متاثر ہیں؟ اور ان کو آپ کے نزدیک کس فن سے زیادہ لگاؤ تھا؟''

مولانا نے فرمایا کہ ''میں سیّد صاحب مرحوم سے ان کے علمی ذوق و تحقیق، کثرتِ مطالعہ

(۱) ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ۔ (۲) مرکز دعوت و تبلیغ، امین آباد، لکھنؤ۔

سے بے حد متأثر رہا، اور میرے نزدیک ان کو حقیقی لگاؤ قرآن مجید سے تھا، اور میری اس رائے کے موافق مولانا اویس صاحب بھی ہیں، اور دوسرا فن ہے علم الکلام کا، اس سے بھی سیّد صاحب کو کافی لگاؤ تھا۔"

کیا ایک عام آدمی مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کر سکتا ہے؟

مولانا خاموش ہوئے تو میں نے عرض کیا: "مولانا! موجودہ دور کے مستشرقین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا ایک عام مسلمان ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کر سکتا ہے؟"

"ان لوگوں کے سلسلے میں جو کچھ کہنا ہے وہ سب 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'[1] میں لکھ چکا ہوں، بہر حال پھر بھی ان کی کتابیں مبتدی و متوسط حضرات کے لیے مضر ہیں، اور منتہی حضرات کے لیے ان کا مطالعہ اتنا مضر نہیں ہے؛ بلکہ کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے"۔[2]

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے تعلق کا آغاز

چونکہ وقت کم تھا، اس لیے سوالات کو سمیٹتے ہوئے میں نے عرض کیا: "مولانا! یہ فرمائیے کہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے کس طرح عقیدت پیدا ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے؟"

"یہ ۱۹۴۰ء کا آخر تھا کہ میں اور مولانا منظور صاحب نعمانی نے رائے پور کا سفر کیا، وہاں جو کچھ میں نے دیکھا، اس سے طبیعت بہت متأثر ہوئی، خصوصاً حضرت شیخ کی تربیت اور اخلاص نے بہت متأثر کیا، پھر اس کے بعد برابر حاضری ہوتی رہی اور تعلقات میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔"

میں نے عرض کیا: "مولانا! عشاء کا وقت قریب ہے، صرف چند سوالات اور رہ گئے ہیں، اگر اجازت ہو تو عرض کروں؟"۔

مولانا کی رضامندی پاتے ہی میرا یہ سوال تھا کہ "موجودہ دور میں بظاہر روحانیت مادیت

---

(۱) حضرت مولاناؒ کی مشہور کتاب جس میں حضرت نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ وقت کے سب سے بڑے چیلنج "مغربی تہذیب کی کامل پیروی زندگی کی شرط اور ترقی و طاقت کی واحد راہ ہے" کو دنیائے اسلام نے کس طرح قبول کیا، اور مختلف اسلامی ممالک نے کیا کیا موقف اختیار کیے، اور عالم اسلام کے لیے اس بارے میں صحیح راہ عمل کیا ہے؟۔ اس کتاب کے اردو، عربی اور انگریزی میں متعدد ایڈیشن ملک و بیرون سے نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب درحقیقت "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کا امتداد ہے۔

(۲) مستشرقین کے بارے میں مولانا کی تفصیلی آراء کے لیے ملاحظہ ہو مولانا کی کتاب: "اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین"، شائع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، طبع اول ۱۹۸۲ء۔

کے سامنے شکست کھا رہی ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر صحیح ہے تو اس کی کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟''

مولانا نے فرمایا: ''یہ سوال تو بہت تفصیل طلب ہے، اور اس کے لیے تو پوری ایک کتاب چاہیے۔ بہر حال جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو ''[مسلم ممالک میں] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں کچھ مواد مل جائے گا۔''

معاصر علماء جن کی علمی تحقیق اور ذوق مطالعہ نے متاثر کیا

''مولانا! اپنے معاصر علماء میں علمی تحقیق اور ذوق مطالعہ کے اعتبار سے آپ کن حضرات سے متاثر ہیں؟''

''علمی تحقیق اور ذوق مطالعہ کے اعتبار سے میں سیّد سلیمان ندویؒ اور مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ اور مناظر احسن گیلانیؒ سے متاثر ہوں''۔

''مولانا! یہ فرمایئے، مشرق وسطی میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ پھر سے ممکن ہے؟''

میرا یہ سوال کرنا تھا کہ مولانا پر ایک افسردگی کی کیفیت طاری ہوگئی، اور دل کی بے چینی اور ایک اتھاہ غم کے اثرات چہرہ پر صاف عیاں تھے۔

درد بھرے لہجہ میں مولانا نے فرمایا کہ ''مشرق وسطی کا مطلع ابھی گرد آلود ہے، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کیا ہو؟ اس سلسلہ کی بھی کچھ تفصیل '[مسلم ممالک میں] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش' میں موجود ہے۔''

اپنی پسندیدہ تصنیفات

مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ آواز قریب سے نہیں؛ بلکہ دور بہت دور سے آرہی ہے، اس لیے فوراً ہی اس موضوع سے ہٹتے ہوئے میں یہ پوچھ بیٹھا کہ ''آپ کو اپنی تصنیفات میں سے کس تصنیف سے زیادہ لگاؤ ہے اور اس کو آپ پسند کرتے ہیں؟''

مولانا نے فرمایا کہ ''اردو میں تو 'سیرت سید احمد شہید' اور 'تذکرہ [حضرت مولانا] فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ' اور 'تاریخ دعوت وعزیمت' ہے، اور عربی میں 'روائع إقبال' اور 'النبوة والأنبياء في ضوء القرآن' ہے۔''[1]

(۱) اس انٹرویو کے وقت مولانا نے ابھی ''نبی رحمت'' ﷺ نہیں لکھی تھی، نبی رحمت ﷺ (السيرة النبوية) کی تالیف کے بعد مولانا کو سب سے زیادہ لگاؤ ''نبی رحمت'' ﷺ سے تھا۔

ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے بارے میں ایک عمومی تاثر

میں نے اپنی نوٹ بک دیکھی، صرف دو سوال اور رہ گئے، اور وقت اب بالکل نہیں رہ گیا تھا، اس لیے کچھ ڈرتے ہوئے اور کچھ جھجکتے ہوئے پوچھ ہی بیٹھا:

"مولانا! ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی شخصیت کے بارے میں آپ کا عمومی تاثر کیا ہے؟"

مولانا نے فرمایا کہ "میں بھائی صاحب کی حقیقت پسندی، سلامت ذہن، متوازن مزاج، سنجیدگی اور پختگی سے بہت متاثر ہوا، اور علمی شغف سے بھی۔" (اس موقع پر مجھے والد صاحب کا وہ جملہ یاد آ گیا کہ "ڈاکٹر صاحب کو لوگوں نے پہچانا نہیں")۔

"ان کا اصل ذوق علمی تھا اور ان کے اندر معاملہ فہمی بھی بہت زیادہ تھی، اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی کتابوں کی طرف التفات مجھ کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہدایات کے بموجب ہی ہوا"۔

عربی مدارس کے اساتذہ کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟

"مولانا! عربی مدارس کے اساتذہ کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟ اور طلبہ کے کردار کی تعمیر میں ان کو کن اقدامات کی ضرورت ہے؟ نیز عربی مدارس سے فارغ طلبہ کے معاشی استحکام کے بارے میں آپ کے نزدیک اصل حل کیا ہے؟"

چونکہ عشاء کی اذان ہو چکی تھی، اس لیے میرے اس طویل سوال کا جواب مختصر طور پر دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ "اساتذہ کو طلبہ کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ رکھنا چاہیے، اور ہر ممکن طریقہ سے مختلف اوقات میں علمی ذوق اور مطالعہ کی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور سب سے بڑھ کر دینی روح اور دعوتی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اور جہاں تک سوال ہے فارغ طلبہ کے معاشی استحکام کا، تو بھائی اس کی تین صورتیں ہیں، یا کوئی ہنر سیکھا جائے اور اس کو ذریعۂ معاش بنایا جائے، یا خود کو توکل پر چھوڑ دیا جائے، یا پھر اللہ کی راہ میں انسان لگ جائے تو وہ خود ہی بندوبست کرتا ہے۔"

اس کے بعد ہم سب عشاء کی نماز کے لیے چلے گئے۔

رات کے تین بجے اچانک میری آنکھ کھل گئی، کمرے سے باہر نکل آیا، ہر چہار طرف ایک پاکیزہ اور خوشگوار سناٹا چھایا ہوا تھا، اور پورا چاند آسمان کی وسعتوں میں چمک رہا تھا، کھیتوں اور

باغوں اور دریا کے درمیان گھرے ہوئے تکیہ کے یہ چند گھر اور یہ مسجد اپنی کہانی سناتے ہوئے محسوس ہوئے، سیّد احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کے مجاہدانہ کارنامے اور ان کے ساتھیوں کی سر فروشانہ جدوجہد نگاہوں کے سامنے تصویر کی طرح پھرنے لگی، اللہ اللہ! کس قدر عظیم تھی یہ تحریک جو آندھی اور پانی کی طرح اٹھی تھی اور سارے ہندوستان میں چھا گئی تھی، اور آج اسی خاندان کا ایک فرد پھر تن من دھن سے اسلام کی حمایت میں نکل آیا ہے، اور سیّد احمد شہیدؒ کی سنت تازہ کرنے میں مصروف ہے۔ مبارک ہو تجھ کو اے ملت اسلامیہ ہند! کہ تجھ کو اس باعظمت خاندان کے عظیم فرزند کی رہنمائی حاصل ہے۔

سفرنامۂ حیات

یہ انٹرویو ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں لیا، جب کہ حضرت مولاناؒ کی شخصیت ملت اسلامیہ کے ایک مخلص داعی، ممتاز قائد اور انشاء پرداز اور مصنف کی حیثیت سے معروف و ممتاز ہو چکی تھی، ہندوستان میں تاریخ کا یہ ایک نازک موڑ تھا جب کہ سارے ملک میں فسادات کا ایک سلسلہ تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا، حضرت مولانا نے مسلم مجلس مشاورت کے قیام پھر اس پلیٹ فارم کے ذریعہ مسلمانوں کو خیر امت کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے، اور برادران وطن کو انسانیت، بھائی چارہ اور محبت کے بھولے سبق کو یاد دلانے کی تاریخ ساز جدو جہد کی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ہی سے حضرت مولانا سے قریب تھے، اور ان کی مجالس درس قرآن میں برابر حاضر ہوتے اور مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں میں استفادہ کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے ماہنامہ ''دوام'' (ٹانڈہ) کے لیے خود حضرت مولاناؒ کے وطن تکیہ کلاں (رائے بریلی) اپنے دوست م نسیم کی معیت میں جا کر یہ انٹرویو لیا تھا، اس وقت حضرت مولانا نے ابھی اپنی خود نوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' تالیف نہیں کی تھی۔ یہ انٹرویو، ڈاکٹر سیّد عبدالباری صاحب کے بیسویں صدی کی چند ممتاز شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز کے مجموعہ ''ملاقاتیں'' [شائع کردہ: انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء] میں بھی شامل ہے۔ ''دوام'' [شمارہ فروری ۱۹۷۰ء] میں چھپنے کے بعد خود حضرت مولاناؒ نے اس انٹرویو پر نظر ثانی فرمائی تھی، اور جا بجا اصلاحات اور اضافے کیے تھے۔ اب یہ نظر ثانی شدہ انٹرویو پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے۔

لکھنؤ سے ۵۰ میل کی مسافت تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوئی، اور الہ آباد لائن پر ایک معمولی مگر مشہور اسٹیشن پر ۱۲ بجے شب میں ہم لوگ آرزوؤں اور ولولوں کا ایک سیلِ رواں سینے میں چھپائے ہوئے اتر گئے۔ رات اسٹیشن پر گزارنی تھی، ویٹنگ روم کے اونگھتے ہوئے سنتری نے بے دلی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا، اور اس کشادہ، مگر ٹھنڈے کمرے کے ایک گوشہ میں ہم لوگ اپنے اپنے تصورات کے بحرِ ناپیدا کنار میں ڈوبتے تیرتے، نیند کے ہوشربا جزیروں تک پہنچ گئے۔ صبح کو آنکھیں کھلیں [تو قربِ طلوعِ سحر نے خالق کے حضور عجز و نیاز کے لیے ہمیں صف بستہ کردیا۔ رفیقِ سفر اگر چاق و چوبند ہو اور اکرامِ مومن کے جملہ تقاضوں کی ادائیگی پر کمربستہ ہو تو پھر سفر میں حضر سے بڑھ کر لطف آتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستر اور اس کے جملہ لوازم سمٹ کر مدور ہو گئے، اور] ہم رائے بریلی اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ اسٹیشن سے 'تکیہ' تک دو ڈھائی میل کا اچھا خاصا فاصلہ طلوعِ آفتاب کا وقت، رکشہ کا سفر، نیم پختہ سڑک میں سردی کو دعائیں دیتا ہوا رکشہ پر بیٹھ گیا، مگر مرنسیم کی ہمرکابی کا فیض تھا کہ ٹھنڈی ہواؤں کے حوصلے سرد ہو گئے۔

رائے بریلی کو یہ دورِ بے بصیرت شاید صرف اندرا گاندھی کے حلقۂ انتخاب کی حیثیت سے جانتا ہو، لیکن ہندوستان کی تاریخ اس بستی کو مشہدِ بالاکوٹ کے سرفروش، اُنیسویں صدی کے مجاہدِ کبیر اور انسانیت کے نامور فرزند سیّد احمد شہیدؒ کے مولد و مسکن اور مرکزِ تربیت و ہدایت کی حیثیت سے ڈیڑھ سو سال سے جانتی ہے۔ اس سرزمین کی خاک کتنی مقدس ہے جسے ان خوش نصیب سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے روندا ہے، جو دین کی سربلندی اور انسانیت کے عزت و وقار، اور اپنے پروردگار کی رضا کی خاطر گھروں کے عیش و راحت کو تج کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

ہم لوگ اب شہری راستوں سے گزر کر ایک خام سڑک کے ذریعہ مضافات میں کھیتوں اور باغوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دریائے سئی کے کنارے اس زرخیز قطعۂ ارض کی طرف بڑھ رہے تھے، جہاں تین سو سال قبل شاہ علم اللہؒ نے اپنے خاندان کو سنّتِ ابراہیمی کے مطابق آباد کیا تھا۔

قریب پہنچے تو نظر آیا کہ آج بھی یہ میکدہ اسی طرح آباد ہے، مولانا کے مہمان خانہ میں مختلف مقامات سے آئے ہوئے مہمانوں کی ایک محفل جمی ہوئی ہے، ہم نے سامان مہمان خانہ کے برآمدے میں خاموشی سے رکھ دیا اور اس بابرکت بستی کے روح پرور ماحول سے لطف اندوز ہونے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں مولانا محمد رابع صاحب ندوی۔ مولانا کے عزیز اور ندوہ کے ایک ممتاز استاذ اور صاحبِ قلم۔ ہمارے استقبال کو تشریف لائے، اور ایک پُرخلوص گروہ کے ساتھ ہم نے چائے نوشی کی۔ کچھ ہی وقفہ کے بعد خود مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب تشریف لائے، جن کی شخصیت پورے عالم اسلام میں ایک روشن دماغ اسلامی مفکر، دور اندیش مؤرِّخ، دردمند معلِّم، سلیم الطبع قائد اور روشن ضمیر مربی و مصلح کی حیثیت سے مشہور و متعارف ہے۔ مولانا علی الصباح کسی سے ملاقات کی غرض سے شہر تشریف لے گئے، واپسی پر ہماری آمد کی خبر پاکر فوراً تشریف لائے، ہم لوگ اگرچہ ناشتہ کر چکے تھے، مگر دوبارہ ہمارے لیے چائے خصوصی اہتمام سے منگوائی اور ہم مکرّر ان جرعاتِ اخلاص ومحبت سے محظوظ ہوئے۔ جاڑے کی اس ٹھنڈی صبح میں شہیدوں اور غازیوں کے اس مسکن اور خدا رسیدہ انسانوں کی اس بستی میں مؤمنانہ خلوص، کچھ زندہ تصویروں کے جھرمٹ میں چائے کے چند گرم گھونٹ کیا لطف دے گئے، ناقابل بیان ہیں۔

تصور نے اس خطہ سے وابستہ ڈھائی تین سو سال کی تاریخ کے اہم واقعات تک زقند لگائی، پردۂ خیال پر اس دور کا منظر ابھر آیا جب ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور اچھے اچھے خاندانوں کے رؤساء اور امیر زادے اسی جوار میں ذوقِ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر اپنی تربیت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ یہ اللہ کے بندے لکڑیاں چیرتے، گھاس چھیلتے، اینٹیں تھاپتے، مسجدیں تعمیر کرتے، گارے مٹی کا کام کرتے، فقر و فاقہ اور مشقت و ریاضت کے عالم میں زندگی گزارتے، مگر ہر شخص پر محویت و جذب اور کیف و انبساط کا عالم طاری تھا، کسی کو نہ شکایت تھی نہ افسوس۔

مولانا اپنے معمولات کے متعلق ضروری ہدایات دے کر ہماری طرف متوجہ ہوئے، اور ہم لوگ مہمان خانہ سے دائرہ شاہ علم اللہؒ کی تاریخی مسجد کی طرف چلے، جسے انٹرویو کے لیے مناسب ترین جگہ سمجھ کر ہمیں نے منتخب کیا تھا۔ دریائے سئی کے کنارے ایک پُرفضا مقام پر بنی ہوئی حرم کعبہ کے بالکل مشابہ اس مسجد سے ملت کے ایک روشن دور کی تاریخ وابستہ ہے۔ ۱۰۸۳ھ میں اسے شاہ علم اللہؒ نے بنوایا تھا اور اس کی بنیاد میں زمزم کا پانی ڈالا گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر اقبالؔ کے وہ اشعار یاد آنے لگے جو اُنہوں نے مسجد قرطبہ پر لکھے ہیں:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات ،کارِ جہاں بے ثبات
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات،موت ہے اس پر حرام
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

ہاں !اسی مسجد کے دامن میں چشم فلک نے آج سے ڈیڑھ سو سال قبل عجیب دلکش مناظر دیکھے تھے، جب کہ سیّد احمد شہیدؒ شمع انجمن تھے ،اور ملک کے علماء، اہلِ حق اور مجاہدین ان کے پروانے۔ یہ اِس لیے جمع تھے کہ راہ حق میں اپنی جانوں کو قربان کر دیں۔ایک بار جب کہ سنگین قحط کی وجہ سے مسجد میں چراغ جلانے کے لیے نہ تیل تھا، نہ مردانِ حق کے لیے قوتِ لایموت ،اس وقت بھی یہ اللہ کے بندے خوش وخرم اپنے مربی و مرشد کے چاروں طرف بیٹھ کر اسماعیل شہیدؒ کے الفاظ میں تجلّیٔ بے رنگی کا تماشہ دیکھتے۔آج اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ہم چند نفوس اسی خانوادہ کے ایک چشم و چراغ سے ملت کی بوسیدہ حال کشتی کے مستقبل پر گفتگو کرنے جا رہے تھے۔

مولانا علی میاں ابھی دو ہفتہ قبل رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے بعد مدینہ منورہ سے لوٹے تھے ،رابطہ کے اس اجلاس میں معزز شرکاء نے جب گجرات کے فسادات پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور اپنی پوری ہمدردی اور اخلاقی مدد اور تائید وحمایت کا یقین دلایا،تو مولانا نے ان کے ان قابل قدر جذبات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے،وہ مولانا کی جرأت حق گوئی، مؤمنانہ فراست اور دور اندیشی اور ہندوستان کے سنگین حالات میں ملت کے صحیح منصب وموقف کی تصویر بن کر میری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگے:

’’حضرات! آپ کے ان جذبات کی ادنیٰ سی ناقدری کے بغیر،جن کا آپ نے کل اور آج کی تقریروں میں ہندوستانی مسلمانوں کے معاملہ اور حالیہ فسادات کے سلسلے میں اظہار فرمایا ہے؛ میں آپ سے عرض کروں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیسے ہی حالات پیش آئیں،اس ملک میں رہنے

اوران حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ سالہا سال سے پورے عزم وفیصلہ کے ساتھ ایک ایسے اہم اسلامی ناکے پر پہرہ دے رہے ہیں، جو صدیوں سے اسلامی تہذیب، دینی علوم اور اسلام کے وسیع علمی ترکہ کا امین ومحافظ رہا ہے۔ ان ہندوستانی مسلمانوں نے اس اسلامی میراث کی نہ صرف حفاظت کی ہے، بلکہ اس میں گرانقدر اضافہ کیا ہے، اور اس کو چار چاند لگائے ہیں، اُنہوں نے نہ صرف اپنی استقامت کا ثبوت دیا ہے؛ بلکہ صلاحیت اور افادیت کا بھی نقش قائم کردیا ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں، جو اتفاقات کی منطق کو تسلیم نہیں کرتے، وہ ہر چیز کو قضا وقدر کا فیصلہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں پہنچنا محض ایک اتفاقی امر نہ تھا، حکمت الٰہی کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی، وہ وہاں خالی ہاتھ نہیں گئے، ایک پیغام ودعوت ساتھ لے کر گئے تھے، جس کو وہ اب بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور اسی میں ان کی حفاظت وبقا کا راز ہے۔''

''حضرات! ہندوستان کے مسلمان اتنے غبی اور بے دماغ نہیں ہیں کہ وہ اس قیام اور اس فیصلہ کے نتائج کو نہ سمجھتے ہوں، ان کو ان مشکلات کا پورا احساس ہے جو اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اُنہوں نے جب یہ فیصلہ کیا، تو وہ اس کے لیے پورے طور پر تیار بھی ہوگئے، اور اگر اُن میں کچھ لوگ اس فکری صلاحیت سے محروم تھے، تو اب ان فسادات نے اور غالی احیاء پرستوں کے مطالبات اور فرقہ پرستوں کے جارحانہ رویہ نے آنکھوں پر سے یہ پردہ اٹھا دیا ہے، اور مسلمان یہ سمجھ گئے ہیں کہ ان کو اپنے قیام و پیام کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، یہ قیمت بڑی سے بڑی اور نازک سے نازک ہوسکتی ہے، لیکن وہ اس کے لیے تیار ہیں، اور ان حالات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نصرت، اعانت وحفاظت پر یقین رکھتے ہیں، جو ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیتی اور بے کسوں کی مدد کرتی رہتی ہے، اور سارا قرآن اس کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے۔ اُن کو اس کا بھی احساس ہے کہ یہ سب اسلام اور رسول عربی ﷺ سے نسبت کی قیمت ہے، جو ان کو وقتاً فوقتاً ادا کرنی پڑتی ہے، اور یہ نسبت خدا

کے یہاں بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ إِلَّآ أَنْ یَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾۔" [الحج: ٤٠]

ابتدائی زندگی اور خاندانی حالات

انٹرویو کا باضابطہ آغاز ہوا، اور حسبِ معمول میرا پہلا سوال مولانا کی ابتدائی زندگی اور خاندانی حالات کے متعلق تھا۔

مولانا روانی اور برجستگی کے ساتھ یوں گویا ہوئے جیسے کوئی طیارہ اپنی مقررہ پرواز کے لیے فضاؤں میں بلند ہو جائے:

"میں ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء (۱) میں رائے بریلی میں پیدا ہوا، میرا تاریخی نام "ظہور حیدر" رکھا گیا۔ میرے مورث اعلیٰ سید قطب الدینؒ مدینہ منورہ سے ۶۰۷ھ میں (یعنی آج سے ۶-۷ سو سال قبل قطب الدین ایبک کے دور میں) مدینہ منورہ سے جہاد کی نیت سے ہندوستان تشریف لائے، اور نواح کٹرہ کے علاقہ کو ختم کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا، اور وہیں آباد ہو گئے، وہیں پر ان کا مزار بھی ہے۔ (ضیاء الدین برنی نے آپ کی اولاد کا ذکر بے انتہا تعظیم سے کیا ہے۔) پھر میرے خاندان کے ایک مشہور بزرگ شاہ علم اللہؒ نے عالمگیرؒ کے عہد میں رائے بریلی آکر دریائے سئی کے کنارے اسی مقام پر اپنے خاندان کو آباد کیا۔ میرے دادھیال میں دادا سے قبل چھوٹی موٹی شاہی ملازمتوں کا سلسلہ تھا، پھر دادا کے وقت سے حکمت وطبابت موروثی پیشہ بن گئی، میرے دادا اور والد سب ہی نے حکمت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ اس کے علاوہ میرے اہل خاندان کا پسندیدہ مشغلہ تصنیف و تالیف تھا، میرے دادا سید فخر الدین خیالیؔ فارسی کے ایک بڑے مصنف اور شاعر تھے، ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط و انشاء پرداز بھی تھے اور "مہر جہاں تاب" کے نام سے فارسی میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنا شروع کیا تھا، اس کا پہلا حصہ جو ۱۳ سو صفحات پر مشتمل ہے، اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا اب بھی موجود ہے، اس میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے متعلق بھی مفید اور اہم معلومات ہیں، مگر ابھی صرف دوسری جلد کا کچھ حصہ ہی لکھ سکے تھے کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اُنھوں نے اسے اردو میں بھی خود ہی منتقل کرنا شروع کیا تھا۔"

---

(۱) حضرت مولانا کی صحیح تاریخ ولادت، خاندانی دستاویزات کے مطابق، ۶ محرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء ہے، حضرت نے اپنی خودنوشت سوانح حیات "کاروان زندگی" میں ۱۹۱۴ء لکھی ہے، لیکن وہ صحیح نہیں، حضرت کو بھی اخیر عمر میں اس کے صحیح نہ ہونے کا علم ہو گیا تھا۔

عہد طفولت اور تشکیل سیرت میں والدہ اور بھائی کے اثرات

میں نے مزید وضاحت کے لیے دوسرا سوال کیا: ''آپ کا بچپن کہاں گزرا؟ اور تشکیل سیرت پر خاندان کے کن حضرات کا زیادہ اثر پڑا؟''

''میرا بچپن لکھنؤ میں گزرا، اور وہیں پر تعلیم بھی حاصل کی۔ والد صاحب کا انتقال اگر چہ میری ۹-۱۰ سال کی عمر میں ہو گیا، پھر بھی ان کے ذوق و اسلوب کا میرے ذہن پر کافی اثر ہے، مگر میری شخصیت کی تعمیر میں دو شخصیتوں کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے: ایک میری والدہ ماجدہ ہیں، دوسرے میرے بھائی مرحوم، جو میرے اصل مربی اور اتالیق تھے۔''

عربی زبان و ادب کی تعلیم

اب گفتگو کا رخ مولانا کی تعلیم کی طرف مڑا:

''ابتدائی تعلیم فارسی کی گھر پر حاصل کی، میرے ابتدائی استاذ مولوی محمود علی مرحوم تھے، بعد میں والد صاحب کے انتقال کے بعد عربی پر لگا دیا گیا، اور اس معاملہ میں یہ میری بڑی خوش قسمتی رہی کہ میں نے عرب اساتذہ کے ذریعہ عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مجھے عربی کی بسم اللہ شیخ خلیل عرب نے کرائی جو اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں استاذ تھے، اور ڈھاکہ سے یہاں تشریف لائے تھے۔ اتفاق ایسا کہ ان کے والد شیخ محمد میرے والد کے ادب کے استاذ رہ چکے تھے، اور مجھے اپنے والد کے استاذ کے بیٹے کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ [شیخ] خلیل عرب بڑا خلاق ذہن رکھتے تھے، اُنہوں نے عربی کی تعلیم کا خاص طرز اختیار کیا، اور میرے لیے نیا نصاب تجویز کیا، اُن کے اس نصاب کا اولین تجربہ مجھ پر ہوا، میرے علاوہ خود اُن کے بھائی بھی ان سے پڑھتے تھے، میری تعلیم ایک ایک مضمون کی ہوئی۔''

فطری طریقۂ تعلیم

مولانا نے اس ضمن میں موجودہ نظامِ تعلیم کے ایک بہت بڑے عیب کی طرف اشارہ کیا، جس کے تحت بیک وقت متعدد مضامین اور زبانوں کا بوجھ طالب علم پر ڈال دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ کسی میں مہارت حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے، اِس کے برعکس مولانا نے خود اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں تعلیمی نفسیات کے اِس اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''میرے استاذ نے ایک ایسی فضا میرے لیے پیدا کر دی کہ عربی زبان و ادب میں مہارت میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی مسرت اور سب سے بڑا اعزاز بن گیا، اسی میں کمال حاصل

کرنا میرا مقصودِ حیات بن گیا، اور اپنے ذہن ودماغ کی ساری صلاحیتیں میں نے اس کے لیے وقف کردیں، چنانچہ اس فطری اندازِ تعلیم اور یکسوئی ودلچسپی کے باعث ادب وانشاء پر مجھے تھوڑی بہت قدرت حاصل ہوگئی۔''

اِس سلسلے میں مولانا نے ایک دلچسپ لطیفہ بھی سنایا کہ ۱۹۵۱ء میں مصر کے دورے کے موقع پر وہ شیخ ازہر کے صدر دفتر میں جب گئے، اور اُنہوں نے ازہر کے نظامِ تعلیم پر اپنی رائے اور مشورے ان کی خدمت میں پیش کیے، تو اُنہوں نے درخواست کی کہ یہ تجاویز مولانا قلمبند کر کے شیخ محمود شلتوت کو دے دیں، جو خود ایک بڑے ماہر تعلیم اور اس وقت جامع ازہر میں ایک شعبہ کے انچارج تھے۔ شیخ شلتوت تجاویز پر مشتمل مولانا کی عربی عبارت کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے، اور فی الفور یہ سوال کیا کہ آپ نے عربی کیسے پڑھی؟ اس موقع پر مولانا نے انھیں بتایا کہ اُن کی تعلیم ایک ایک مضمون اور بیک وقت ایک ہی زبان کی ہوئی، یعنی جب ادب شروع کیا تو پھر ادب ہی ادب پڑھا، اور جب تفسیر کا آغاز کیا تو پھر جملہ توتیں اسی پر صرف کیں، اسی طرح دیگر فنون اور علوم کا معاملہ بھی رہا۔ شیخ شلتوت نے فرمایا کہ یہ طریقہ واقعی صحیح ہے اور ابن خلدون نے بھی اسی کی موافقت کی ہے؛ مگر اس طرز تعلیم کی کامیابی کا غالباً ایک راز یہ بھی تھا کہ مولانا کو منتخب ترین اور اپنے فن کے ماہر اساتذہ کی خدمات حاصل ہوئیں۔ [1] مولانا نے جدید مغربی تعلیم کے اس انداز پر

---

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مولانا کو شروع سے ہی ماہر عرب اساتذہ پڑھانے کو ملے، لیکن مولانا یہ بھی کہتے تھے کہ صرف استاد کے ماہر ہونے سے ہی سب کچھ نہیں ہوتا، اصل تو طالب علم کی محنت اور جدوجہد ہے، ایک تقریر میں طلبۂ ندوہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''میرے عزیزو! تم سے کہتا ہوں کہ سارا دارومدار اپنی محنت اور لیاقت پر ہے، کوئی اضافی چیز، کوئی خارجی چیز آدمی کو نہ عالم بنا سکتی ہے نہ ادیب بنا سکتی ہے، اور نہ زندگی میں کامیاب بنا سکتی ہے، یہ سب اس عہد کے دھوکے ہیں، .... بے شک ہلالی صاحب یہاں آئے اور وہ بہت بڑے زبان کے مزاج داں، نباض تھے، اور میری خوش قسمتی اس میں زیادہ ہے کہ مجھے شروع ہی میں عرب استاد ملے لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا، ان کے تو صدہا شاگرد ہیں، ہمارے استاد خلیل عرب صاحب کے صدہا شاگرد ہوں گے، وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں برسوں سے پڑھا رہے تھے، اور ہر سال ان کو بی. اے.، ایم. اے. کی کلاسیں ملتی تھیں، اور خود ان کے گھر کا جو مدرسہ تھا اس میں بھی درجنوں آدمی آئے اور پڑھ کر گئے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا..... اصل یہ ہے کہ جو آدمی شروع میں محنت کرے، اور کسی چیز میں پختگی پیدا کرے، اور اس پر وہ تھوڑی سی قربانی دے دے، یعنی کچھ تکلیف اٹھا کر اور اپنی صحت کو خطرے میں ڈال کر اور دنیا سے آنکھیں بند کر کے، ہر انعام، ہر تعریف، ہر اعتراف سے بالکل مستغنی ہو کر اپنے ذوق سے، اندرونی جذبہ سے اگر کام میں لگ جائے تو اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' (طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، حصہ اول، شائع کردہ: سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی، طبع اول: ۲۰۱۲ء، صفحہ ۸۱-۸۲)

تنقید فرماتے ہوئے کہ طالب علم ہر فن میں جنرل نالج حاصل کر لیتا ہے، مولانا نے اس طرزِ تعلیم کی خوبی کی طرف اشارہ کیا جہاں استاذ کی وحدت اور مضمون کی وحدت پر زور دیا جاتا تھا، کچھ شاگرد ایک استاذ سے وابستہ ہو جاتے تھے، اور اپنے فن کی تکمیل کرتے تھے۔

میں نے عرض کیا کہ اس وقت ملک میں اس اندازِ تعلیم کو اختیار کرنے والا کوئی بھی ادارہ موجود نہیں، اور سوال کیا کہ خود ندوہ اس طریقۂ تعلیم کو کیوں نہیں اختیار کرتا؟

مولانا نے ندوہ کے سلسلے میں بہت سی عملی مشکلات کا ذکر فرماتے ہوئے کہا کہ ''اس طریقۂ تعلیم کی افادیت کے باوجود، بڑے مدارس میں اس کا اپنانا دشوار ہے۔''

تفسیر وحدیث اور فقہ کی تعلیم

مولانا نے اپنے تعلیمی مراحل پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: ''دو یا تین سال مسلسل خلیل عرب صاحب سے عربی ادب کی تعلیم کے بعد تقریباً ۱۹۲۹ء میں جب ادب سے فارغ ہوا، تو حدیث وفقہ کی تعلیم کے لیے ندوہ بھیجا گیا، اور ندوہ میں مولانا شبلی فقیہؒ، شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خانؒ سے وابستہ ہو گیا۔ اسی دوران کچھ عرصہ دار العلوم (دیوبند) میں بھی قیام رہا، اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے استفادہ کیا۔ حدیث کی تکمیل کے بعد میں نے تفسیر کی طرف توجہ کی، اور لاہور جا کر مولانا احمد علی صاحب [لاہوری] سے تفسیر کے سلسلے میں استفادہ کیا۔ اسی دوران مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی ادارت میں ندوہ سے عربی رسالہ "الضیاء" نکلا، اس کی اشاعت وترتیب میں میرا بھی بڑا حصہ تھا، اس کے ذریعہ عربی میں لکھنے لکھانے کا شوق پروان چڑھتا رہا، پھر خوش قسمتی سے ندوہ میں اسی زمانہ میں عربی ادب کے ایک استاذ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی تین سال کے لیے تشریف لائے، ان سے تین سال میں اتنا فائدہ ندوہ کو پہنچا، جتنا کہ کسی دوسرے استاذ سے تیس سال میں پہنچتا۔ ندوہ کی جدید نسل انھیں کی فیض یافتہ ہے۔ انھوں نے ہماری عربی ادب کی صلاحیت کو مزید نکھارا، ان سے سب سے زیادہ فائدہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اٹھایا۔''

ندوہ میں خدمت تدریس کی انجام دہی

''ندوہ میں بحیثیت استاذ آپ کا تقرر کب ہوا اور کتنے دنوں یہ سلسلہ قائم رہا؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

ہم لوگ پون گھنٹہ سے خانہ کعبہ کی شبیہ اس مقدس مسجد کے دامن میں ایک شیخِ وقت کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان میں اس قدر محو تھے کہ سروں پر چمکتے ہوئے سورج کی تمازت کا احساس

بھی نہیں ہوا، اپنے اگلے سوال کے ساتھ میں نے آم کے درختوں کے سائے کی طرف کھسکنا شروع کیا اور پوری مجلس -- جس میں مولانا کے چند مہمان بھی انٹرویو کی دلچسپی کے باعث شریک ہو گئے تھے- صحنِ مسجد کے ایک سایہ دار مقام پر آ گئی۔

مولانا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''تقی الدین ہلالی صاحب جب بغداد تشریف لے گئے، تو مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے بھی وہاں جانے کی کوشش شروع کی، اور اپنی جگہ پر ''اَلضِّیَاء'' کی ادارت سنبھالنے کے لیے مجھے بلایا، میں اس وقت لاہور میں تھا اور اسی غرض سے ندوہ آیا، مگر بعد میں مولانا مسعود عالم صاحب پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے تشریف نہ لے جا سکے تو ''اَلضِّیَاء'' کی ادارت کے بجائے میرا تقرر ادب و تفسیر کے استاذ کی حیثیت سے ۱۹۳۴ء میں ندوہ میں ہو گیا اور عربی کا چھٹا درجہ پڑھانے کے لیے مجھے ملا، اس وقت میں دارالعلوم میں نوعمر ترین استاذ تھا، میں مولانا مسعود عالم صاحب ہی کے ساتھ قیام پذیر ہوا، ان سے بڑے گہرے اور برادرانہ تعلقات تھے، ہر وقت کا ساتھ رہتا تھا، سیاسی تبصرے اور ادبی تنقیدیں ہوتی تھیں، طرح طرح کے موضوعات پر ہمہ وقت گفتگو رہتی اور کام کے نقشے بنتے۔ ندوہ میں تدریس کا یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک رہا، سات آٹھ سال تو باقاعدہ اسٹاف میں رہ کر کام کیا، پھر بعد میں اعزازی طور پر یہ خدمت انجام دیتا رہا۔''

تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا آغاز اور اس کے محرکات

میں نے اگلا سوال مولانا کے سامنے رکھا: ''آپ کی مؤلفانہ زندگی کا آغاز کب ہوا؟ اس کے کیا محرکات تھے؟''

''تصنیف و تالیف کا ذوق تو وراثتاً مجھے ملا تھا، اور تعلیم کے بعد عربی کا نیا نصاب تیار کرنے کا جذبہ دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سید احمد شہیدؒ کی شخصیت اور ان کی سرگرمیوں کی مکمل تاریخ لکھنے کی آرزو بھی تھی۔ مولانا مسعود عالم مرحوم نے ان کی تحریک اور ان کے فکری و نظری پہلو پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کا فیصلہ کیا، اور مجھے ان کی شخصیت پر لکھنے کی ذمہ داری دی؛ چنانچہ سیرت سید احمد شہیدؒ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، [1] میری پہلی تصنیف کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئی۔''

(۱) سیرت سید احمد شہید کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء کے آغاز میں شائع ہوا۔ (کاروانِ زندگی، حصہ اول، شائع کردہ: مکتبہ اسلام لکھنؤ، ۲۰۰۰ء، صفحہ ۱۸۷۔)

م نسیم صاحب نے اس موقع پر مولانا کی لکھی ہوئی ایک چھوٹی سی دعاؤں کی کتاب[1] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو وہ ساتھ لائے تھے، اور جو ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی، کہا کہ ''آپ کی پہلی تصنیف غالباً یہ تھی؟''

مولانا نے فرمایا: ''اس طرح کے چھوٹے موٹے پمفلٹ اور کتابیں اس سے پہلے لکھی جا چکی تھیں، مثلاً ''وصیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم''، ''تفسیر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ''[2] وغیرہ۔ شروع میں مَیں نے عربی میں لکھنا شروع کیا، پھر اردو میں بھی تألیفی کام شروع ہوا، اور دونوں زبانوں میں ساتھ ہی ساتھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔''

سیرت سید احمد شہیدؒ کی تالیف

مولانا کی اس انتہائی اہم اور انقلاب آفریں تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کے سلسلے میں، جس کے اندر انیسویں صدی کے نصف اول کے ایک مجاہد کبیر اور اس کے سرفروش و جان نثار اصحاب کی قربانیوں اور جانفشانیوں کی مفصل اور انتہائی تأثر انگیز روداد بیان کی ہے، میں نے مزید تفصیلات جاننے کی خواہش ظاہر کی، اور پوچھا کہ آپ نے اس کتاب کے مواد کے سلسلے میں زیادہ انحصار کن ذرائع پر کیا؟

''اس کے لیے میں نے ٹونک کے سفر کیے، اس لیے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہمارے خاندان کی ایک شاخ نواب وزیرالدولہ کی دعوت پر وہیں چلی گئی تھی، وہاں ان کے حالات کی قلمی روداد ''وقائع احمدی''[3] کے نام سے اب تک موجود ہے، اس کے علاوہ مولانا سید جعفر علی نقوی بستویؒ جو بالاکوٹ سے واپس آئے تھے، ان کی کتاب ''مَنْظُوْرَۃُ السُّعَدَاءِ فِیْ اَحْوَالِ الْغُزَاۃِ وَالشُّھَدَاءِ'' میرے لیے راہنما بنی۔ اس کے علاوہ دیگر ذرائع کا ذکر میں نے کتاب کے آغاز میں خود کیا ہے۔ اس کتاب کی تمہید میں نے ایک روز سورج نکلتے ہوئے دریائے بناس کے کنارے ایک پتھر پر، پانی میں پاؤں ڈالے ہوئے لکھی۔''

سیرت سید احمد شہیدؒ کی اشاعت کا ملت کے حساس اور غیرت مند افراد پر اثر

''کتاب کی اشاعت کا ملت کے حساس اور غیرت مند افراد پر کیا اثر پڑا؟''

---

(۱) یہ کتاب ''دعائیں'' کے عنوان سے مکتبہ اسلام لکھنؤ نے شائع کی ہے۔

(۲) ۱۲-۱۶ صفحات کے یہ دونوں رسالے عمدۃ المطابع پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے، تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔

(۳) وقائع احمدی کے مخطوطہ کا عکس - جو ۲۲۷ صفحات پر مشتمل ہے - حضرت شاہ نفیس الحسینیؒ کی توجہ و اہتمام سے سید احمد شہید اکاڈمی، لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کر دیا ہے۔

''یہ کتاب خود میری زندگی میں ایک واضح موڑ کی باعث ہوئی، مجھے روح کی حلاوت اور قلب کی بیداری کا پہلی مرتبہ احساس ہوا، میرے قلب پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ عالم مادیات کے علاوہ کوئی اور بھی عالم ہے، جو انسان کو کیف ونشاط اور توانائی اور تب وتاب عطا کرسکتا ہے، ان روحانی محسوسات سے زندگی میں نئی آرزو اور نئے ولولوں کے دریچے کھل گئے، قدیم دینی طبقہ سے اگر چہ میں خاندانی طور پر منسلک تھا، بالخصوص دیوبند کے بزرگوں سے، لیکن میرا ذاتی طور پر مشائخ سے کوئی ذہنی وروحانی ربط نہیں تھا، اس کتاب نے اہل قلوب کی عظمت دماغ پر واضح کردی، اور ظاہری چیزوں سے آگے بڑھ کر روح کی حقیقت سمجھ میں آئی، نمازوں میں کچھ اور لطف آنے لگا، اور دین کی خدمت کے لیے ایک وارفتگی کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ پڑھی گئی، یہ دور تاریخی اعتبار سے ملی بیداری کا دور تھا، مسلم لیگ اور دوسری تحریکوں نے سیاسی حیثیت سے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی تھی، مولانا مودودی کی تحریروں نے ان میں خود اعتمادی، خودنگری اور تحریکی شعور بیدار کیا تھا، چنانچہ اس عالم میں شوکت وقوت کا پیام ان کے لیے اپنے اندر بڑی کشش اور اپیل رکھتا تھا۔ 'سیرت سید احمد شہیدؒ' میں اُنھیں یہ چیز حاصل ہوگئی، اعلائے کلمۃ الحق اور کفر سے نبردآزما ہونے کی خاطر سید احمد شہیدؒ نے یہ ساری تحریک شروع کی تھی، یہ کتاب ۲۳-۲۴ سال کی عمر میں لکھی گئی۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اس اہم موضوع پر قلم اٹھانے کے اصلاً مجاز مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تھے، جو میرے مقابلہ میں زیادہ صاحبِ نظر تھے، بہرحال چندہی ماہ میں اس کا پہلا ایڈیشن نکل گیا۔ بعض بعض لوگوں نے اس کو گیارہ گیارہ مرتبہ پڑھا، اور کچھ لوگ تو اس کے نیم حافظ سے ہوگئے۔ لوگوں کے اس سلسلے میں خطوط بھی آئے، اور اُنھوں نے اپنے تأثرات وکیفیات بیان کیں۔''

''پھر آپ نے بھی تو مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کو متشکل کردیا تھا، اس لیے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس آئینے میں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے واضح خطوط کی جھلک دیکھی، بعض اوقات اس طرح کی کتابیں زندگی کے نازک اور اہم ترین گھڑیوں میں استقلال وتحمل کی شمعیں جلادیتی ہیں، مولانا مودودی کو جب پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی، تو وہ پھانسی گھر کی تنہائیوں میں 'تحریک مجاہدین...' کا مطالعہ باربار کرتے تھے۔'' م.نسیم صاحب نے-جو بڑی محویت کے ساتھ مولانا کی گفتگو سن رہے تھے- کہا۔

تحریکی اور داعیانہ سرگرمیوں کا آغاز

''آپ کی تحریکی اور داعیانہ سرگرمیوں کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟''

''اس صدی کی تیسری دہائی میں خاکسار تحریک اپنے شباب پر تھی، اور اس کا اثر یہ پڑ رہا تھا کہ نوجوانوں میں دینی فکر ونظام سے بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔ علامہ مشرقی کی تحریروں سے ان کے اندر علماء ومشائخ کے خلاف نفرت اور بڑی بیباکی اور خودسری سی آرہی تھی۔ ہم سب لوگ اس سے متفکر تھے۔ یہ ذہنی انارکی کچھ اسی طرح کی تھی جیسی کہ کمال اتاترک نے ترکی میں نوجوانوں کے اندر دینی نظام کے خلاف پیدا کی تھی۔

اس زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تنظیم ایسی ہونی چاہیے جو اس خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرے، اُنھوں نے اپنے طور پر بریلی میں ''محمدی تنظیم'' اسی مقصد سے قائم بھی کی تھی، اُن کو اس تنظیم کے لیے ایک قائد کی تلاش بھی تھی، جو ہر حلقۂ خیال میں مقبول ہو سکے، اور جس کے ساتھ دیوبندی بریلوی کا جھگڑا نہ لگا ہو، مولانا دیوبندیوں کے مشہور مناظر رہ چکے تھے۔

اسی زمانہ میں میری کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' شائع ہوئی، یہ کتاب دیکھ کر ان کو یہ حسن ظن یا غلط فہمی ہوئی کہ شاید میں اس کام کے لائق ہوں، چنانچہ اُنھوں نے مجھے خط لکھا کہ تمہاری کتاب میں نے دیکھی اور میری نیند اڑ گئی، کچھ کرنے کا بھی خیال ہے یا فقط کتاب ہی لکھ دی ہے؟ میں نے جواب لکھا کہ ضرور کچھ نہ کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ اس پر وہ یہاں آگئے، یہ ان سے میری پہلی شعوری ملاقات تھی۔ میں نے اُن سے بتایا کہ میں قیادت وامامت کا اہل نہیں ہوں، شخصیت ووجاہت بھی نہیں رکھتا، اور قائدانہ صلاحیت بھی نہیں۔ اُنہوں نے کہا: کوئی اور نام تجویز کرو! میں نے ان سے کہا کہ میرے انگریزی کے ایک استاذ اور عربی میں شاگرد حاجی عبدالواحد صاحب ہیں، جو انگریزی میں ایم. اے. ہیں، ان کو تیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم دونوں ان سے ملنے کے لیے کوئٹہ (بلوچستان) گئے، جہاں ان کا قیام تھا۔ راستے میں لاہور میں رک کر مولانا مودودی سے بھی ملاقات کی گئی، یہ میری موصوف سے پہلی ملاقات تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ پہلے ہم کو موجودہ دینی تحریکوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، اور یہ جائزہ لینا چاہیے کہ ہم دین وملت کے لیے کوئی کام ان سے مل کر کریں یا الگ۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ ہم لوگ جلد ہی اس طرح کا جائزہ لینے کے لیے ایک ساتھ نکلیں۔

یہ ۴۰ء کا زمانہ تھا، اسی دوران میں نے 'ترجمان القرآن' میں مولانا مودودی کا ایک مضمون 'ایک اہم دینی تحریک' کے عنوان سے دیکھا، یہ مضمون مولانا الیاسؒ کی تحریک سے متعلق تھا، مجھے یاد ہے کہ اس مضمون کو اس طرح ٹہل ٹہل کر پڑھتا تھا، جیسے کوئی لذیذ چیز کھائی جائے۔ اس وقت جماعت اسلامی کی تنظیم قائم نہیں ہوئی تھی، ہم لوگ دینی جماعتوں کے جائزہ کے لیے سہارنپور میں اکٹھے ہوئے، اور وہاں سے سب سے پہلے رائے پور گئے۔ مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، صبح چائے کے بعد سے ۱۲ بجے تک مسلسل بات کرتے رہے، اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے نشیب وفراز کی پوری تاریخ کا جائزہ لیا۔ تحریک خلافت، اس کے منظر و پس منظر پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ہم لوگوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ اس طرح کی تحریک اور قیادت کی تلاش میں نکلے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ بڑے شوق سے یہ جستجو جاری رکھیے، آپ لوگ یہ کام کرسکتے ہیں، تو پھر اس سے بہتر کیا بات ہے!۔ مزید برآں یہ بھی فرمایا کہ حضرت دہلوی (مولانا الیاس صاحب) یہ کام کررہے ہیں، اسے بھی ضرور دیکھ آئیے۔ اس کے بعد ہم لوگ دیوبند گئے، مولانا حسین احمد مدنیؒ اس زمانہ میں غالباً جیل میں تھے، وہاں سے ہم لوگ دہلی آئے، اور وہاں سے میوات گئے۔ مولانا الیاس صاحب سے مل کر طبیعت بے حد متاثر ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ہمارے درمیان کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہوسکا، مولوی عبدالواحد صاحب چاہتے تھے کہ یکسو ہوکر ایک جگہ بیٹھ جائیں اور یہ کام کریں، میں نے کہا کہ میرے اس طرح کے حالات نہیں ہیں، اس کے بعد مولانا منظور صاحب بریلی چلے گئے، میں نے اسی زمانہ میں اپنے اس سفر کے تاثرات کو 'ایک ہفتہ دینی مرکزوں میں' کے عنوان کے تحت ایک مضمون میں بیان کیا۔''

جماعت اسلامی سے وابستگی اور اس سے علاحدگی

مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''اب جماعت اسلامی کی تشکیل ہوچکی تھی، مولانا منظور صاحب اس کے باقاعدہ رکن ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں مولانا مودودی لکھنؤ تشریف لائے، آنے کی تقریب یہ ہوئی کہ مسلم لیگ نے دستور مملکت اسلامیہ کی ترتیب کے لیے ایک کمیٹی ۸-۱۰ آدمیوں پر مشتمل بنادی تھی، جس میں نواب باغپت جمشید علی خاں صاحب، نواب چھتاری وغیرہ بھی تھے۔ اس کمیٹی کا لکھنؤ میں اجلاس ہوا، اور اس کے تحت تین آدمیوں کو خاص طور پر مدعو کیا گیا، وہ تھے: (۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولانا آزاد سبحانی (۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

مولانا مودودی نے مجھے تحریر فرمایا کہ مجھے اس جلسہ سے تو زیادہ دلچسپی نہیں، البتہ میں لکھنؤ آنا چاہتا ہوں، میرے قیام کا انتظام ایسی جگہ کرو جہاں میں سب لوگوں سے اطمینان سے مل سکوں۔ مجھے مولانا کے خط کا ایک جملہ اب تک یاد ہے: 'چونکہ خدا نے مجھے بے ہمہ بنایا ہے، اس لیے باہمہ بن گیا ہوں۔' مولانا کے ساتھ مستری محمد صدیق صاحب بھی تشریف لائے، جو ایک صاحبِ دل اور روشن ضمیر انسان تھے، وہ مولانا کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے تھے۔ میں نے مولانا کو آنے سے قبل لکھا تھا کہ کوئی مضمون بھی اس آمد کے موقع پر پڑھیں، چنانچہ میری فرمائش پر مولانا 'نیا نظامِ تعلیم' لکھ کر لائے۔ میں نے ان کی میزبانی کی، اس کے بعد جماعت کی تشکیل ہوئی، تو مولانا منظور صاحب لکھنؤ تشریف لائے، اور لکھنؤ کا حلقہ میرے سپرد کیا گیا۔

اسی زمانہ میں مولانا نے فرمائش کی کہ ان کے کچھ مضامین کا عربی میں ترجمہ کراؤں، میں نے لکھا کہ مولانا مسعود عالم اس کے لیے زیادہ موزوں رہیں گے، چنانچہ ان سے میں نے ہی خط وکتابت کی اور آمادہ کیا، اگرچہ وہ کہا کرتے تھے کہ "میں سو فیصدی کسی کا ترجمان (Mouth Piece) نہیں بن سکتا، بلکہ میں خود اوریجنل کام کرنا چاہتا ہوں۔" بہر حال میں نے کچھ ترجمے کروائے، پھر انہماک تبلیغی کاموں میں بڑھنے لگا اور میں نے امارت حلقہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جانا مناسب سمجھا، چنانچہ میں نے مولانا کو لکھا، مولانا نے بڑی وسعتِ قلب سے جواب دیا کہ تم جس فیصلے پر پہنچے ہو، وہ صحیح ہے۔"

عالم عربی کے مسائل ومعاملات سے دلچسپی

مولانا اپنی گذشتہ زندگی کے دلچسپ واقعات کو زینہ بزینہ بے تکلفی اور فراخ دلی کے ساتھ بیان کر رہے تھے، گویا وہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس کے ہر ہر صفحہ سے صاحب تصنیف کو عشق ہے، اور کسی بھی صفحہ پر پشیمانی، افسردگی، ہزیمت اور شکست خوردگی کی قطعی کوئی جھلک نہیں۔

اب میرا اگلا سوال مولانا کی زندگی کے ایک اور اہم پہلو سے متعلق تھا:

"آپ نے عالم اسلام بالخصوص عالم عرب کے مسائل ومعاملات سے کب اور کیوں دلچسپی لینی شروع کی؟"

"۴۳ء-۴۴ء کے قریب میں نے اپنی تصنیفی وتالیفی مصروفیات کے سبب ندوہ کی تدریسی خدمات سے سبکدوشی حاصل کر لی، اور یہ فیصلہ کیا کہ اپنی محدود وحقیر تحریری صلاحیتوں کو عرب ممالک کی طرف موڑوں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں ایک حلقہ کو جماعت اسلامی

سنبھال رہی ہے، اور دوسرے حلقہ کی طرف تبلیغی جماعت متوجہ ہے، خود مجھے عرب ممالک کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، اور ان کی بیداری واصلاح کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے داعیانہ مضامین لکھنے شروع کیے۔ اس نئے محاذ پر کام کرنے کے سلسلہ میں مجھے مولانا مودودی کی تحریروں سے بڑا فائدہ پہنچا، اور پورے عالم اسلام کو ایک بلند سطح سے خطاب کرنے اور جھنجوڑنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اس وقت میرے پاس عالم عربی کے سبھی مکاتب خیال کا لٹریچر آتا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم ہندوستان میں جس مقام سے سوچ رہے ہیں، عالم عرب ابھی اس کے مقابلہ میں نیچی سطح پر ہے۔ ان پر ابھی یہی حقیقت واشگاف نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں کا مقام قیادت کا ہے، اور صرف اسلام ہی وہ نظام زندگی ہے جس میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ ہمارے لیے اس تضاد کی کیفیت کا سمجھنا بڑا مشکل تھا کہ جس جگہ سے اسلام کی دعوت بلند ہوئی، وہاں کے رہنے والے علماء وشیوخ اب خود اعتمادی اور خود شناسی سے محروم ہیں۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کوئی نہیں جو مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبال اور مولانا مودودی کی طاقت واعتماد کے ساتھ یورپ کی مادیت کو چیلنج کرے، اور اسلام کی عظمت کا پیغام پیش کرے۔ مصر کے عظیم مفکر شیخ محمد عبدہٗ کا انداز بھی معذرت خواہانہ تھا، وہ بھی اسلام کی مجبوریاں گنواتے تھے، مثلاً اگر ایسا نہ ہوا تو مجبوری تھی، سوسائٹی پست تھی، حالات ناسازگار تھے، یا غلامی اگر منسوخ نہیں کی گئی تو دراصل کچھ مشکلات تھے، لیکن اس کو منسوخ کردینے کا ارادہ ضرور تھا۔ اس کمزور اور شکست خوردہ انداز سے مجھے سخت وحشت ہوتی تھی، اور میں انھیں بتانا چاہتا تھا کہ یورپ کی مریض تہذیب اب لب گور ہے اور جان کنی کے عالم میں ہے۔''

مغربی تہذیب سے مرعوب نہ ہونے کے اسباب

''مگر مولانا! مغربی تہذیب سے مرعوبیت آپ کے اندر کیوں نہ پیدا ہوئی، جب کہ یہاں بھی اکثر ہمارے مذہبی طبقہ کا حال کچھ دنیائے عرب کے لوگوں جیسا ہی ہے؟'' میں نے بیچ میں سوال کیا۔

''دراصل مغربی تہذیب کے اثر سے آزاد ہونے میں خاص اثر ہمارے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب کا تھا، انھوں نے اعلیٰ درجہ کی عربی وانگریزی تعلیم حاصل کی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی ودینی درسیات کی تعلیم حاصل کی اور تکمیل حدیث حضرت شیخ الہندؒ سے کی تھی، نیز طب یونانی کی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی اور حکیم اجمل

خاں سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ ڈاکٹر انصاری سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ اپنے اس علم وفضل کے ساتھ ہی مشرقی وضع قطع کے سخت پابند تھے، دیسی لباس اور شرعی صورت انہیں عزیز تھی، ذہنی طور پر وہ ذرا مغرب سے مرعوب نہیں تھے؛ لیکن ان کے اندر یہ حقیقت پسندی ضرور تھی کہ مغربی علوم میں جو چیزیں قابل استفادہ ہیں، ان کی اہمیت کا احساس اور ان سے استفادہ کی ضرورت وہ پوری طرح محسوس کرتے تھے۔ گھریلو معاملات اور لباس میں اس قدر متقشف ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مرحوم علمی معاملات اور مسلمانوں کی تہذیبی ترقی کے معاملہ میں بہت ہی وسیع النظر تھے، عربی مدارس کے نصاب میں انقلاب آفریں تغیر کے حامی تھے، سائنسی علوم کے قدرداں تھے، انگریزی وعربی کے نئے نئے اور تازہ ترین پرچوں اور کتابوں کے مطالعہ کے شوقین تھے، اس کے ساتھ ہی مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتے، دینی سرگرمیوں میں حصہ لینا اُن کا مرغوب مشغلہ تھا، سیاسی معاملات میں بھی بالغ النظر انسان تھے، ان کی صحبت وتربیت نے مجھے مغربی تہذیب کے طلسم سے محفوظ رکھا۔

اس کے علاوہ فکری اعتبار سے مغربی تہذیب کے ناقص پہلوؤں کو سمجھنے میں مولانا مودودی کی ''تنقیحات'' سے بڑی مدد ملی، اس کے علاوہ خود مغرب کے اندر متضاد قوتوں اور متصادم رجحانات کے مطالعہ نے ان کی کمزوریوں کو مجھ پر واضح کیا۔ اس بات پر مجھے سخت تشویش اور اضطراب تھا کہ عرب فضلاء واہل قلم کمزور زبان کیوں بولتے ہیں، اور اُنھیں مغرب کے فلسفے ونظام کی مضرتیں اور خامیاں کیوں نہیں نظر آتیں؟''

''مَاذَاخَسِرَ الْعَالَمُ...'' کی تصنیف کی تقریب

''اور غالبًا اسی احساس اور انہیں مشاہدات کا نتیجہ تھا کہ آپ نے عالم عرب کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارنے کے لیے اپنی معروف ومشہور کتاب ''مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِیْنَ'' لکھی؟''

''جی ہاں! اس کتاب کی تصنیف کی تقریب یہ ہوئی کہ دہلی میں مولانا مودودی نے فرمایا کہ علی گڑھ کے لوگ چاہتے ہیں کہ تم وہاں جاؤ تو ایک تقریر بھی کرو۔ میں نے عرض کیا کہ تقریر کے لیے میرے نزدیک مناسب موضوع یہ ہوگا: ''مسلمانوں کی قیادت کے فقدان سے انسانی دنیا کس خسارہ میں پڑی؟'' مجھے یاد ہے کہ مولانا نے اس موضوع کو پسند فرمایا اور ان کے یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں: ''تم اس کتاب میں یہ لکھو کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کی قیادت سے

دستبردار ہونے کے بعد شتر بے مہار ہوگئیں۔'' پھر میں علی گڑھ نہ جاسکا اور معذرت کردی۔ کچھ مدت کے بعد عربک کالج (دہلی) سے دعوت آئی کہ وہاں کسی موضوع پر اظہار خیال کروں، پھر یہ عنوان ذہن میں کلبلایا اور میں نے اپنے اندر اس پر لکھنے کا ایک شدید تقاضا محسوس کیا۔ میں اندرونی طور پر محسوس کررہا تھا کہ یہ ایک جیتا جاگتا موضوع ہے، جس کا حق میں ادا کرسکوں گا، مگر پھر بھی جلسہ جلوس سے بھاگنے اور زیادہ تر خاموشی کے ساتھ لکھنے لکھانے کے ذوق کی وجہ سے وہاں بھی نہ جاسکا اور معذرت کردی، مگر موضوع ذہن پر مستولی رہا، پھر میں نے اسے عربی میں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کتاب میری ذہنی زندگی کا ایک دوسرا موڑ ثابت ہوئی، اور اس کے ذریعہ عالمِ عرب میں اسی طرح متعارف ہوا جیسے کہ 'سیرت سید احمد شہیدؒ' کے ذریعہ ہندوستان کے دین پسند حلقہ میں روشناس ہوا تھا۔''

"مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِیْنَ" کا طرزِ تحریر اور اسلوب

''آپ نے اس کتاب میں کون سا اسلوب، طرزِ تحریر یا اسٹائل اختیار کیا؟ میری مراد ہے کہ عالمانہ، محققانہ اور ادبی انداز بیان، یا جیسا کہ تاریخی حقائق و واقعات کے لیے بیانیہ اسلوب یا زبان کے چٹخارے کے لیے انشاء پردازانہ اسالیب ہیں؟''

''میں ہمیشہ جدید ترین اور دلکش ترین اسلوب کا قائل رہا ہوں، اور زبان کا معاملہ ایسا ہے کہ ایک ماہ بھی اگر تازہ چیزیں نہ دیکھی جائیں تو کہنگی طاری ہونے لگتی ہے۔ جب میں "مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ" لکھ رہا تھا، تو وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور عرب ممالک سے لٹریچر آنا بند ہوگیا تھا، چنانچہ میں وہاں کے ادبی وثقافتی قافلہ سے ۳-۴ سال پیچھے رہ گیا، پھر بھی میں نے ایک نئے اسٹائل کا تجربہ کیا، اور اس داعیانہ اسلوب کو عربی میں اختیار کیا جو مولانا مودودی نے اپنی اردو تصنیفات میں اختیار کیا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر احمد امین کا تاریخی اسٹائل مجھے پسند آیا۔ ان کی چار کتابیں "فَجْرُ الْإِسْلَامِ" و "ضُحَی الْإِسْلَامِ" (۱-۲-۳) اس زمانہ میں آئی تھیں، علمی و تاریخی حقائق کے تحلیل و تجزیہ کے وہ ماہر تھے۔ ان کے اسلوب کو میں نے پی لیا، اور اس سے مجھے اپنا اندازِ تحریر ڈھالنے میں مدد ملی۔''

اردو زبان وادب کا مطالعہ اور اردو کے بعض ادباء کا تذکرہ

''مولانا! آپ کے عربی اسلوب سے تو میں لطف اندوز نہیں ہوا ہوں، البتہ آپ کی اردو تصنیفات میں ادبی چاشنی، روانی و شگفتگی اور تاثر انگیزی کی کیفیت ضرور محسوس کرتا ہوں۔!!''

''جی ہاں! اردو ادب میں مَیں ''آبِ حیات'' کے مصنف محمد حسین آزاد، شبلی، حالی اور نذیر احمد کے اسالیب سے متاثر ہوا۔ میری ذہنی وادبی پرداخت ابتدا میں خالص ادبی کتابوں کے درمیان ہوئی۔ رتن ناتھ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' کی ایک ادبی چاٹ سی لگ گئی تھی، اسی وقت سے شگفتہ انداز اور دل پسند اسلوب میں مطالب بیان کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس سے قبل والد صاحب کے طرزِ تحریر سے متاثر ہوا، جن کی تحریر میں ادبی بانکپن خاصی حد تک موجود تھا۔ مرحوم نے گجرات پر ''یادِ ایام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جو تاریخ نویسی کا ایک کامیاب، دلآویز نمونہ ہے۔ پھر شبلی اسکول کا، جس سے میں خاص طور پر قریب رہا، یہ خالص وصف رہا ہے کہ موضوع خواہ کیسا ہی حکیمانہ، فلسفیانہ اور تاریخی ہو، لیکن ادب و انشاء کا دامن کہیں بھی نہ چھوڑا جائے۔''

"مَاذَاخَسِرَ الْعَالَمُ..." کی اشاعت

''مولانا! ہم اپنے پہلے موضوع کی طرف پھر لوٹنا چاہتے ہیں، کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کی تصنیف "مَاذَاخَسِرَ الْعَالَمُ" کا دنیائے عرب پر کیا اثر پڑا؟''

''سب سے پہلے تو اس کی اشاعت کا قصہ سنیے! کتاب جب مکمل ہوئی تو وہ دوسری جنگ عظیم کا دور تھا۔ اپنی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود دل یہ کہتا تھا کہ کتاب چھپنی چاہیے، چنانچہ میں نے مصر میں بغیر کسی تعارف کے ڈاکٹر احمد امین کو ایک خط لکھا، وہ "لَجْنَةُ التَّأْلِيْفِ وَالتَّرْجَمَةِ وَالنَّشْرِ" کے صدر تھے، اس دور میں خط بھی مصر پہنچنا ایک دشوار امر تھا، ان کا جواب آیا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے سلسلے میں آپ کے مآخذ کیا رہے ہیں؟ کیا آپ نے جدید مغربی مآخذ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے؟ میں نے کتاب کی فہرستِ مضامین ان کو ارسال کی، اور جن انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا تھا، اس کا بھی حوالہ دیا۔ انہوں نے کتاب کا مسودہ طلب کیا اور میں نے ارسال کر دیا، ان کا بڑا تاثراتی خط آیا، میں نے ان سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، مگر حیرت ہے کہ مقدمہ ان تاثرات سے خالی ہے جو اُنھوں نے خط میں ظاہر کیے تھے، اور ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اُنھوں نے کچھ شک کے ساتھ لکھا ہے، پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کتاب کا کیا انجام ہوا۔

۵۰ء میں جب میں حجاز گیا اور اتفاق سے شامی سفیر سے ویزا لینے کے لیے ان کے دفتر گیا، وہ ایک اچھے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی تھے، اُنھوں نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا، اثنائے گفتگو کہنے لگے کہ ہندوستانی علماء کی تحریر میں بڑی حقیقت پسندی، بڑا سوز وگداز اور بڑا دردو اثر ملتا ہے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے کہا کہ ابھی میں مصر گیا تھا، وہاں ایک ہندوستانی عالم کی کتاب

"مَاذَاخَسِرَ الْعَالَمُ" پرنظر پڑی اور اسے میں خرید کر لایا، پڑھنے کے بعد میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ذرا مجھے وہ کتاب دکھلایئے، موصوف نے کتاب مجھے دکھلائی۔ اس طرح میں نے پہلی بار اپنی کتاب کی زیارت کی اور اُنھیں بتایا کہ اس کا مصنف آپ کے سامنے حاضر ہے، وہ بڑی محبت وعقیدت سے بغل گیر ہوئے۔"

"مَاذَاخَسِرَ الْعَالَمُ..." کا عالم عرب پر اثر

"یہ کتاب عالم عرب کے لیے کچھ اسی طرح کے مناسب وقت و ماحول میں منظرِ عام پر آئی جیسے کہ "سیرتِ سید احمد شہید" ہندوستان میں ایک پیاسی فضا میں سامنے آئی تھی، مصر میں اخوان پر پابندی عائد ہو چکی تھی اور شیخ حسن البنا کو شہید کیا جا چکا تھا، اخوانی اس نازک گھڑی میں اپنی تحریک کے لیے کسی ذہنی غذا کے حاجت مند تھے، اسی عالم میں یہ کتاب ان کو ملی اور ان کے لیے ایک تحفہ بن گئی، چنانچہ یہ جیلوں کے اندر پہنچی، عدالتوں میں اس کے اقتباسات پیش کیے گئے، اور میں جس وقت مصر پہنچا تو یہ کتاب گھر گھر پھیل چکی تھی، یہ میرے لیے ایک ذریعۂ تعارف (Visiting Card) ثابت ہوئی۔ مصریوں کے ذہن میں یہ تأثر تھا کہ اس کا مصنف کوئی بڑا Up to Date آدمی ہوگا، احمد امین سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور وہ مجھے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے، مجھے مدعو کیا، بے تکلف بات چیت اور ملاقاتیں رہیں۔ اس سفر میں مصر میں میرا قیام ساڑھے پانچ ماہ رہا، اس کے بعد سوڈان، شام وفلسطین بھی گیا، اس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، عالم عربی کو قریب سے دیکھ لینے کے بعد اس کے سامنے دعوتِ حق پیش کرنا میرا مرکزی موضوع بن گیا۔"

دمشق میں محاضرات

"پھر آپ غالباً شام میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر ایک بار Visiting Professor کی حیثیت سے بھی تشریف لے گئے، جہاں کچھ علمی موضوعات بالخصوص ہندوستان کے اہلِ فکر پر تقاریر کیں؟"

"جی ہاں! ۱۹۵۶ء میں جب ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صاحب کی کوشش سے دمشق یونیورسٹی میں "کُلِّیَّۃُ الشَّرِیْعَۃِ" قائم ہوا، تو اُنھوں نے مجھے وہاں مستقل طور پر بلانا چاہا، مگر میں نے ایک مختصر مدت کے لیے وہاں جانا منظور کیا۔ وہاں ہفتہ میں ایک دن تقریر ہوتی تھی، جس کے لیے یونیورسٹی کے منتظمین باقاعدہ دعوت نامے ایشو کرتے، اور طلبہ، اساتذہ اور ممبران پارلیمنٹ اور عرب فضلاء کا

بڑا مجمع یہ تقریر سننے کے لیے باقاعدہ آتا تھا۔ عرب اہلِ علم کے خلوص اور انکسار اور طالب علمانہ انداز کو دیکھ کر میں بہت متأثر ہوا۔''

شعر گوئی کا شوق

میں نے گفتگو کو ایک اور دلچسپ رخ پر موڑنے کے لیے سوال کیا: ''آپ نے اپنی تصنیفات میں عربی و فارسی اشعار بالخصوص علامہ اقبالؔ کے اشعار کا جا بجا حوالہ دیا ہے، کیا آپ کو کبھی شعر گوئی کا ذوق رہا ہے؟''

''جی ہاں! میری طالب علمی کا دور شعر و شاعری کے اعتبار سے بڑی چہل پہل کا دور تھا، اور خوب مشاعرے ہوتے تھے، چنانچہ میں نے بھی کچھ تک بندی شروع کی، مگر بھائی صاحب نے مجھے سختی سے روکا، اور اس حد تک روک ٹوک کی جیسے غزل گوئی کوئی ناجائز فعل ہو۔ بہر حال اس کے بعد اس طرح کا کوئی شوق پھر نہیں اُبھرا۔ ہاں! اچھے اشعار سے ہمیشہ محظوظ ہوتا رہا ہوں۔''

م. نسیم کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی اور وہ اس طرح مسرور ہوئے جیسے کسی کمزور دعوے کے لیے کوئی مضبوط دلیل ہاتھ آ گئی، ''جی ہاں! میرا تو اب تک کا مشاہدہ یہی ہے کہ ہر باذوق کو کبھی نہ کبھی، چاہے ایک بار ہی سہی، یہ شعر گوئی کی چھوت بھی ضرور لگتی ہے''، اور ہماری مختصر سی محفل زعفران زار ہو گئی۔

علامہ اقبالؔ سے تأثر

میں نے اسی رخ پر کچھ اور گہرائی میں اترنا چاہا:

''آپ کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف، روحانیت اور اخلاق میں آپ جس طرح مولانا رائے پوریؒ اور مولانا محمد الیاسؒ سے متاثر ہوئے، اسی طرح فکری طور پر علامہ اقبالؔ سے بھی آپ نے گہرے تأثرات قبول کیے، یہ بات کہاں تک درست ہے؟''

اقبالؔ کے ذکر سے مولانا کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اُنھوں نے بڑے انبساط کے ساتھ کہا:

''عصر حاضر میں ذہنی طور پر میں اقبالؔ سے زیادہ کسی اور سے متأثر نہیں ہوا، 'بال جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور ان کا دیگر کلام جب میں پڑھتا تھا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کہیں اور کی باتیں ہیں۔ اقبالؔ کی فکر، ان کا یقین و اعتماد اور خودنگری کا پیغام میری فکر میں پیوست ہو گیا، میرے شعور و بصیرت پر اُن کا گہرا اثر ہوا۔''

علامہ اقبالؔ سے ملاقات

''کیا اقبالؔ سے آپ کی کبھی ملاقات بھی ہوئی؟''

''جی ہاں! علامہ اقبالؔ سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات پندرہ سال کی عمر میں ہوئی، اس وقت میں نے ان کی ایک نظم کا ترجمہ عربی میں کیا تھا، اسے اُنھیں دکھایا، پھر اُنھوں نے کچھ سوالات کیے اور میری صلاحیت کا امتحان لیا۔ دوسری ملاقات انتقال سے چند ماہ قبل ہوئی، یہ ملاقات خاصی طویل تھی، موصوف ڈھائی تین گھنٹے گفتگو کرتے رہے، رمضان کا زمانہ تھا، وہ صاحب فراش تھے، خادم علی بخش بار بار آتے تھے، وہ کہتے تھے: ابھی رکو! ابھی رکو! مرحوم کو قلبی تعلق اس ملاقات میں پیدا ہو گیا اور جس شفقت کا اظہار فرمایا، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا، اس ملاقات کے بعد میں نے ایک مضمون جالندھر سے نکلنے والے ایک اردو رسالہ میں ''عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ انسان جس کی فکر میں اپنی پرچھائیں دیکھتا ہے، اس پر عاشق ہوتا ہے، چنانچہ یہی معاملہ اقبالؔ کے سلسلے میں ہوا، میں نے اپنے آپ کو وہاں پایا۔''

علامہ اقبالؔ کی شخصیت وفکر کے وہ پہلو جنھوں نے متاثر کیا

''علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور فکر کے کس پہلو نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟''

''اُن کے یہاں میں نے تین باتوں کی آمیزش پائی: ایک تو عشق، بالخصوص ذات نبوی سے عشق، دوسرے اسلام کی برتری اور صلاحیت پر یقین، تیسرے اسلام کے غلبہ وعظمت کی تلاش۔ یہ تینوں چیزیں نسلی اور موروثی طور پر خود میرے خمیر میں تھیں، اور اسی وجہ سے اقبالؔ میرے خوابوں کی تعبیر بن گئے۔''

کیا شعر وادب معاشرے کی کوئی انقلاب آفریں خدمت انجام دے سکتا ہے؟

''بعض لوگ شعر وادب کو اسلامی معاشرے کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے، اور اسے سنجیدگی وتقویٰ کے خلاف سمجھتے ہیں، کیا شعر وادب معاشرے کی کوئی انقلاب آفریں خدمت انجام دے سکتا ہے؟''

''ادب کے ذریعہ کوئی انقلاب لایا جا سکتا ہے، یہ بھی غلط ہے، اور یہ بات بھی غلط ہے کہ کسی ادب کو انقلاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں تناسب وتوازن کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ نے ملت کی تعمیر نو اور معاشرے کی بیداری کے سلسلے میں ایک محدود مگر نہایت بیش قیمت قسط پوری

کی، اُنھوں نے مسلم نوجوانوں کا اسلام پر اعتماد بحال کرایا۔ شعر و ادب کے رول کو متعین کرتے وقت اگر اقبال کو سامنے رکھا جائے تو کسی طرح کی افراط و تفریط نہیں ہوسکتی۔“

باضابطہ کسی سیاسی جماعت سے میرا کبھی ربط نہیں رہا

اب شعر و ادب اور تصنیف و تالیف سے گفتگو ملت کے مسائل اور سیاست کے دائرے میں داخل ہوئی، مولانا نے ہمیں انٹرویو کے لیے صرف ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا، اور تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے، اور میرے سوالات کے اہم اجزاء ابھی اپنی باری کے منتظر تھے، چنانچہ میں نے رفتار تیز کرتے ہوئے پوچھا:

”کیا آزادی سے قبل آپ کا سیاسی تحریکوں سے بھی ربط رہا؟“

”باضابطہ کسی سیاسی جماعت سے میرا کبھی ربط نہیں رہا، البتہ ذہنی طور پر جمعیۃ العلماء سے ایک طرح کا لگاؤ تھا، اس کے برخلاف مسلم لیگ سے کبھی مناسبت نہیں رہی۔ مولانا مدنی سے ہمارے خاندان کے تعلقات اور ان کی ذات کو اس میں خاصا دخل تھا۔ تحریک خلافت کے وقت ۲۱-۲۲ عیسوی میں میں صرف ۸-۹ سال کا تھا، البتہ انگریز دشمنی موروثی طور پر ہمارے یہاں چلی آرہی تھی، اور ان کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، اس کے علاوہ ہمارے اہل خاندان کا مولانا آزاد اور مولانا محمود حسن اور اکابر دیوبند سے ہمیشہ تعلق رہا۔“

ندوہ کے بلند آئیڈیل کو درحقیقت مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکا

”کیا ندوہ کے قیام کے وقت جو آئیڈیل تھے، وہ حاصل ہوئے؟“

اس سوال پر مولانا نے ایک ذرا سے توقف کے بعد ارشاد فرمایا:

”مسلم یونیورسٹی کا جو آئیڈیل رہا ہے، اور اس آئیڈیل کی تکمیل کے لیے جس طرح کے افراد کی اس کو ضرورت تھی، وہ بازار میں مل سکتے تھے۔ ندوہ کا آئیڈیل زیادہ نازک اور بلند تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا آئیڈیل جدید علوم میں ماہر افراد تیار کرنا تھا، جو موجودہ نظام کی مشینری میں آسانی سے فٹ ہوسکیں۔ اس کے بالمقابل ندوہ کے بانیوں کا منتہائے نظر اس سے مختلف تھا، اس سے زیادہ وسیع اور بلند نظر تحریک شاید ہی ہندوستان میں شروع ہوئی ہو، مگر اس بلند آئیڈیل کو، یہ حقیقت ہے کہ مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکا اور وہ پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ایسے اساتذہ نہ مل سکے جو اس آئیڈیل کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ ابتدا میں نصاب بھی ندوہ کو

مستعار لینا پڑا، ابھی تک صرف عربی زبان وادب میں ہم نے ایسا نصاب تیار کیا ہے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکے۔"

اس وقت میرے پردۂ تصور پر بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ کے یہ الفاظ اُبھر آئے جو اُنھوں نے ندوہ کی روداد سال اوّل میں عربی اداروں کے فارغین کی ناگفتہ بہ حالت بیان کرنے کے بعد لکھے ہیں:

> "افسوس صد افسوس! کوئی گروہ طلبہ کا ایسا نہیں نکلتا جو ملحدوں اور جدید فلسفیوں کے اعتراضات کو اسلام سے دفع کرے، جس کا زہریلا اثر بسبب شیوع بے دینی و آزادی کے عالمگیر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا مٹانا ہمارے علماء کا فرض ہے۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی دینی امر کا انتظام کر سکتے ہیں اور نہ اس میں رائے دے سکتے ہیں، حالانکہ اس وقت ایسے گروہ کی ضرورت زیادہ ہے۔"

عربی مدارس میں صنعتی تعلیم کا نتیجہ

"عربی اداروں سے جو طلبہ نکلتے ہیں وہ بے چارے معاشی طور پر خود کو مفلوج پاتے ہیں، کیا معاشی طور پر اُن کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے آپ عربی اداروں میں صنعتی تعلیم کے قائل ہیں؟"

"بیشک اس طرح اپنی درسگاہوں کو خود کفیل بنایا جا سکتا ہے، لیکن جن اداروں نے اس کا تجربہ کیا، وہ دینی اور صنعتی تعلیم میں صحیح تناسب قائم نہیں رکھ سکے، چنانچہ ان اداروں کا اصل مقصد فوت ہو گیا، پھر ایک ایسے گروہ کی بھی ملک وملت کو ضرورت ہے جو ہمہ وقتی خادم دین ہو۔ ہندوستان میں جو دینداری باقی رہ گئی، وہ انھیں اللہ کے بندوں کے ایثار وقناعت کے طفیل ہے۔ ہمارے علماء نے مغربی تہذیب کا جس خود اعتمادی سے مقابلہ کیا، اس کا سبب یہی ہے کہ وہ سیاسی واقتصادی محاذ پر دبے نہیں۔ ۵۷ء کے بعد سے وہ مسلسل حکومت کے عہدوں سے دور رہے، اُنھوں نے خود کو کلیتاً تصنیف وتالیف اور تبلیغِ دین کے کاموں کے لیے وقف کیا اور صبر وتوکل سے کام لیا۔"

عالم عرب اور اشتراکیت

"جب میں عالم عرب کے موجودہ حالات کو دیکھتا ہوں، تو بڑی مایوسی ہوتی ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے ان الفاظ کے شایانِ شان وہ کس طرح ہو سکتے ہیں: "آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اس نقطہ پر

پہنچ گئی ہے، جس پر چھٹی صدی مسیحی میں تھی، یہ عالم پھر اسی دورا ہے پر کھڑا ہے جس پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت تھا، آج ضرورت ہے کہ عرب قوم میدان میں نکل آئے۔'' کیا اس وقت عالم اسلام عالم عرب سے قیادت کی امیدیں وابستہ کرسکتا ہے، جبکہ اس پر اشتراکیت کا بھوت سوار ہے؟ اور کیا بات ہے کہ سینکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اشتراکیت کا طلسم وہاں ٹوٹ نہیں سکا؟''

''عالم عرب میں اشتراکیت کا طلسم ٹوٹنے کے اسباب جمع ہو گئے ہیں، اگر چہ ابھی یہ طلسم ٹوٹا نہیں ہے۔ اشتراکیت نے جو خواب دکھائے تھے، اس کے تار و پود بکھر رہے ہیں، لیکن اس کی تاخیر کے کچھ اسباب ہیں۔ اول تو امریکہ کی جامد و کہنہ، بے دماغ اور اندھی سیاست عربوں میں بے چینی اور انتشار کی موجب رہی ہے۔ وہ عربوں کے مسائل کو قطعاً نہیں سمجھتا اور ہر جگہ انقلابات کرانا اور سازشوں کی بنیاد ڈالنا اس کا شیوہ ہے، اس کی وجہ سے عرب نوجوانوں کے اندر ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ عرب ممالک میں شاہی نظام کی خرابیاں اور برائیاں بھی اس کی موجب ہوتی ہیں، چنانچہ مسلسل انقلابات کی وجہ سے اب شام اور عراق جیسے ممالک میں دھول اڑ رہی ہے، وہاں کا سارا سرمایہ غیر ملکوں میں منتقل ہو چکا ہے، معاشی بدحالی اپنے شباب پر ہے، پہلے جو حیثیت جاگیر دار طبقے کی تھی، اب وہ فوجی افسروں نے لے لی ہے، عوام غریب کے غریب ہیں، چنانچہ سوشلزم اور اشتراکیت کے فریب کے پردے بھی چاک ہو رہے ہیں۔''

لیبیا کا انقلاب

''لیبیا کے حالیہ انقلاب کی اصل صورتِ حال سمجھ میں نہیں آرہی ہے، جبکہ وہاں شاہ بڑے رحمدل اور انصاف پسند آدمی تھے؟''

''بے شک شاہ اپنی ذات سے بڑے درویش صفت تھے، وہ شاہی چھوڑ چکے تھے، مگر ان کی دینداری ذاتی تھی، ان کے گردوپیش کے لوگ ان سے مطابقت نہیں رکھتے تھے، کبرسنی نے ان میں یہ کمزوری پیدا کردی تھی کہ جن چیزوں کو وہ قابل اصلاح سمجھتے تھے، وہ بھی نہیں کر سکتے تھے، گویا وہ موجودہ دور کے ناصر الدین محمود تھے، خوش حالی وہاں بھی ایک طبقہ تک محدود تھی، عوام میں غربت بہت تھی۔ ان حالات کی روشنی میں اس انقلاب کے اسباب کو سمجھا جا سکتا ہے۔''

عرب ممالک کے انقلابات

''آخر یہ کس طرح کے انقلابات ہیں، جو عرب ممالک میں اس آسانی سے اتنی جلد جلد برپا

ہوتے رہتے ہیں؟"

"درحقیقت آئے دن کے فوجی انقلابات کے بعد اب فوج کے منہ کو خون لگ گیا ہے، وہاں ہر افسر یہ سمجھتا ہے کہ بڑی آسانی سے ایک گھنٹہ کے اندر صدر مملکت بنا جا سکتا ہے، چنانچہ لیبیا میں دس بجے دن میں انقلاب ہوا، اور ہینڈ فون لے کر کچھ لوگ اعلان کرنے نکل آئے کہ انقلاب ہو گیا ہے، اس انقلاب کے لانے والوں میں کوئی بھی تیس سال سے زائد عمر کا نہیں، خود صدر مملکت کی عمر ۲۷ سال کے قریب ہے،(۱) خود شام میں ذرا ذرا سے فوجی لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیے گئے، اور تجربہ کار فوجی جنرلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ وہاں کے منسٹروں کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوا کل بی.اے. میں پڑھ رہے تھے، آج ایک دم سے منسٹر بنا دیے گئے۔"

اسلام کا مستقبل یقیناً درخشاں ہے

نصف النہار کا سورج اب ہمیں غضب آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، آم کے درختوں نے اپنا سایہ بھی سمیٹ لیا تھا، تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے بعد مولانا بھی تھک چکے تھے، اور ان سے زیادہ اس خاکسار کے قلم اور نوٹ بک کی حالت خستہ تھی، مگر مولانا کے استقلال کی داد دیجیے کہ اب بھی پیشانی پر شکن نہیں تھی، میں نے ان کی ہمت کو آفریں کہتے ہوئے آخری سوال رکھ دیا:

"مولانا! موجودہ دور کی جملہ فتنہ پردازیوں اور ملت اسلامیہ کی خستہ حالیوں کے باوجود کیا آپ کو اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے؟"

"بے شک! اسلام کا مستقبل یقیناً درخشاں ہے، صورت یہ ہے کہ اس کے علاوہ دنیا کے لیے کوئی اور راہ نجات بھی نہیں، یہ بالکل ایک ریاضی کا سا مسئلہ بن گیا ہے، اب اس زبوں حال اور پراگندہ خاطر بنی نوع انسان کے سامنے اسلام کے علاوہ کوئی اور Choice نہیں، دقت ساری یہ ہے کہ ہم مسلمان نہیں رہے، اسلام اور مسلمانوں میں اس قدر تنافر پیدا ہو گیا ہے کہ بقولِ اقبال:
'کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم'۔"

بے نیازی سے بہتے ہوئے دریائے سئی، دھوپ میں چمکتی ہوئی شاہ علم اللہؒ کے مقدس ہاتھوں سے بنائی ہوئی تین سو سالہ قدیم مسجد، اور سید احمد شہیدؒ اور ان کے مجاہدین کی یاد دلانے والے درو دیوار کو ہم نے بچشم نم الوداع کہا، اور واپسی میں اس عارفِ مشرق کی ایک مشہور کتاب کے یہ

---

(۱) لیبیا کے بادشاہ محمد ادریس سنوسی کا تختہ پلٹنے والے معمر القذافی کو بھی ۲۰/ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

الفاظ حرکتِ عمل کا پیغام بن کر میرے کانوں میں گونجنے لگے:

''حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخداترس انسانوں کے ہاتھوں سے نکل کر ان خدا شناس اور خداترس انسانوں کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے، جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں، اور اُنھیں کی ہدایات وتعلیمات سے روشنی ورہنمائی حاصل کرتے ہیں۔''

میری علمی و مطالعاتی زندگی

ماہنامہ ''سیارہ'' (لاہور) نے مختلف اربابِ علم وادب سے ان کے ذوقِ مطالعہ، تصنیف وتالیف اور ذہنی نشو وارتقاء کے حوالے سے ایک مفصل سوال نامے کے جواب حاصل کیے تھے۔ سوالنامہ اور حضرت مولاناؒ کا جواب ماہنامہ مذکور کی اشاعت (بابت ستمبر ۱۹۶۵ء) میں اور بعد میں اس کا صرف جواب ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ رجون ۱۹۸۳ء) میں شائع ہوا۔ یہ سوالنامہ اور جواب ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - حیات وافکار کے چند پہلو'' [ترتیب وتدوین: سفیر اختر، شائع کردہ: ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء] میں شامل ہے، نیز ''میری علمی ومطالعاتی زندگی'' [شائع کردہ: سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی] میں بھی شامل ہے۔ یہ سوال وجواب ذیل میں نقل کیے جارہے ہیں۔

سوالنامہ:

۱- آپ کے اندر ذوقِ مطالعہ کب نمایاں طور پر متحرک ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کا نشو ونما کس طرح ہوا؟ کیسا ذہنی ماحول اس میں آپ کے لیے مدد ہوا؟ نظامِ تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟ کون سی شخصیتیں تھیں جنھوں نے آپ کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کیا اور اس سفر میں رہنمائی دی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف دور؟ ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟

۲- آپ کے پسندیدہ موضوعاتِ مطالعہ کیا رہے؟

۳- آپ اُردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں (انگریزی؟ عربی؟ فارسی؟ بنگلہ؟ ہندی؟ پنجابی؟ سندھی؟ پشتو؟ بلوچی، دیگر زبانیں؟)۔

۴- اردو اور انگریزی کو تقابلاً سامنے رکھ کر فرمایئے کہ دونوں میں کس زبان میں آپ کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے؟

۵- آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کی پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ شعراء؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس اور طنز نگار؟

۶- آپ اپنی دُنیائے مطالعہ میں کس ایک مصنف کو بلند ترین مقام پر رکھتے ہیں، جس کا آپ کی ذہنی نشو ونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصاً اردو لکھنے والوں میں سے)۔

۷- آپ کی نگاہ میں وہ بہترین کتاب یا تحریر جس نے آپ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہو؟ (خصوصاً اردو زبان میں)۔

۸- ایسے دو چار مقالات، نظموں یا افسانوں کا ذکر جن سے آپ کی فکری یا عملی زندگی متاثر ہوئی ہو؟

۹- اردو رسائل کے اب تک جتنے خاص نمبر آپ کی نظر سے گزرے ہیں، آپ کو ان میں سے بہت زیادہ پسند کون سے رہے؟ خصوصاً اگر کسی ایک کو بہترین قرار دے سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

۱۰- یہ بھی فرمایئے کہ مطالعہ میں آپ کی پسند کے بالمقابل آپ کی ''ناپسند'' کیا ہے؟ کن چیزوں کے مطالعہ سے آپ کی طبیعت اِباء کرتی ہے؟ آپ کوئی ایسی نگارش بتائیں جس سے آپ کو نفرت محسوس ہوئی ہو؟

۱۱- بالعموم آپ کے مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے؟ مطالعہ کی نشست کس طرح کی آپ کو پسند ہے؟ رفتارِ مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

۱۲-تنہائی اور خاموشی آپ کے مطالعہ کے لیے ضرورت ہے، یا آپ ہجوم اور شور وشغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

۱۳-سفر میں آپ کا مطالعہ کا تجربہ کیا ہے؟

۱۴-کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشانات لگاتے ہیں؟ کیا آپ الگ نوٹ یا خلاصہ لکھتے ہیں؟

۱۵-آپ کا حافظہ آپ کی وسعتِ مطالعہ کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے؟ کیا آپ کو پڑھی ہوئی کتابوں اور مضامین کے مطالب اور ان کے مصنّفین کے نام پوری طرح یاد رہتے ہیں؟

۱۶-آپ اپنے مطالعہ، حاصلِ مطالعہ اور ذوقِ مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں، خصوصاً بچوں کو (اگر وہ ہوں) بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچّوں کی تربیتِ ذوق کے لیے آپ کے تجربات کیا ہیں؟

۱۷-کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدودِ اربعہ کیا ہے؟ اس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ خاص خاص کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمایئے۔ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی ہوئی کتابیں؟

۱۸-کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں، اور اس معاملے میں نظریہ ومسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

۱۹-آپ ایک اوسط درجہ کے عام تعلیم یافتہ آدمی کو مشورہ دیں کہ وہ موجودہ مصروف زندگی میں مطالعہ کا پروگرام کیسے بنائے اور کتابیں کیسے فراہم کرے؟

۲۰-خاص طور پر ادبی مطالعہ کی ضرورت واہمیت کیا ہے؟ عام آدمی کے لیے؟ طلبہ کے لیے؟

۲۱-ادبی مطالعہ کے لیے نوجوانوں کو آپ کیا رہنمائی دیتے ہیں کہ وہ کن مصنّفین اور کتابوں کو لازماً پڑھیں؟ نیز آپ اردو کے ایسے موجودہ رسائل کی نشاندہی کریں جن کا مطالعہ صحت مند فکر کی نشوونما میں مدد ہو۔

۲۲- کیا آپ کسی بہتر اور مؤثر اسلوب سے لوگوں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ صرف تفریحی مطالعہ کافی نہیں، اس کے ساتھ علمی، ادبی اور معلوماتی چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے، اور پروگرام میں توازن ہونا چاہیے؟

۲۳- ڈائجسٹوں کا جو دور ہمارے یہاں شروع ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس طرز کے رسائل انگریزی رسائل کی جگہ لے کر اردو کے حق میں مفید پارٹ ادا کر رہے ہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ادبی مطالعہ کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔

۲۴- آپ کے سامنے ایک مسلمان معاشرہ ہے اور یہ واضح ہے کہ نوجوانوں کی بڑی بنیادی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے انقلاب آفریں نظریۂ حیات، اس کے ضابطہ و نظام، اس کے تہذیب و تمدن اور اس کی شاندار تاریخ کو جانیں، اس سلسلے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ کن مصنفین اور کن کتابوں کی طرف رہنمائی دیتے ہیں؟

۲۵- کچھ لوگوں کی رائے میں قرآن ناظرہ پڑھنے کے بجائے سمجھ کر پڑھنا چاہیے، طوطے کی طرح رٹنے کا کیا فائدہ؟ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

جوابات:

اس وقت اس حال میں یہاں نہیں ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور ڈال سکوں یا کوئی مضمون پوری توجہ سے لکھوا سکوں، زیادہ وقت بستر پر پڑے ہوئے گزرتا ہے (۱)۔ اس وقت اتفاقاً آپ کے سوال نامے کا کاغذ نکل آیا اور ایک عزیز (۲) نے پڑھ کر سنایا۔ سوالات بڑی ذہانت سے مرتب کیے گئے ہیں اور طبیعت کو اُکساتے ہیں۔ دل میں ان کے جواب دینے کی تحریک پیدا ہوئی۔ طبیب کے مشورے کو جو پاسبانِ عقل ہے، ذرا ہٹا کر دل کو تنہا چھوڑ دینے پر عمل کرنے کو جی چاہا، آپ نے انتخاب کی آزادی دے دی ہے، اس لیے ہلکے پھلکے سوالات کا جواب دے دیتا ہوں، وہ بھی مختصر۔

مطالعہ و کتاب بینی کا شوق

نمبر ۱- قدیم شرفاء اور علماء کے دستور کے مطابق اور بعض خاص اسباب کی بناء پر اس سے کچھ زیادہ ہمارے گھر میں ایک وسیع موروثی کتب خانہ تھا، دادا صاحب اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہما (حکیم سید فخر الدین ؒ مصنف 'مہر جہاں تاب' اور سید عبدالحی ؒ مصنف 'گل رعنا' 'نزھۃ الخواطر') دونوں بڑے مصنف تھے، یہ کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، جن میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کی کتابیں تھیں، میرے بڑے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب مرحوم) بڑے اچھے مربی و ماہرِ نفسیات تھے، اُنھوں نے کتابوں سے مانوس کرنے کے لیے اور اس موروثی دولت کی قدر کرنے کے لیے کتابوں کو دھوپ دکھانے اور ان کی حفاظت و پرداخت کے کام میں پہلے شریک کیا، پھر اس کی ذمے داری ڈالی، پرانی کہاوت 'کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے' کے مطابق پہلے کتاب و مصنف کا نام پڑھنے، پھر اس کو کہیں کہیں سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس سے کتاب بینی کا - جو بہت

(۱) مولانا اس وقت آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں سیتاپور کے آنکھ کے اسپتال میں داخل تھے۔
(۲) مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری، عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

حدتک موروثی اور فطری تھی- چسکا پڑ گیا، اور یہ شوق لت اور بیماری کی حدتک پہنچ گیا۔

پسندیدہ موضوعات

نمبر۲- میرے لیے سب سے زیادہ ذوقی اور تفریحی موضوع جس میں کبھی طبیعت پر بار نہیں پڑتا اور جس سے سیری نہیں ہوتی، تذکرے، تراجم اور سوانح حیات کا موضوع ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دادا صاحب اور والد صاحب بڑے مؤرّخ اور سوانح نگار تھے، اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ اسی مشغلے میں صرف ہوا۔ اس کے بعد دوسرے درجہ میں ادبیات، خاص طور پر وہ ادبی کتابیں جن میں تکلف، آورد اور صنائع و بدائع نہ ہوں، لیکن نظم سے زیادہ نثر کی کتابیں پڑھنے کا ذوق ہے، اور وہ عربی اردو دونوں میں یکساں ہے۔

نمبر۳- سب سے زیادہ عربی میں، دوسرے نمبر پر اردو، اور بضرورت انگریزی میں مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب سے نظر کمزور ہوئی، انگریزی کا مطالعہ برائے نام رہ گیا۔

پسندیدہ مصنفین ومضامین

نمبر۴-۵- پسندیدہ مصنّفین، پسندیدہ تصانیف اور مضامین کے متعلق میرے مضمون ''میری محسن کتابیں''[1] میں خاصا مواد آ گیا ہے۔ مزاحیہ لکھنے والوں میں مجھے پرانے لکھنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سب سے زیادہ پسند ہیں، پطرس کے بعض مضامین، اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے وہ مضامین جن میں زیادہ علمیت اور تفلسف نہیں ہے، پسند آتے ہیں، نیز ان کے مضامین کے مجموعوں میں سے ''گنج ہائے گراں مایہ'' بہت کامیاب اور دل آویز ہے۔

طنز نگاری میں مولانا عبدالماجد دریابادی خاص مرتبہ رکھتے ہیں، خاص طور پر جہاں زیادہ تلخی اور تیزی نہیں ہوتی، یہ احتیاط مولانا آزاد کے یہاں زیادہ ہے، اور ان کے ادب کے وہ حصے اگرچہ کم ہیں، لیکن ہیں بہت لطیف اور سبک۔

اردو انشاء ونثر نگاری میں والد ماجد اور علامہ شبلی کا اثر پڑا

نمبر۶- یہ کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ ابتداء میں ندوۃ العلماء کی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی تصنیفات اور تحریریں زیادہ پڑھیں، اس لیے ان کا اثر زیادہ ہے۔ اردو انشاء اور نثر نگاری میں شاید

---

(۱) یہ مضمون علاحدہ رسالہ کی شکل میں سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی نے بعنوان: 'میری علمی ومطالعاتی زندگی' شائع کیا ہے۔

سب سے زیادہ اور اوّلین اثر خود اپنے والد صاحب کا پڑا، خصوصاً ان کی کتاب ''یادِ ایام'' اور ''گل رعنا'' کا، دوسرے نمبر پر مولانا شبلی کا۔

نمبر ۷-۸ کے جوابات بھی میرے مذکورہ بالا مضمون سے مل سکتے ہیں۔

رسائل و جرائد کے خصوصی شمارے جو زیادہ پسند آئے

نمبر ۹۔ اردو رسائل کے خاص نمبر نہ تو بہت زیادہ دیکھے، اور نہ اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے ''الفرقان'' کا ''مجدد نمبر'' اور ''شاہ ولی اللہ نمبر'' زیادہ دلچسپی سے پڑھے۔ ['چراغ راہ' کے نظریۂ پاکستان نمبر سے بھی فائدہ اٹھایا۔][1]

وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ ہے

نمبر ۱۰۔ وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ ہے، اور شدید ضرورت کے بغیر ان کے چند صفحات کا پڑھنا بھی میرے لیے دشوار ہے، وہ تین طرح کی چیزیں ہیں: ایک مناظرہ اور تردید کی کتابیں، دوسرے خشک فلسفیانہ مباحث یا وحدۃ الوجود وغیرہ اور فلسفۂ اخلاق کی متصوفانہ کتابیں، تیسرے قادیانی لٹریچر جو حسنِ انشاء، حلاوتِ تحریر اور عمقِ فکر سے یکسر خالی ہے۔

تصنیف و تالیف اور مطالعہ کا وقت

نمبر ۱۱۔ چونکہ میری تحریر و تصنیف کا وقت صبح کو نمازِ فجر اور چائے کے بعد سے لے کر، موسم گرما میں اس وقت تک کہ گرمی شدید نہ ہو، اور موسمِ سرما میں ظہر کے قریب تک محدود ہے، اس کے علاوہ سالہا سال سے کسی دوسرے وقت میں تصنیفی کام نہیں کیا کرتا، اس لیے پڑھنے کا وقت ظہر سے عصر تک، اور سفروں میں تقریباً دن بھر (کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ)۔ رات کا پڑھنا نظر کی کمزوری کی وجہ سے تقریباً بیس پچیس سال سے بالکل بند ہے، سوائے اس زمانہ کے جس میں دارالعلوم کے اندر حدیث کا کوئی درس اپنے ذمے لے لیتا تھا، اس کے لیے بہت مطالعہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ لکھنے کا کام نہیں ہوتا یا لکھنے کے لیے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، تو فجر اور ظہر کے درمیان کا وقت بھی مطالعہ ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔

میز کرسی یا ڈسک پر لکھنے کی عادت کبھی نہیں رہی

میں میز کرسی یا ڈسک پر لکھنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔ عام طور پر اس طرح لکھتا ہوں جس طرح

(۱) اضافہ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ رجون ۱۹۸۳ء)

آپ نے کاپی نویسوں کو لکھتے دیکھا ہوگا۔

رفتارِ مطالعہ

رفتارِ مطالعہ عام طور پر سست ہے، طبیعت رواداری کے ساتھ پڑھنے پر قانع نہیں ہوتی، لیکن اس کا زیادہ تر انحصار موضوع اور مضمون کی نوعیت پر ہے۔ ادبی اور تاریخی چیزیں تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں، اور علمی مباحث آہستہ رفتاری اور دِقّتِ نظر کے ساتھ۔

شوروشغب اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں فرق نہیں پڑتا

نمبر ۱۲- عام طور پر شوروشغب اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں اور بعض اوقات لکھنے میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا، اور شاید بعض لوگوں کے لیے یہ بات موجبِ تعجب ہو کہ بعض اوقات اس سے مدد ملتی ہے۔ میں نے اپنے بعض اہم مضامین اور کتابیں تھرڈ کلاس کے مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں لکھی ہیں۔ جب طبیعت میں روانی پیدا ہو جاتی ہے، اور اپنے اندر لکھنے کا تقاضا اور مضامین و خیالات کی چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، تو شور و ہنگامہ اس میں مخل نہیں ہوتا، لیکن جب ایسی کیفیت نہ ہو اور طبیعت بند و کند معلوم ہوتی ہو، تو تنہائی اور خاموشی کی تلاش ہوتی ہے۔

سفر میں مطالعہ

نمبر ۱۳- جب سے زمانۂ قیام اور حضر کی مشغولیتیں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا زیادہ تر موقع سفر ہی میں ملتا ہے، جو بکثرت پیش آتے ہیں، اور اس لحاظ سے سفر بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں، صدہا صفحات کی کتابیں اکثر سفر ہی میں ختم ہوتی ہیں۔

کتابوں پر نشان لگانے کی عادت

نمبر ۱۴- کتابوں پر نشان لگانے کی عادت بہت پرانی ہے، اور یہ اپنے استاد اور بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب ایم.اے. (سابق استاد اورینٹل کالج - لاہور) سے سیکھی ہے، لیکن نشان بڑی احتیاط سے سرخ پنسل سے لگاتا ہوں، اگر گاڑی کی رفتار کافی تیز ہوتی ہے تو اس کے ٹھہرنے کا انتظار کرتا ہوں، تاکہ نشان کتاب میں بدنمائی نہ پیدا کرے۔ حاشیے پر اپنی رائے بہت خوش خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں، بعض اوقات ناواقف کو ایسے حواشی چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان

نشانوں اور حواشی سے کتاب کے دوبارہ پڑھنے میں مدد ملتی ہے، اور اس کے بہترین حصے تصویر کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔

حافظہ کا بہت کچھ تعلق ذوق و پسندیدگی سے بھی ہے

نمبر ۱۵- میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے، لیکن اپنے ذوقی مضامین میں حافظہ زیادہ رفاقت اور وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ غیر ذوقی مضامین میں اس سے بہت کم۔ میرے خیال میں حافظہ کا بہت کچھ تعلق ذوق و پسندیدگی سے بھی ہے۔

پسندیدہ چیزوں میں ہم نشینوں اور عزیزوں کو شریک کرنا

نمبر ۱۶- اپنی پسندیدہ چیزوں میں ہم نشینوں اور عزیزوں کو شریک کرنا ایک فطری امر ہے، اور شاید یہ بات میرے اندر بہت سے لوگوں سے بڑھی ہوئی ہوگی۔ مجھے اپنے بزرگوں کی اس عادت سے خود بھی فائدہ پہنچا، اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے عزیزوں اور اہل مجلس کے لیے بھی یہ بات اسی قدر مفید ہوگی۔

ذاتی کتب خانہ

نمبر ۱۷- ہم دونوں بھائیوں کو ایک بڑا وسیع اور متنوع کتب خانہ وراثت میں ملا، جو کئی پشتوں اور ایک علمی خاندان کا اندوختہ اور ترکہ ہے، لیکن اس کی موجودگی میں بھی مجھے اپنے ذوق و ضرورت کی کتابیں خریدنے کا شوق بچپن سے ہے، اور اس سلسلے کے بچپن کے واقعات کسی حد تک مضحک اور کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ اس شوق کا آغاز اس عمر سے ہوگیا تھا، جس عمر میں عام طور پر بچوں کو کھلونوں اور مٹھائیوں کے خریدنے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ ذوق اور ثقاہت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس شوق میں بھی اصلاح و ترقی ہوتی گئی، چنانچہ خود اپنی خریدی ہوئی اور مصر و شام سے منگوائی ہوئی کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، جو اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے، مگر منتخب ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کی حیثیت کسی موضوع پر چھوٹے سے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی ہے، اور جو اپنے موضوع پر خود ایک چھوٹے سے کتب خانے کا کام دیتی ہے۔ چونکہ شروع سے عربی ادب و انشاء کا ذوق ہے، اس لیے ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کی کوئی علمی و فکری اہمیت نہیں ہے، مگر ان کے پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی اور لکھنے میں روانی پیدا

ہوتی ہے، مثلاً ''اغانی'' کا خلاصہ اور ادباء کے مضامین کے مجموعے۔ اس منتخب ذخیرے میں 'دیوانِ غالب'، 'مثنوی' کی کلید 'مرآۃ المثنوی'، کلامِ اقبال اور 'گلستان' 'بوستان' بھی ہے۔

بعض دفعہ مصر و شام کی کسی نئی چھپی ہوئی کتاب کے حصول کے لیے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے، وہ بھیج دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کتاب جس کی قیمت آٹھ دس روپے سے زیادہ نہیں، کسی تصنیف کے سلسلے میں ہوائی ڈاک سے منگوائی، اور وہ پچاس ساٹھ روپے میں پڑی۔

اسلامی الفکر عرب مصنفین اکثر اپنی تصنیفات از راہِ کرم ہدیۃً بھیجتے ہیں۔ اکثر سفروں میں علمی ہدایا مصنفین کے دستخطوں سے مزین ہوکر ملے ہیں، جو اس ذاتی کتب خانے کی زینت ہیں۔

کتابیں مستعار دینے کے سلسلے میں بڑے تلخ تجربات ہوئے

نمبر ۱۸- کتابیں مستعار دینے کے سلسلے میں بڑے تلخ تجربات ہوئے۔ اس سلسلے میں اچھے اچھے اہلِ علم کی بے احتیاطی مشہور و معلوم ہے۔ بعض مرتبہ مستعار لینے والے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، اور مستعار دینے والا بھول جاتا ہے کہ کتاب کس کو دی تھی، میرے ساتھ یہ المیہ پیش آیا ہے۔ اس سے کمتر المیہ یہ ہے کہ مستعار لینے والے کتاب بے احتیاطی کے ساتھ پڑھتے ہیں، کتاب پر دھبے اور نشانات پڑ جاتے ہیں، اور بعض ستم ظریف اس پر حواشی اور تأثرات ثبت کر دیتے ہیں، اور کتاب جی سے اتر جاتی ہے۔ مجھے دو مرتبہ ایک کتاب سے اس لیے دست بردار ہو جانا پڑا کہ اس پر دھبے پڑ گئے تھے یا حواشی نے اس کی رونق و رعنائی ختم کر دی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں شروع سے کتاب کے بارے میں کچھ زیادہ نفاست پسند اور ذکی الحس واقع ہوا ہوں۔ کتاب پر پسینے کا ایک دھبہ یا کسی پڑھنے والے کی حاشیہ آرائی مجھے کتاب کے مطالعہ سے محروم کر دیتی ہے، اور بعض اوقات مستعار لینے والے ہی کو نذر کر دیتا ہوں کہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔

ابتدا میں ادبی مطالعہ کی اہمیت

نمبر ۲۰- میرے نزدیک ابتداء میں ادبی مطالعہ کی اہمیت بہت ہے۔ خوش قسمتی سے جن لوگوں کو ابتداء میں اچھی ادبی کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا ہے، اور ان کا ادبی ذوق کسی حد تک بن جاتا ہے، یا ان کے اندر ادبیت کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں، وہ خواہ فلسفہ کا موضوع اختیار کریں، یا دینیات کا میدان، ان کی تحریر میں شگفتگی اور شیرینی باقی رہتی ہے، اور وہ زیادہ

کامیاب مصنف ثابت ہوتے ہیں۔میرے نزدیک ہر مرحلے میں کسی نہ کسی قدر ادبی مطالعے کا عنصر شامل رہنا چاہیے۔

وہ ادباء و مصنفین جن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے

نمبر۲۱- ادبی مطالعہ اور تحریروں کی مشق کے لیے اس وقت نوجوانوں کو مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، چودھری غلام رسول مہر، مولانا شاہ معین الدین ندوی کی کتابوں اور تحریروں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔اس سے زیادہ ادبی ذوق اور زبان سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو تو پھر کچھ تحدید نہیں، مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور خالص ادیبوں کو بھی پڑھنا ہوگا۔ یہ نام تحریر کی پختگی، شگفتگی اور زبان کی صحت کے لحاظ سے پیش کیے گئے ہیں، کسی مخصوص خیالات و افکار سے یہاں بحث نہیں۔

محض تفریحی ادب کے مطالعہ کے نقصانات

نمبر۲۲- محض تفریحی ادب کے مطالعہ سے ذہن میں سطحیت، علم اور فکر میں بے مغزی اور معلومات میں تہی مائیگی پیدا ہوتی ہے، اور ایسا آدمی کوئی وقیع اور مؤثر کام نہیں کرسکتا۔تفریحی ادب کا وہی حصہ ہونا چاہیے جو نمکیات و فواکہ کا ہوتا ہے، اور بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور فکر انگیز مباحث کا مطالعہ بھی ذہن میں تحریک پیدا کرتا ہے، اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی شامل رہنا چاہیے۔

اردو ڈائجسٹوں کا سلسلہ

نمبر۲۳- اردو ڈائجسٹوں کا سلسلہ مفید اور ہمت افزائی کا مستحق ہے، لیکن ان میں مزید محنت اور حسنِ انتخاب کی ضرورت ہے۔اردو کی اشاعت و ترقی کے لیے یہ سلسلہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ان میں اگر ادبی عنصر کا اضافہ اور ادبی شخصیات اور کلاسیکل ادب کے تعارف کا سلسلہ بھی شروع کردیا جائے، اور وہ شوق انگیز اور مطالعہ کے لیے مہمیز ہو تو اس سے یہ خطرہ بھی باقی نہیں رہے گا کہ لوگ قدیم مستند ادب سے بے تعلق ہو جائیں گے۔

نمبر۲۴- اس سلسلے میں دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین، اسلامک پبلیکیشنز، اقبال اکیڈمی، شاہ

ولی اللہ اکیڈمی، مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام جیسے اداروں کی مطبوعات کا مطالعہ مفید ہوگا۔اس سلسلے میں تواضع اور انکسار کو برطرف رکھ کر 'تاریخِ دعوت وعزیمت' کے سلسلے کے مطالعہ کا مشورہ بھی دوں گا۔

ابتدا میں ناظرہ قرآن شریف پڑھنا بہت ضروری ہے

نمبر ۲۵- میرے نزدیک ابتدا میں ناظرہ قرآن شریف پڑھنا بہت ضروری ہے۔یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرینِ تعلیم کی رائے کے مطابق تھوڑی سی اردو پڑھا کر قرآن شریف کا پڑھانا زیادہ بہتر ہوگا، یا عام دستور کے مطابق قرآن شریف ہی سے ابتدا کرانا زیادہ بہتر ہے۔ بہر حال مجھے اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ سمجھ کر قرآن شریف پڑھنے کی استعداد پیدا ہونے کے انتظار میں ناظرہ پڑھانے کو بالکل موقوف رکھا جائے۔ناظرہ قرآن شریف پڑھنا اور محض تلاوت خود ایک بڑی عبادت اور ایک امرِ مقصود ہے، سمجھ کر پڑھنا یہ ایک الگ کام اور ضرورت ہے۔ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہے۔

نصاب تعلیم سے متعلق چند اہم باتیں

مولانا فضل محمد (م۱۹۸۱ء) مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی- ضلع بہاول نگر دینی تعلیم کے مروجہ نصاب میں ترمیم کرتے ہوئے اپنے مدرسے کے لیے ایک نیا نصاب مرتب کرنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں انھوں نے تقسیم ہند سے کچھ پہلے مشاہیر وقت کو ایک سوالنامہ ارسال کر کے ان کی رائے طلب کی تھی، حضرت مولاناؒ نے مختصراً اپنی رائے کا اظہار خط کی صورت میں کیا، ذیل میں مرسلہ سوال نامہ اور اس کا جواب ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی- حیات و افکار کے چند پہلو'' (ترتیب و تدوین: سفیر اختر، شائع کردہ: ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۲۶۱-۲۶۶) سے نقل کیے جا رہے ہیں۔

سوال نامہ

۱:-''علوم مقصودہ''-تفسیر، حدیث، فقہ- میں کون کون سی کتابیں رکھی جائیں، جن سے کم از کم وقت میں اچھا اور زیادہ کام لیا جاسکے؟

۲:-ترجمۂ قرآن شریف کے بعد تفسیر میں ''جلالین'' کے علاوہ کوئی دوسری معتدل تفسیر بھی تجویز کی جائے، ''تفسیر مظہری'' یا ''تفسیر جوہری طنطاوی'' کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

''دورۂ حدیث'' سے پہلے حدیث میں ''مشکوۃ شریف'' کے علاوہ ایسی اور کیا کتاب رکھی جائے جو حذف مکررات کے بعد صحاح ستہ کو حاوی ہو؟ ''جمع الفوائد'' اور ''تیسیر الوصول'' کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فقہ کی مجوزہ کتب میں فتویٰ نویسی کی رعایت سے بھی کوئی کتاب ضرور رکھی جائے۔

۳:-اصول تفسیر، اصول حدیث میں ''الفوز الکبیر''، ''نخبۃ الفکر'' کے علاوہ اور کیا کتاب رکھی جائے؟ ''خیر الاصول'' اور مولانا عبدالحق دہلویؒ کے رسالہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟

۴:-''علوم آلیہ''-ادب، کلام، معانی، مناظرہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، میراث، صرف، نحو- میں کیا کیا کتابیں رکھی جائیں جو بقدر ضرورت استعداد کو حاوی ہوں، نیز وقت بھی بحیثیت انفرادی ''علوم مقصودہ'' سے زائد صرف نہ ہو، طریق مطالعہ وتعلیم کی وضاحت کی جائے، درستگی اخلاق و اصلاح باطنی وظاہری کا لحاظ بھی ضرور رکھا جائے۔

۵:-فلسفۂ جدیدہ، منطق جدید، سائنس، جدید علم کلام، تاریخ، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، علم النفسیات وغیرہ علوم عصریہ بھی آپ کے نزدیک قابل اضافہ ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کون کون سے؟ اور کس حد تک؟ کتابیں کیا کیا رکھی جائیں؟ طریق تعلیم ومطالعہ کیا ہو؟ حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہ اکابر کی کتابوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مناظرہ کے بارے میں

موجودہ ضروریات مثلاً مرزائیت، خاکساریت، بدعات و رسومات کی تردید و معلومات کے لیے مناسب کتب کی تجویز کی ضرورت ہے؟

۶:-فرضی مناظروں اور تقریروں کے بجائے اگر طلبہ کو عملی طور پر تبلیغ میں شرکت کا موقع دیا جائے، جس سے قوم کے صحیح امراض، احساسات و رجحانات کے اندازہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، اور دکھتی ہوئی رگوں پر صحیح نشتر زنی کی مشق بھی تدریجاً بہم پہنچتی رہے گی، گویا طلبہ کے لیے یہ عملی قسم کی ٹریننگ ہوگی، اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۷:-ابتدائی تعلیم کے لیے بھی نمبروار ہدایات کی ضرورت ہے:

☆ داخلہ کے لیے معیار عمر اوسطاً کیا رکھا جائے اور مدت تعلیم کل کتنی ہو؟

☆ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی معیار قرار دیا جائے یا بلا تخصیص سب کو ایک طرف سے داخل کرلیا جائے۔

☆ دینیات کی تعلیم کا قدیم مروجہ طریقہ زیادہ مفید ہے کہ مثلاً اول قرآن مجید کی تعلیم مکمل کر لی جائے، بعد ازاں اردو، فارسی وغیرہ شروع کرائی جائے، یا جدید مخلوط طریقۂ تعلیم زیادہ بہتر ہے، مثلاً دینیات، اردو، فارسی، قرآن شریف، سب کے الگ الگ گھنٹے مقرر کردیے جائیں، سب مضامین ایک ہی معلم سے متعلق ہوں یا مختلف اساتذہ کے پاس ہونے چاہئیں؟ پہلی قدیم صورت میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے، اور ثانی جدید صورت میں متعلقہ مضامین ناقص اور نامکمل رہ جاتے ہیں، آپ کے نزدیک اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟

☆ قرآن شریف ناظرہ، حفظ، اردو، حساب، جغرافیہ وغیرہ مضامین کی مدت تعلیم کیا رکھی جائے؟

☆ اور ان کا نصاب کیا مقرر کیا جائے؟

☆ معلم کے اوصاف ضروریہ کی تشریح فرمائی جائے۔

☆ جسمانی تربیت کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا جائے؟ اور ورزش کے لیے کون سے کھیل رکھے جائیں؟

مکرم ومحترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ شرف صدور لایا، آپ کے مدرسہ اور آپ کی مساعی سے اجمالاً واقفیت تھی۔ جن مقاصد وخصوصیات کے ساتھ آپ مدرسہ کو چلانا چاہتے ہیں، وہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، مگر افسوس ہے کہ حضرات علماء ہی اس سے سب سے زیادہ بے اعتنائی برت رہے ہیں، جس کی وجہ سے مجھے شدید خطرہ ہے کہ مستقبل میں ہندوستان میں دینی تعلیم باقی بھی رہ سکے گی یا نہیں۔

میں نے رسالہ ''الفرقان'' اور ''الندوہ'' مرحوم میں ''اسلام کے قلعے'' کے عنوان کے ماتحت اپنے خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار کیا ہے، اگر کہیں سے آپ کو یہ پرچے مل سکیں تو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ (۱)

آپ نے جو سوالات قائم کیے ہیں، ان کے جواب کچھ تفصیل اور وقت چاہتے ہیں، اگر اس کا انتظار کیا جائے تو معلوم نہیں کب اس کی نوبت آئے، اس لیے مختصراً عرض کر دیتا ہوں، نیز بلا تکلف ہر سوال کے جواب کی بھی اہلیت نہیں رکھتا، جو میرا موضوع نہیں اور اس سلسلے میں کوئی نظر اور علمی تجربہ نہیں، اس کو اصحابِ نظر پر محول کردوں گا۔

طرز تعلیم، مطالعہ اور استعداد آفرینی کے لحاظ کی ضرورت

۱:-علوم مقصودہ تفسیر وحدیث وفقہ میں کتابوں میں اتنی تبدیلی اور اضافے کی ضرورت نہیں جتنی طرز تعلیم، مطالعہ اور استعداد آفرینی کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں ان فنون میں جو مستند قدیم کتابیں داخل ہیں، ان سے استغناء مشکل ہے، اور ان کا بدل بھی آسان نہیں، لیکن

---

(۱) یہ مضمون حضرت مولانا کے مجموعۂ مضامین وتقاریر ''مدارس اسلامیہ–اہمیت وضرورت اور مقاصد'' (شائع کردہ سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی) میں شامل ہے۔

طرزِ تعلیم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اصل انحصار معلمین، ان کی تربیت، زمانہ کے فہم اور روحِ دعوت، جدید علم سے واقفیت پر ہے، اس میں سے ہر جزو مستقل تفصیل طلب ہے، خط اس کا متحمل نہیں، مختصر یہ ہے اگر معلمین ان علوم کے مقاصد و کلیات کو گرفت میں لے آتے ہیں، زمانے کے رجحانات اور ذہن کے نئے راستوں سے واقف ہیں، مسائل دینیہ کو ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، اور دعوت کا جذبہ ہے، تو ان کے لیے موجودہ کتب بھی کافی اور مفید ہیں، اور اگر ایسا نہیں تو کتابوں کی تبدیلی بے کار ہوگی، میرے نزدیک ان کتابوں کو ابھی بحالہ قائم رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔

کسی ایک تفسیر کا مطالعہ کافی نہیں

۲:- ترجمۂ قرآن شریف کے بعد ''جلالین'' کے علاوہ ''مدارک'' مناسب ہوسکتی ہے، مگر اصل یہ ہے کہ کوئی ایک تفسیر ہی کافی نہیں، طالب علم کو اس کا عادی بنانا چاہیے کہ وہ چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر مطالب حل کرے، اگر تھوڑے سے حصہ میں بھی اس کی عادت پڑ گئی تو بہت مفید ہوگی، ''تفسیر مظہری'' بھی کچھ طویل ہے، ''تفسیر طنطاوی'' کسی طرح موزوں نہیں۔

دورۂ حدیث سے پہلے فضائل اعمال واخلاق کی کتاب پڑھانے کی ضرورت

دورۂ حدیث سے پہلے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ کوئی کتاب ایسی پڑھائی جائے جس سے طالب علم کو روحانی اور اخلاقی فائدہ ہو، اور مسائل اور احکام کے بجائے فضائل اعمال واخلاق معلوم ہوں، اخلاص، ایمان واحتساب اور جذبۂ عمل بیدار ہو، اس کے لیے سب سے زیادہ مؤثر بابرکت کتاب امام نوویؒ کی ''ریاض الصالحین'' ہے، اس کو ضرور رواج دینا چاہیے، کہ حدیث کا اصل موضوع یہی ہے، اس کی طرف سب سے کم توجہ ہے۔فتوی نویسی کے سلسلہ میں مولانا اعزاز علی صاحب اور جناب مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا خیر محمد جالندھری سے استصواب کیا جائے۔

۳:- اصول تفسیر میں ''الفوز الکبیر'' نہایت ضروری ہے، لیکن کوئی ایسے صاحب پڑھائیں جو قرآن کریم سے مناسبت اور قرآن مجید کا طبعی ذوق رکھتے ہوں، اور شاہ صاحب کے طرز سے آشنا ہوں۔ اصول حدیث کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (مظاہر العلوم)، مولانا ادریس صاحب (دارالعلوم) سے مشورہ کیا جائے۔

صرف ونحو میں طرزِ تعلیم بدلنے کی فوری وشدید ضرورت

۴:-صرف ونحو میں طرزِ تعلیم بدلنے کی فوری وشدید ضرورت ہے، سب سے ابتدائی کتابیں اپنی زبان میں مشق واستقرائی اصول پر ہوں، مصر کا سلسلہ ''النحو الواضح'' اور اس کا اردو چربہ ''تمرین النحو'' ملاحظہ ہو، مدرسین صاحبِ استعداد واجتہاد ہوں جو اپنے فن کو دلچسپ اور سہل کرسکیں۔

ادب سے پہلے زبان کی تعلیم کی ضرورت ہے، ابتدائی درجوں کے لیے ''الطریقۃ الجدیدۃ'' (مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، استاد دارالعلوم ندوہ)، ''قصص النبیین ۱-۲-۳'' از کاتب الحروف، ''القراءۃ الراشدۃ'' (۱-۲-۳) زیرِ طبع، اختیار کرنی چاہیے، عربی زبان کی تعلیم دراصل ہمارے مدارس میں نہیں ہورہی، اس کے لیے خود عربی ممالک میں بھی شاید اس سے بہتر نصاب تیار نہ ہوا ہو۔

ادب کے لیے ''مختارات من ادب العرب'' (مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) موزوں کتاب ہے، مکتبۃ التعاون، دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں، ''الترجمۃ العربیۃ'' (مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی ومولانا محمد ناظم) بھی قابلِ اضافہ ہیں۔

کلام کی تعلیم کے لیے قدیم کتابیں مثلاً ''شرح عقائد نسفی'' وغیرہ نہ صرف ناکافی بلکہ مضر ہیں، دراصل اس کی ازسرنو تدوین وترتیب کی ضرورت ہے، جب تک کوئی شایانِ شان کتاب نہ ہو، ''مضامین قرآن''[1] از راقم سطور، ''رسالہ اہل سنت'' از مولانا سید سلیمان ندوی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، مطالعہ کے لیے ''مذہب وعقلیات'' از مولانا عبدالباری ندوی، ''مذہب وتمدن'' از راقم سطور، ''تنقیحات'' و ''تفہیمات'' از سید ابوالاعلی مودودی کی سفارش کی جاسکتی ہے، یہ سب علم کلام سے متعلق ایک نظریہ پر مبنی ہیں جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں، کبھی ملاقات ہو تو عرض کیا جاسکتا ہے۔

نمبر ۵ کا مجمل جواب بھی اوپر آگیا، ان تمام عناوین کے لیے نئی کتابوں کی ترتیب کی ضرورت ہے، اور اس کا سامان نہیں، اگر ان میں عجلت سے کام نہ لیا جائے تو ایک متوسط مدرسہ کے لیے اس کی گنجائش ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں سے رسالہ ''انصاف'' اگر داخل درس ہو تو طلبۂ حدیث کے لیے

---

(۱) یہ مضامین قرآن مکتبۂ اسلام لکھنؤ نے 'مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی' کے عنوان سے شائع کیے ہیں۔

چشم کشا، بصیرت افروز، واعتدال آفریں ہوگا، باقی ''ازالۃ الخفاء'' کے مطالعہ کی تشویق وترغیب ہو، ''حجۃ اللہ'' بلند پایہ کتاب ہے، اگر استعداد ہوتو اس کے منتخب ابواب پڑھانے چاہئیں۔

نمبر۶:- مناظروں کے بارے میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے، اس سلسلہ میں مولانا الیاس صاحب کے طریقہ کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے، مولانا کی سوانح[(۱)] اور ''ایک اہم دینی دعوت'' ضرور ملاحظہ ہو۔

۷نمبر کے استفسارات تجارب وانتظامی امور سے متعلق ہیں، مدارس کے مہتمم حضرات سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جاسکتا ہے، کبھی ملنا ہوتو شاید کوئی مفید بات ہوسکے۔

امید ہے کہ فی الحال اسی قدر پر اکتفا کی اجازت دی جائے گی، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب وبامراد فرمائے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خاکسار
ابوالحسن علی

مکتبہ اسلام، نمبر۷، گوئن روڈ۔لکھنؤ

(۱) یعنی کتاب حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

مسلم مجلس مشاورت.

قیام کا پس منظر، محرکات و مقاصد

اور اس میں انتشار و اختلاف کے اسباب

حضرت مولاناؒ سے مسلم مجلسِ مشاورت کے قیام کے محرکات و مقاصد، نیز بعد میں اس میں ہوئے انتشار کے بارے میں یہ اہم اور چشم کشا انٹرویو مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی (عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا، ندوۃ العلماء، لکھنؤ) نے لیا، اور ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لکھنؤ (شمارہ ۲۱ر فروری ۱۹۷۱ء) میں شائع ہوا۔

تقریباً دس سال ہوئے جب راقم الحروف ''ندائے ملت'' کے کام سے لکھنؤ سے باہر گیا ہوا تھا، مقصد تھا: اس نوزائیدہ پرچہ کی توسیع اشاعت۔ اس سلسلہ میں مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات ایک دینی جماعت کے ایک ذی علم ذمہ دار سے ہوئی، انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آخر مولانا علی میاں سے لوگ اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟ حد یہ ہے کہ مخالفین تک ان کا احترام کرتے ہیں، مجھے تو ایسی کوئی بات ان کے اندر نہیں دکھائی دیتی جس سے میں متأثر ہوسکوں۔ میں نے اقبالؔ کے الفاظ ''نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز'' میں جواب دے کر اس ''پیر مغاں'' کے ''مرد خلیق'' ہونے کی نشاندہی کی۔ وہ صاحب شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے، اس لیے میرے مختصر شاعرانہ، مگر حقیقت افروز جواب سے کچھ متأثر نہ ہوسکے، تو میں نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ دی: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ [مریم:۹۶]

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے یہ جواب رواداری میں دیا تھا؛ مگر جب سے راقم الحروف مولانا مدظلہٗ سے واقف ہے اور جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، اقبالؔ کے یہ الفاظ متحرک شکل میں میرے سامنے آجاتے ہیں۔

شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

بات ہندوستانی مسلمانوں کے اخلاقی وسیاسی زوال کی ہو، یا عالم اسلام کے دینی وسیاسی زوال اور ذلت ونکبت کی، مولانا کی تحریر وتقریر اور مجلسی گفتگوؤں سے مولانا کے اس عزمِ صمیم کا اظہار ہوتا ہے۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

مولانا مدظلہٗ سے اس انٹرویو کا پس منظر یہ ہے کہ ادھر چند سال سے مولانا کے پاس ایسے خطوط کثرت سے آرہے ہیں، جن میں مجلس مشاورت کی ناکامی کے اسباب اور اس وفاق کو دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں سوالات ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ مسلم مجلس سے تعلق کی نوعیت اور ماضی میں جماعت اسلامی سے وابستگی سے متعلق سوالات ہوتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے قومی دانشوروں، مدبروں اور صفِ اوّل کے قائدین ومفکرین' اور 'مردم شناس' 'تجربہ کار داناؤں' نے مولانا کی مروّت وشرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مولانا پر کیچڑ اچھالنا شروع کردیا ہے، اور ہر معاملہ میں مولانا کی بے بصیرتی، ناکامی اور اُنھیں آلۂ کار بننے کا طعنہ دیا جانے لگا ہے۔ اس صورت حال سے مجبور ہوکر ادارہ ''ندائے ملت'' نے طے کیا کہ مولانا مدظلہٗ سے اس بارے میں کچھ وضاحت کی درخواست کی جائے۔ پہلے تو مولانا اس پر راضی نہ ہوئے، مگر مسلسل اصرار سے راضی ہوگئے۔ کچھ سوالات مرتب ہوئے اور ایک مجلس میں ان سوالات پر گفتگو شروع ہوگئی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بے کم وکاست قارئین کے سامنے آجائے، تاکہ غلط فہمی کے بادل چھٹ جائیں۔ اس لیے رنگ آمیزی اور لفاظی کے بغیر (جو انٹرویو کے لیے لازمہ سمجھے جاتے ہیں) اصل بات پیش کردی گئی ہے۔ یہ انٹرویو ایک آئینہ ہے، جس میں کچھ محترم اور قد آور شخصیتوں کو اپنا قد گھٹتا ہوا دکھائی دے گا۔

سیاست سے دلچسپی کے اسباب

سوال: ابھی آپ کی تازہ تصنیف ''حیاتِ عبدالحیؒ'' شائع ہوئی ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اور آپ کے دادا و پردادا سب خاموش علمی ودینی مزاج کے بزرگ تھے، جن کا اصلی ذوق و پسندیدہ مشغلہ تصنیف وتالیف اور تصوّف وسلوک تھا۔ ۱۹۶۴ء سے پہلے ہمیں آپ کی بھی کسی عملی سیاسی دلچسپی کا علم نہیں۔ علم ومطالعہ اور تصنیف وتالیف کے ساتھ سیاست کا نباہ ہمیشہ سے مشکل رہا ہے، اور اس کو شیشہ وآہن اور پنبہ وآتش کا ساتھ سمجھا گیا ہے۔ آپ کے لیے سیاست کے میدان میں آنے کا کوئی خاص محرک پیش آیا، اور آپ کے مزاج میں واقعۃً کوئی تبدیلی ہوئی ہے، یا اس کی حیثیت محض ایک 'شہرت وتہمت' سے زیادہ نہیں؟

جواب: آپ کا یہ استعجاب بے جا نہیں، واقعی جو میرے بزرگوں اور بوڑھوں کے

حالات سے واقف ہیں، ان کو اس میں ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے، لیکن آپ شاید بھول گئے کہ میرے خاندانی بزرگ مختلف دوروں میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور دین کی سر بلندی کے لیے میدان میں آتے رہے، اور اس کے لیے انھوں نے بارہا اپنے گوشۂ عافیت اور اپنے محبوب مشاغل کو خیر باد کہا۔ ان میں تیرہویں صدی ہجری کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے۔ یہ بھی آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے عنفوان شباب ہی میں ان کی سیرت لکھی، جو 'سیرت سید احمد شہیدؒ ' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں چھپ کر مشہور و مقبول ہو چکی تھی۔ اس کتاب کے سلسلے میں قدرۃً ان کی دعوت و عزیمت کے پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں اور اجاگر کرنا پڑا، ایک مصنف کی حیثیت سے بھی اور خاندانی تعلق و عقیدت کی بناء پر بھی، اس نوعمری میں اس کا دل و دماغ پر اثر پڑنا اور پیوست ہو جانا ایک قدرتی امر تھا، اس سے یہ نقش لوحِ دل پر ثبت ہو گیا کہ اقبالؔ کے الفاظ میں 'خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات' پر 'وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل' کو ہمیشہ ترجیح حاصل رہے گی۔ (۱)

لیکن اس سب کے باوجود میری تمام سرگرمیاں علم و ادب اور تدریس و تصنیف تک محدود تھیں، اور عملاً میں نے ۳۵-۱۹۳۶ء میں کچھ عرصہ فلسطین کے عربوں کی حمایت میں تقریریں اور دورے کرنے کے علاوہ کسی سیاسی کام میں حصہ نہیں لیا تھا۔ یوں ہمارا گھر لکھنؤ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی مستقل قیام گاہ ہونے اور ان سے گہری عقیدت کی بنا پر جمعیۃ العلماء کا حامی و ہمدرد تھا، لیکن ساری دلچسپی مولانا کی عقیدت اور جمعیۃ العلماء کی زبانی حمایت تک محدود تھی۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک اور اس کے نظریہ سے ہم لوگوں کو کبھی مناسبت نہیں پیدا ہوئی، بلکہ ہمیشہ ایک طرح کا بُعد اور اختلاف رہا۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی اور ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی ان خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، صرف اتنا فرق پڑا کہ جن لوگوں نے ملک کی قیادت و حکومت کی ذمہ داری سنبھالی، ان میں اخلاقی جرأت، قوتِ فیصلہ اور احساسِ ذمہ داری کی کمی کا شدید احساس ہوا، نیز یہ حقیقت پورے طور پر عیاں ہو گئی کہ اس آزادی اور حکومتِ خود اختیاری کی ذمہ داری سنبھالنے اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے قوم کو بالکل تیار نہیں کیا گیا تھا، اور اس نے اپنی اہلیت و صلاحیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔

---

(۱) اقبالؔ کا مشہور شعر ہے: ''یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل -- یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات''۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ آزادی کی مصروفیت میں اور بدیشیوں کو ملک سے نکالنے کے نازک کام ودشوار کام میں اہلِ ملک میں صحیح اخلاق، سچی حب الوطنی اورانسان دوستی پیدا کرنے اور سیاسی وشہری شعور پیدا کرنے کی طرف کسی کو توجہ کرنے کا بالکل موقع نہیں ملا، اور یہ مرحلہ عجلت و رواداری بلکہ ایک حدتک خام خیالی وخودفریبی میں گزار دیا گیا، اور یہ فرض کرلیا گیا کہ قوم ہرطرح سے تیار ہے، صرف ملک کے آزاد ہونے کی دیر ہے، راستہ کا یہ پتھر ہٹ گیا، تو انسانوں کی بستی نہیں، بلکہ فرشتوں کا دیس! جہاں نہ خودغرضی ہے، نہ دولت کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس، نہ انسان سے نفرت، نہ ایک دوسرے سے عداوت۔

یہی احساس تھا جس نے مجھے اس تبلیغی تحریک میں (جس میں مَیں ۱۹۴۰ء سے مولانا الیاس صاحبؒ سے پہلی ملاقات کے بعد سے برابر مصروف تھا) خالص مسلمانوں کے جلسوں کے ساتھ، جن میں صرف مسلمانوں ہی سے خطاب ہوتا تھا، ان جلسوں اور تقریروں کا اضافہ کرنے پر مجبور کردیا، جن میں غیر مسلموں کو خصوصیت سے شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، اوران میں انسانی اخوت اور ہندوستانی شہریت کو بنیاد بنا کر ان حقیقی خطروں سے آگاہ کیا جاتا تھا جو ان اخلاقی کمزوریوں اور تنگ نظری وخودغرضی کی وجہ سے ہمارے پورے سماج، پورے ملک اور ملک کی آزادی کو درپیش ہیں، اور بتایا جاتا تھا کہ اس کا علاج خدا کے خوف، انسانیت کے احترام اور ضمیر کی بیداری کے سوا کچھ نہیں۔

میری ان تقریروں کو غیر مسلم حضرات نے بھی جو خاصی تعداد میں ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے، بہت پسند کیا، اوران میں بہت سے لوگوں نے مرض کی تشخیص اوراس کے علاج سے اتفاق کیا۔ میری ان تقریروں کے دو مجموعے 'پیامِ انسانیت' اور 'مقامِ انسانیت'[1] کے نام سے عرصہ ہوا چھپ گئے ہیں، ان میں اوّل الذکر کا ترجمہ ''مانوتا کا سندیش'' کے نام سے ہندی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔[2]

اگر حالات کی یہی رفتار رہتی، تو شاید میری دلچسپی اور سرگرمی کا سب سے بڑا میدان یہی تقریریں اور جلسے ہوتے، جن کو ہم لوگ اس زمانہ میں ''مخلوط اجتماعات'' کہا کرتے تھے، لیکن کچھ تو

---

(۱) اب سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی نے 'پیام انسانیت' اور 'مقام انسانیت'' کی تقریریں مزید تین تقریروں کے اضافہ کے ساتھ بعنوان: 'تعمیر انسانیت' شائع کی ہے۔

(۲) 'مقام انسانیت' کا ہندی ترجمہ بعنوان: 'مانوتا کا استر' شائع ہوا۔

اس میں افسردگی اس وجہ سے آنے لگی کہ یہ موضوع کلیتہً میرے اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا تھا کہ یہ مضمون بہت نازک ہے، اور ذرا سی بے احتیاطی سے مقصد کو نقصان پہنچنے اور غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ غیر مسلم اصحاب کو ان جلسوں میں شریک کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل بہت کم اور دلچسپی کا سامان بہت محدود تھا۔

اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنے سے بھی چارہ نہیں کہ ہمارے ان ہم وطن بھائیوں میں ضرورت سے زائد استغناء اور احساس برتری پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ایسے جلسوں میں شرکت کرنے کی وہ کچھ زیادہ ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور ان جلسوں کی افادیت بہت کم ہو کر رہ گئی، پھر بھی مجھے بے تکلف اپنی اس کمزوری کا اعتراف ہے کہ اس کے باوجود بھی یہ کوشش جاری رہنی چاہیے تھی، کیونکہ یہ ملک کی اوّلین اور شدید ترین ضرورت، اور کم سے کم مسلمانوں کی -جن کی بنیاد دعوت و حالات سے مقابلہ کرنے پر ہے- اصل ذمہ داری ہے۔

رفتہ رفتہ میرے علمی و تصنیفی مشاغل غالب آتے چلے گئے، اور اُنھوں نے مجھے پھر مطالعہ و تصنیف کے گوشۂ عافیت میں پہنچا دیا، لیکن دل کی یہ خلش برابر قائم رہی کہ جب پورے ماحول میں بگاڑ پھیل گیا ہو اور اس کشتی میں سوراخ ہو جس میں ہم سب سوار اور ہمارا سارا انسانی و ملی اثاثہ بار ہے، ان مشاغل اور کوششوں کا کہاں تک جواز ہے جن کا فائدہ چند افراد تک محدود، اور جن کے نتائج سالہا سال کی مدت میں ظاہر ہوتے ہیں؟

اچانک ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے مجھے اپنے 'جزیرہ' سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل میں آپ کے اصل سوال کا جواب ہے۔

مسلم مجلس مشاورت کے قیام کا پس منظر

۱۹۶۴ء میں کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے۔ ان فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرنے اور صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے پہلے رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تشریف لے گئے، وہ وہاں سے بہت متاثر واپس آئے، ان کی طبیعت پر دو بڑے گہرے اثرات تھے، ایک تو ان فسادات میں انسانی جان کی بے وقعتی اور انسان کی سنگ دلی

وسفا کی کے جولرزہ خیز مناظر اُنھوں نے دیکھے، جس طرح ایک شہری نے دوسرے شہری، ایک ہم پیشہ نے دوسرے ہم پیشہ اور ایک پڑوسی نے دوسرے پڑوسی کا گلا کاٹا، اور بے زبان عورتوں اور معصوم بچوں کا خون بہایا، اس نے ان کے دل کو زخمی کر دیا، دوسرے اس کے بعد اُنھوں نے مسلم جماعتوں اور تنظیموں میں جو انتشار و اختلاف، حریفانہ اور رقیبانہ کشمکش اور قیادت و ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لیے جو ریس اور مسابقت دیکھی، اس نے ان زخموں پر اور نمک پاشی کی کہ ہر ایک نے ریلیف کے کام کے لیے اپنا جھنڈا الگ بلند کر رکھا تھا، اور ان کو ان مظلوموں کی مدد اور ان کے زخموں کے اندمال سے زیادہ اپنے اپنے جھنڈے کی سربلندی کی فکر تھی۔

اس مشاہدہ نے خاص طور پر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے دل پر بڑی چوٹ لگائی، جنھوں نے اس زمانہ میں کلکتہ کا دورہ کیا تھا، اور وہیں مولانا منظور صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، اس مسئلہ پر دونوں کا تبادلۂ خیال ہوا، مولانا ابواللیث صاحب (امیر جماعت اسلامی) اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے بھی گفتگو ہوئی۔ ایک طرف ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد و اعتماد بحال کرنے، عداوت و نفرت دور کرنے اور انسانیت و ہم وطنی کے احترام کی طرف مائل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، دوسری طرف مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے، حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت، اور اپنے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ان کو ایک اسٹیج پر لانے اور ان کی مختلف جماعتوں کے (توڑنے یا ایک جماعت میں مدغم کرنے کے بجائے) ایک وفاق بنانے کا خیال پیدا ہوا، جو مشترک مقاصد پر متفق اور اپنے خصوصی کاموں میں بدستور سرگرم رہیں۔

مولانا محمد منظور صاحب نے دورہ سے واپسی پر مجھے بھی یہ کہہ کر سفر پر آمادہ کیا کہ حالات کا بچشم خود معائنہ کیے بغیر ان کی سنگینی کا ہرگز اندازہ نہیں ہوسکتا، چنانچہ میں بھی ان کی واپسی کے بعد ہی جمشید پور کے لیے روانہ ہوگیا، وہاں سے فارغ ہوکر راوڑکیلا گیا، جہاں ابھی فسادات پر چند ہفتہ ہی گزرے تھے، دیواروں پر خون کے دھبے اور زمین پر ان کی سرخی ختم نہیں ہوئی تھی، اس سفر میں جہاں پناہ گزینوں کے کیمپ دیکھے اور ان کی زبان سے جگر دوز و دل خراش واقعات سنے، وہاں اڑیسہ کے چیف منسٹر مسٹر من موہن چودھری اور جمشید پور کے ڈاکٹر آگم جیسے انسان دوست، شریف النفس اور سرفروش بھی ملے، جنھوں نے مظلوموں کو بچانے کے لیے اپنی جانوں اور خاندانوں کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ ان دونوں حضرات سے باتیں کرنے کا موقع ملا، جس سے یاس میں آس

اور اندھیرے میں روشنی نظر آئی، اور اندازہ ہوا کہ اگر ضمیر کو پکارا اور انسانیت کو جگایا گیا تو ہر جگہ ایسی سعید روحیں اور بیدار ضمیر درندگی کا مقابلہ کرنے اور سینہ سپر ہونے کے لیے موجود ہیں۔

اس دورہ کا مجھ پر جو سب سے بڑا اثر پڑا، وہ اجتماعی زندگی کی اہمیت اور مجموعی مفاد کے لیے ذاتی دلچسپیوں اور عزلت پسندی کو پس پشت ڈالنے کا (خواہ عارضی طور پر ہو) فیصلہ تھا۔ اسی احساس کے ماتحت ہم لوگوں نے ہر طرف ایسے انسانوں کی جستجو شروع کی جو اس مقصد کے لیے مفید ہوسکتے ہیں، اور جن کا میدان میں آنا اس دھارے کا رخ موڑ سکتا ہے۔ شروع ہی سے ہم لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ محض مسلمان قائدین یا دینی شخصیتوں کا میدان میں اتر آنا اور حالات سے لڑنا کافی نہیں ہوسکتا؛ کہ اس کو محض اپنے فرقہ کی حفاظت کے جذبہ اور خوف وہراس پر محمول کیا جاسکتا ہے، اس کے لیے اکثریت کے ہردلعزیز اور ان آزمودہ کار رہنماؤں کے میدان میں آنے کی ضرورت ہے جو فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے ہر شبہ وتہمت سے بالاتر ہوں۔

اس سلسلہ میں ہم نے پنڈت سندرلال، جے پرکاش نرائن اور ونوبا بھاوے جی سے ملاقاتیں کیں؛ لیکن اندازہ ہوا کہ گاندھی جی کی طرح ان میں سے کسی میں حالات سے پنجہ آزمائی کرنے اور اپنے فرقہ کے لوگوں کی ناراضی مول لینے، اور وقتی مشاغل ودلچسپی کو یک قلم بالائے طاق رکھ دینے اور اس کام کے لیے جو ملک کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کا واحد ذریعہ ہے، جان کی بازی لگا دینے کی ہمت نہیں۔ خاص طور پر یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ونوبا بھاوے جی، جو گاندھی جی کے حقیقی جانشین سمجھے جاتے ہیں، اس کام کو بھودان جیسی محدود فائدہ والی تحریک پر مقدم رکھنے کے لیے تیار نہیں، اور ان کے اندر اس بارے میں وہ بے چینی محسوس نہیں ہوئی جو کسی گاؤں میں آگ لگ جانے یا سیلاب آجانے کے وقت عام انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کے لیے ایک نئی وفاقی تنظیم کی ضرورت ہے، جو اکثریتی فرقہ کے نیک دل رہنماؤں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کے ساتھ اپنی صلاحیتوں اور وسائل پر اعتماد کرے، اور ملک کی آبادی کے مختلف عناصر میں اتحاد واعتماد اور مسلمانوں میں خود اعتمادی وخدا اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش بیک وقت جاری رکھے۔

یہ وہ پس منظر تھا، جس میں ۱۵-۱۶ر اگست کو ۱۹۶۴ء میں لکھنؤ میں 'مسلم مجلسِ مشاورت' قائم ہوئی۔ یہاں پر یہ بھی صاف کہہ دوں کہ اس کے قیام میں سب سے بڑا حصہ ڈاکٹر سید محمود اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا تھا، اور فکری حیثیت وترجمانی کے لحاظ سے 'دعوت' کے لائق ایڈیٹر محمد مسلم

صاحب کا، اس کے بعد اس میں سب سے زیادہ تائید اور ہمت افزائی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی اور ملا جان صاحب کی شامل تھی۔

میں اس زمانے میں بمبئی میں آنکھ کا آپریشن کرانے گیا ہوا تھا۔ میں وہاں سے واپس آیا تو مجلس کے ابتدائی جلسہ کی تاریخیں طے ہوچکی تھیں، اور بہت سی سہولتوں کی بناء پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس کا انعقاد طے کیا گیا تھا۔ میں ابھی آپریشن کے بعد کے احتیاطی مرحلہ میں تھا، اور مجھے تقریر وزیادہ گفتگو کرنے کی ممانعت تھی، کہ مجھے اپنے وطن رائے بریلی میں بعض مؤثر داعیوں کا یہ پیغام پہنچا کہ خطبۂ استقبالیہ کے طور پر مجھے کچھ لکھوا دینا چاہیے، جس سے اس مجلس کے مقاصد کی وضاحت اور شرکاء میں موقع کی نزاکت اور اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ میں نے بڑا خطرہ مول لے کر یہ خطبہ لکھوایا، جو اس کے پہلے اجلاس میں پڑھا گیا۔

اس جلسہ میں کئی مرحلے ایسے پیش آئے کہ یہ شیرازہ جو بڑی محنت وسعی سے مجتمع ہوا تھا، منتشر ہوتے ہوتے اور کھیل بگڑتے بگڑتے رہ گیا۔ میں بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ میرے سامنے اس وقت اس مجلس کے نہ دوررس مقاصد تھے، اور نہ وہ آئندہ پیش آنے والے مرحلے جو بعد میں پیش آئے؛ میرے سامنے صرف ایک حقیقت تھی، وہ یہ کہ بہت عرصہ کے بعد مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو متحد اور ملک وملت کی حفاظت وخدمت کے لیے مجتمع ہونے کا موقع ملا ہے؛ چھوٹی چھوٹی باتوں اور وقتی تاثرات کے ماتحت یہ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے، اگر یہ وحدت باقی رہے گی، تو اس سے بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔

چنانچہ میں نے اپنی سعادت اور غرض صرف یہ سمجھا کہ یہ جلسہ ناکامی پر ختم نہ ہونے پائے، اور جو بچھڑے ہوئے عرصہ کے بعد ملے ہیں، وہ پھر بچھڑنے نہ پائیں۔ اس کے لیے مجھے بعض مرتبہ خدا اور رسول کا واسطہ دینے اور ملت کے حال پر رحم کرنے کی اپیل سے کام لینا پڑا۔ بہر حال اس میں کسی کی صلاحیت کو دخل نہ تھا، خدا کی مدد تھی کہ ایک وفاق قائم ہوگیا، مہمان یہ تاثر لے کر رخصت ہوئے کہ ایک تنظیم وجود میں آگئی، اور ملک کے ہر گوشہ میں مسلمانوں نے اس پر خوشی اور تشکر کا اظہار کیا کہ مسلمان زعماء وقائدین ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے، اور اب وہ ملک کے اتحاد اور ملت کے اتفاق کے لیے ایک ایسی ٹیم کی طرح کام کریں گے جس کے آزمودہ کار کھلاڑی مختلف ٹیموں سے انتخاب کرکے ایک رشتہ میں پروئے گئے ہوں۔

لیکن واقعہ یہ تھا کہ یہ وفاق اتنے مختلف الخیال اور مختلف المزاج عناصر سے مرکب تھا کہ وہ

ایک واحد مزاج پیدا نہیں کرسکتا تھا، یا ٹیم کی مثال کی روشنی میں سمجھ لیجیے کہ کھلاڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنے اور ایک مقصد کے لیے اپنی صلاحیتوں کے استعمال کرنے کا تجربہ نہیں تھا، مقاصد بھی کچھ مبہم اور غیر واضح تھے۔ صدر محترم ڈاکٹر سید محمود صاحب پر صرف ایک مقصد سب سے زیادہ حاوی اور طاری تھا، وہ ان کی پچھلی تاریخ، ان کے سیاسی خیالات اور گاندھی جی کے ساتھ گہری اور غیر متزلزل عقیدت اور ان کے فلسفہ پر پختہ عقیدہ کا نتیجہ تھا، یعنی ہندو۔مسلم اتحاد!۔ یہی ڈاکٹر صاحب کے دل کی اصلی آواز اور ان کی دلچسپی کا اصل موضوع تھا، اور اسی مقصد نے ان کے اندر اس بڑھاپے میں جوانی اور اس معذوری میں حیرت انگیز قوتِ عمل اور جانفشانی پیدا کردی تھی۔

ارکان میں بہت سے لوگ باہمی اعتماد سے زیادہ خود اعتمادی پر یقین رکھتے تھے، اور اس وفاق کا اصل فائدہ مسلمانوں میں عزم و حوصلہ پیدا کرنا سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اس ملک کی اخلاقی قیادت سنبھالنے اور خیر الامم کا مقام حاصل کرنے اور اس کا منصب پورا کرنے کو اس کی اصل غرض و غایت سمجھ رہے تھے۔ اس میں ہمارے لائق دوست محمد مسلم صاحب مدیر ''دعوت'' سب سے پیش پیش تھے، اور مجلس کی تحریری ترجمانی کا فرض زیادہ تر وہی انجام دیتے تھے۔

شخصی اور اجتماعی قیادت

کچھ لوگ مسلمانوں میں قیادت کے اس خلا کا پُر کرنا اس مجلس کا اصل کارنامہ سمجھتے تھے جو تقسیم کے بعد سے بری طرح سے مسلمانوں کو کھٹک رہا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر اس ملک میں کوئی ایک شخصیت تنہا قائد بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اجتماعی قیادت (Collective Leadership) اس کی بہتر طریقہ پر قائم مقامی کرسکتی ہے؛ حالانکہ یہ خیال سطحیت، اور ملتوں و قیادتوں کی تاریخ کے ناکافی مطالعہ پر مبنی تھا۔ اجتماعی قیادت بہت سے ایسے اوصاف و شرائط کی طالب ہے جو اس مجموعہ میں نہیں پائے جاتے تھے، اور جن کا مہیا ہونا شخصی قیادت سے زیادہ مشکل اور نایاب ہے۔

مجلس کے اسٹیج سے جو تقریریں ہوتی تھیں، ان سے انھیں مقاصد اور ذہنیتوں کی عکاسی ہوتی تھی، اور ان کے آئینہ میں یہ ذہنی انتشار صاف نظر آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک دوروں اور تقریروں کا مرحلہ رہا، اور اس مجلس سے مسلمانوں کی عرصہ کی پیاس بجھنے کا سامان ہوتا رہا جو تحریک خلافت اور کسی حد تک مسلم لیگ کے دور کے بعد سے پائی جارہی تھی، اس وقت تک یہ کمزوریاں

صرف ان لوگوں کومحسوس ہوتی رہیں جو گہری نظر اور جماعتوں کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔

'مسلم مجلسِ مشاورت' کے ارکان نے بہار، اڑیسہ، گجرات، مہاراشٹر اور میسور کے طویل وعریض دورے کیے۔ یہ دورے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریکِ خلافت کے بعد ہندو۔مسلم اتحاد کے ایسے مناظر اور مسلمانوں کا ایسا جوش وخروش دیکھنے میں نہیں آیا۔اس کی ایک جھلک میرے اس مضمون میں دیکھی جاسکتی ہے جو دسمبر ۱۹۶٦ء کے ہفت روزہ 'ندائے ملت' کے پانچ شماروں (۲ر دسمبر تا ۳۰ر دسمبر ۱۹۶٦ء) میں ''بارہ دن ریاست میسور میں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔[1] اس انتشار کے باوجود جو قدرتی طور پر ارکان کی تقریروں میں پایا جاتا تھا، ان دوروں میں مجلسِ مشاورت کے پلیٹ فارم سے بعض بڑی تعمیری، پرمغز اور روح پرور تقریریں ہوئیں۔ سچی حب الوطنی، صحیح انسان دوستی، انسانی جان و مال اور عزت وآبرو کی قدر و قیمت کا بڑی طاقت وخوبی سے احساس دلایا گیا۔ ملک کے لیے حقیقی خطرے کی نشاندہی کی گئی۔ایک طرف مختلف الخیال مسلمانوں کو، دوسری طرف دور دور رہنے والوں اور ہندو مسلمانوں کو بار بار مل کر بیٹھنے اور قریب سے ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملا۔اس وقت اگر مجلس کی قیادت مضبوط وصاحبِ عزم اور سرگرم ہوتی، اور ان مختلف عناصر کو امتزاج کا موقع ملتا، تو اپنی بنیادی کمزوریوں کے باوجود یہ مجلس اس ملک میں بہت بڑا تعمیری کردار ادا کرسکتی تھی، جو ملک کو بھی اور مسلمانوں کو کسی سوچی سمجھی منزل پر پہنچا دیتی؛ لیکن افسوس ہے کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، اور مجلس کے ارکان میں انتشار پیدا ہوگیا۔

مسلم مجلس مشاورت کی ناکامی کے اہم اور بنیادی اسباب

سوال: آپ کے نزدیک مجلس کی ناکامی کے اہم اور بنیادی اسباب کیا ہیں؟

جواب: میں نے مختلف قیادتوں، جماعتوں اور اصلاحی کوششوں کی تاریخ کا جو محدود مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر اس نتیجہ پر ہوں کہ کسی مختلف العناصر اور کثیر الاجزاء مجموعے کو برقرار اور مفید ومؤثر بنانے میں دو بڑے عامل (Factors) ہوتے ہیں: یا کسی ایسی شخصیت یا سربراہ کی موجودگی جو ان کے تمام مزاجی اختلافات اور رنگارنگی کے باوجود اُن کو مقصد واحد کے حصول کے لیے متحد اور ایک منزل کے لیے رواں دواں رکھے، اور اُن کے مزاجی یا مسلکی اختلافات کو (جس کو تنوع Variety کہنا زیادہ صحیح ہوگا) اس حد تک ابھرنے نہ دے کہ اس مشترک مقصد کو نقصان

(۱) یہ مضمون انجمن طلبہ بھٹکل، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) نے ''بارہ دن ریاست میسور میں'' کے عنوان سے شائع کیا۔

پہنچے، یا وہ شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔ اس لحاظ سے واقعہ یہ ہے کہ بڑے ادب و معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑے گا کہ اپنے بڑھاپے، شدید معذوریوں اور مخصوص افتادِ طبع اور تاریخ کی بنا پر ڈاکٹر سید محمود صاحب اس نازک فریضہ کو انجام نہیں دے سکتے تھے، اور ہم نے اُن پر اُن کی ہمت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔

دوسرے یہ کہ اگر ایسی شخصیت نہ پائی جائے، تو پھر اس مجموعے کے اجزاء میں مقصد کا ایسا عشق اور ملت کے مفاد کو جماعتوں کے مفاد پر مقدم رکھنے کا ایسا جذبۂ صادق پایا جائے کہ کوئی اختلاف ابھرنے نہ پائے، اور وہ شیر وشکر اور ایک جان دو قالب ہو کر ملت کے مفاد کے لیے ساعی وسرگرم رہیں۔ افسوس ہے کہ ایسا بھی نہیں تھا، اور بار بار یہ تجربہ ہوا کہ جماعتوں نے ملت کی جگہ حاصل کر لی ہے اور وسائل وسائل نہیں رہے، مقاصد بن گئے ہیں۔ ایسی صورت میں اس مجموعے میں انتشار پیدا ہونا لازمی تھا، اور ۱۹۶۷ء میں اس مجلس کی مختصر عمر میں پہلی مرتبہ جب عام انتخابات کا مرحلہ سامنے آیا تو یہ انتشار کھل کر سامنے آ گیا۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس کا وجود اب صرف کاغذ پر رہ گیا ہے؛ لیکن یہ کاغذی وجود اب بھی فائدے سے خالی نہیں، اس تن مردہ میں پھر جان ڈالی جا سکتی ہے، بشرطیکہ ان دونوں شرطوں میں سے کوئی شرط پوری ہو جائے۔ میرے خیال میں طویل تعطل اور تلخ تجربوں کے باوجود مسلمان اب بھی اس مجلس سے کلیۃً مایوس نہیں ہوئے ہیں، اور نہ ابھی تک ملک میں اخلاقی قیادت کا خلا پُر ہوا ہے، نہ مسلمانوں میں ملی قیادت کا، اور نہ ہندوستان میں ابھی تک خلائق دوستی، انسانیت کے احترام، سچی حب الوطنی اور اخلاقی بلندی کی تبلیغ کے لیے کوئی جماعت یا تحریک وجود میں آئی ہے۔ اس لیے میں نے ۱۹۶۶ء کے مضمون میں جو شعر اس مجلس کے سلسلہ میں لکھا تھا، وہ اب بھی ایک حقیقت ہے کہ

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف
بامیدِ آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

سوال: اب ایک دشوار اور نازک سوال کی اجازت دیجیے، جس کے لیے میں دل سے معذرت خواہ ہوں، مگر

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ یوپی میں مسلم مجلس کے حقیقی بانی اور سرپرست ہیں، آپ ہی کے اشارے سے یہ مجلس قائم ہوئی، اور اس کے تمام اہم فیصلوں میں آپ کا مشورہ شامل ہوتا ہے؟

جـــواب: میں آپ کے اس سوال پر کوئی احتجاج نہیں کروں گا؛ بلکہ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بعض حقیقتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

اس موقع پر بے تکلف اس کا بھی اظہار کر دوں کہ ۶۷ء کے عمومی انتخابات کے موقع پر میری بھی یہ رائے تھی کہ مسلمان اس ملک میں اپنا سیاسی وزن ثابت کرنے کے لیے، اور اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ وہ بعض اوقات پاسنگ کا یا فیصلہ کن طاقت کا درجہ رکھتے ہیں، اس مرتبہ کسی سیاسی پارٹی یا حکمراں جماعت کے پابند نہ رہیں، اور اپنے حق رائے دہندگی کا آزادانہ استعمال کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل اور قسمت مستقل طور پر کانگریس سے وابستہ ہے، اس لیے میں نے اور میرے چند رفیقوں نے یہ کوشش کی کہ مجلسِ مشاورت کی طرف سے جو منشور یا ہدایت نامہ شائع ہو رہا ہے، اس میں کوئی جملہ ایسا آجائے جس سے اس حقیقت کا اظہار ہو کہ کسی جماعت کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے ووٹ اس کی جیب میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے خود صدر محترم ڈاکٹر سید محمود صاحب کا یہ جملہ انتخاب کیا، جو انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''مسلمانوں نے کسی جماعت کے نام خطِ غلامی نہیں لکھ دیا ہے۔'' یہ منشور جو زیادہ تر مولوی محمد مسلم صاحب مدیر ''دعوت'' کے قلم سے مرتب ہوا تھا، پہلا منشور تھا جس میں اخلاق اور اصول کو بنیاد بنایا گیا تھا، اور امیدواروں کی تائید و ترجیح میں ان کی صفات اور ان کے کردار کو معیار قرار دیا گیا تھا۔

اسی زمانے میں ''ندائے ملت'' کے انتخابات نمبر میں، جو اس وقت تک میری اور مولانا منظور صاحب نعمانی کی رہنمائی میں شائع ہوتا تھا، میں نے ایک مضمون لکھا، [1] جس میں میں نے کھل کر مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں کو ایک بار اپنے عمل سے ثابت کر دینا چاہیے کہ جس طرح ان میں نفع پہنچانے کی صلاحیت ہے، ضرر پہنچانے کی بھی صلاحیت ہے؛ تا کہ کوئی جماعت ان کو صرف نفع کا ذریعہ سمجھ کر ان کے حقوق و مسائل سے مسلسل چشم پوشی نہ برتے۔ میں نے اس مضمون کے [غالباً آخر] میں اقبالؔ کے یہ دو شعر لکھے تھے:

تمیزِ خار و گل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری

(۱) یہ مضمون ''ندائے ملت'' کے انتخابات نمبر میں ''گذشتہ انتخابات اور مسلمانوں کا طرزِ عمل: اس کے اسباب اور پس منظر'' کے نام سے شائع ہوا۔

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

اس وقت حالات کا تقاضا اور عقل و دانش کا فیصلہ یہی تھا؛ لیکن میں مسلمانوں کی اس صلاحیت کا اظہار کرنے کے لیے ایک بار اس خطرہ کو مول لینا قرین عقل سمجھتا تھا، چنانچہ ایسا ہوا، اگرچہ مسلمانوں کو جزوی نقصانات پہنچے؛ لیکن یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمان نفع وضرر دونوں کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک آگے جا کر اس سے مسلمانوں کے متعلق رائے قائم کرنے اور ان کے حقوق و مطالبات کی اہمیت تسلیم کرنے میں مدد ملی۔ ممکن ہے، بہت سے سیاسی مبصرین کو اس رائے سے شدید اختلاف ہو؛ لیکن بہر حال یہ میری رائے تھی، اور سیاست کوئی پتھر کی لکیر تو نہیں جس میں کسی قسم کا لوچ پیدا نہ ہو سکے۔

انتخاب کی یہ مہم یو پی میں ڈاکٹر فریدی صاحب نے چلائی تھی، جو انتخابات کے میدان کے ایک شہسوار تھے، اور اس سے ان کو فطری مناسبت اور طبعی ذوق ہے۔ ان کے طریقۂ کار سے مجلسِ مشاورت کے بہت سے ارکان کو اختلاف ہوا، جن میں ڈاکٹر سید محمود صاحب اور مولانا ابواللیث صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انتخابات کے بعد مجلس مشاورت کا جب پہلا جلسہ دہلی کے صدر دفتر میں ہوا، تو ڈاکٹر فریدی صاحب کے رویہ پر ڈاکٹر سید محمود اور ان ارکان نے سخت اعتراض کیا جو مجلسِ مشاورت کی ممبر جماعتوں کا انتخابات میں عملی و سرگرم حصہ لینا مجلس کے روح اور مفاد کے خلاف اور اس وفاق کے لیے خطرناک سمجھتے تھے جو مختلف الخیال جماعتوں پر مشتمل تھا، یا ان جماعتوں کی نمائندگی کرتے تھے جو اصولاً اس نظام اور انتخاب کے طریق کار کو غلط سمجھتی ہیں، ان میں ہمارے رفیق قدیم اور محترم دوست مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی پیش پیش تھے۔

مشکل یہ تھی کہ اس وفاق میں بعض ایسی جماعتیں شامل تھیں جن کے لیے انتخابات میں حصہ لینا ضروری تھا، مثلاً مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء، اور بعض ایسے افراد شامل تھے جو نظری طور پر اس کو مفید، مسلمانوں کے مسائل کا حل سمجھتے تھے، اور عملی طور پر اس کے تحت سے عادی اور اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے، اور وہ کسی طرح اس سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

اب مجلس مشاورت کے سامنے دو ہی راستے تھے: ایک یہ کہ مجلس ان حضرات کے خلاف تادیبی کارروائی کرے اور ان کو مجلس سے خارج کردے جنھوں نے انتخابات میں سرگرم حصہ لیا، اور اس طرح بغاوت یا ٹوٹ جانے کے خطرے سے دوچار ہو، دوسرے یہ کہ اس عنصر کو ناراض کردے

اوراس کو سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھے جو مجلس کے انتخابات میں سرگرم حصہ لینے کو اصولاً غلط یا اس نظام ہی کو سرے سے غیر اسلامی سمجھتا ہے، یہ دونوں باتیں مزاحمت واندرونی انتشار سے خالی نہ تھیں، یا ایک ایسا درمیانی راستہ نکالا جائے کہ آئندہ ان کے فعل کی ذمہ داری مجلس پر نہ آئے۔

اس موقع پر یہ حل سامنے آیا کہ جس طرح جنوبی ہند میں مسلم لیگ انتخابات میں حصہ لیتی ہے، اور وہ مجلس مشاورت کی ایک اہم رکن جماعت ہے، اسی طرح ڈاکٹر فریدی صاحب اور ان کے رفقاء کو اجازت دی جائے کہ وہ یوپی میں کسی نام سے ایک سیاسی مجلس کی تشکیل کر لیں، اور آئندہ اسی مجلس کے نام سے وہ اس مقصد کی تکمیل اور اپنے جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کریں، اور ان کی جماعت اس وفاق میں اسی طرح شامل ہو جائے جیسے مسلم لیگ اور انتخابات میں حصہ لینے والی دوسری جماعتیں (مثلاً خلافت کمیٹی، کلکتہ) شامل ہیں، اسی کے ساتھ یوپی میں مجلس مشاورت کی شاخ بدستور قائم رہے، اور اس کی قیادت کے لیے کسی دوسرے صاحب کا انتخاب ہو جائے۔ چونکہ میرے اور ڈاکٹر فریدی صاحب کے تعلقات اکثر ارکان کو معلوم تھے، اور وہ یہ دیکھتے تھے کہ وہ کس حد تک میرا لحاظ و پاس کرتے ہیں، اس لیے یہ کام میرے سپرد ہوا، اور میں نے اس کی ذمہ داری لی؛ چنانچہ اسی مقصد کے ماتحت یوپی میں مسلم مجلس قائم ہوئی، میں اس کے تأسیسی جلسہ میں شریک ہوا، اور میں نے یہ ذمہ داری ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر کے اپنے کو اس فریضہ سے سبک دوش سمجھ لیا جو مجلس مشاورت کے موقر ارکان نے میرے سپرد کیا تھا، اور میں نے اس کو مجلسِ مشاورت کی ایک اہم خدمت تصور کیا کہ وہ اس طرح دائمی انتشار و تصادم کا شکار ہونے یا اچانک ختم ہونے سے بچ گئی۔ مسلم مجلس کا یہ پس منظر مولانا ابواللیث صاحب اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کو خوب معلوم ہے، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم میں سے کوئی اس بارے میں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے۔

مسلم مجلس کے قیام کے بعد میں نے اپنے کام کو ختم سمجھا، اور میری ذہنی وفکری وابستگی مجلس مشاورت سے قائم رہی، اور قانونی طور پر اب بھی اس کے ساتھ قائم ہے۔

یہ صحیح صورتحال ہے، مجلس مشاورت کی بقا اور اس کے دوروں میں شرکت اور ملکی و ملی مقاصد کے ساتھ اتفاق کے علاوہ، میں اپنی صحت کی خرابی، افتادِ مزاج اور شدید مشغولیت کی وجہ سے کسی سیاسی تحریک میں بھی کوئی عملی حصہ نہیں لیتا۔ میں اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ آدمی جب تک کسی کام کے جزو وکل سے پوری طرح متعلق نہ ہو، اس کی پوری طرح نگرانی نہ کر سکے، اخلاقی طور پر

اس کی پوری ذمہ داری نہ لے سکے، اس کا اس کی ذمہ داری سے علاحدہ رہنا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ مسلم مجلس کے جلسوں میں بھی مجھے شروع کے ایک دو جلسوں کے بعد جن میں میں بہ ضرورت شریک ہوا، کسی جلسہ میں شرکت کی نوبت نہیں آئی، اور وہاں جو کچھ فیصلے کیے گئے، وہ اس کی مجلس انتظامی یا مجلس عاملہ کی رائے سے کیے گئے، اور مجھے اکثر ان کی اطلاع بعد میں ہوئی۔ البتہ اس سے مجھے انکار نہیں کہ اس مجلس میں میرے متعدد مخلص اور قدیم احباب ورفقاء شریک ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کی بھی محنت، لگن اور مالی قربانی کا قائل ہوں، اور میری یہ دعا اور تمنا ہے کہ ان کی خداداد صلاحیتیں زیادہ سے زیادہ ملت کے لیے مفید اور باعث تقویت ہوں۔

اس موقع پر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سیاسی کاموں میں کسی کا کسی پر اعتماد اور اس سے عقیدت ومحبت ہمیشہ ایک خاص دائرے میں محدود ہوتی ہے، اور یہ سمجھنا کبھی صحیح نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اپنے کو کلیۃً کسی کے حوالے، اور اپنی رائے ورجحان کو کسی دوسرے کی رائے اور رجحان پر قربان کر دیتا ہے۔ میرے اور ڈاکٹر صاحب کے تعلق کا بھی یہی معاملہ ہے۔

ملت کا مفاد اور کسی مقصد کی سچی طلب بار بار تجربوں اور قسمت آزمائی پر آمادہ کرتی ہے

سوال: ڈرتے ڈرتے ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں اور بعض انگریزی وار دو اخبارات میں بار بار یہ خیال دیا گیا ہے کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی ہر تحریک کے پیچھے آپ کی شخصیت اور آپ کا دماغ کام کرتا ہے۔ خاص طور پر ابھی حال ہی میں دہلی میں ہونے والے ''آل انڈیا مسلم پولیٹکل کنونشن'' کے قیام کے پس پردہ بھی آپ ہی کا دماغ کام کر رہا تھا، آپ اپنی علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر فریدی صاحب کے بھی اعتماد و تقویت کا سب سے بڑا ذریعہ آپ ہی ہیں۔ ایک صاحب نے ابھی حال ہی میں ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آپ پہلے جماعت اسلامی میں تھے، اور آپ اخوان المسلمین کے بھی (جس کو مضمون نگار نے ناواقفیت میں شبان المسلمین لکھ دیا تھا) بڑے ہمدرد ہیں، جس نے مصر میں صدر ناصر کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی، ایسے لوگ بھی ہیں جن کو ہر بڑی تحریک اور واقعہ میں آپ ہی کا سایہ نظر آتا ہے؟

جواب: میں اس قدر افزائی کا دل سے شکر گزار ہوں۔ لوگ تو زر کثیر صرف کر کے اور بڑے جوڑ توڑ سے شہرت وعزت حاصل کرتے ہیں، مجھے اگر مفت میں اور بغیر کچھ کیے یہ عزت مل

جائے تو کیوں انکار کروں؟!! ملک کے کئی اخبارات میرے نام کو فراموش اور میری شہرت کو ماند نہیں ہونے دیتے، یہ میرے اعزازی مبلغ اور بہی خواہ ہیں، آپ میرا شکریہ ان سب کو پہنچا دیجیے۔

خیر یہ تو ظرافت کی بات ہوئی، میں اس کے جواب میں مولانا روم کا وہی شعر پڑھوں گا جو بہت سے مظلوموں نے اپنے اپنے وقت پر پڑھا ہے، اور اقبالؔ نے بھی اسی کو اپنی مثنوی میں دہرادیا ہے:

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من

اگر تعلّی نہ سمجھی جائے، تو میں کہوں گا کہ مجھے یہ وراثت اپنے قابلِ صد ہزار احترام جد و مورث اعلیٰ سے ملی ہے، جن کی ہم نامی کا مجھے شرف حاصل ہے، ان کے بارے میں یا تو افراط سے کام لیا گیا ہے یا تفریط سے، یا ان کو آسمان پہ پہنچا دیا گیا ہے یا شدید سے شدید الزامات لگائے گئے ہیں۔ میں نہ تو اتنا ذہین و فاضل، دانشور و مدبر ہوں، اور نہ اس دل آویز و طاقتور شخصیت کا مالک کہ ہر تحریک کے پیچھے میرا ہی دماغ اور میری ہی ذہانت کام کرتی ہے، اور نہ اتنا غبی، کند ذہن، جلد دھوکا کھا جانے والا، ہر ایک کا آلۂ کار بن جانے والا اور ہر محضر پر دستخط کر دینے والا، جیسا میرے بہت سے مہربان سمجھتے ہیں۔ البتہ کسی چیز کا سمجھ لینا اور بات ہے، اور اس کا موقع بے موقع اظہار کرتے رہنا اور بات ہے۔ مجھ سے کون کتنا فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کو میں خوب سمجھتا ہوں؛ لیکن میں اس کی تشہیر، اعلان اور ڈھول پیٹتے رہنا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ہر شریف انسان کو کسی نہ کسی وقت سادہ لوح بن جانا، اور جانتے ہوئے انجان بن جانا ضروری ہوتا ہے۔ کوئی شخص ہر وقت قانون محض اور شمشیر برہنہ نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے مردم شناسی کا ایک شمہ بھی نصیب نہیں ہوا، وہ بڑی غلط فہمی میں ہیں۔

ملت کا مفاد اور کسی مقصد کی سچی طلب بار بار تجربوں اور قسمت آزمائی پر آمادہ کرتی ہے، اور پیاسا انسان سراب کی طرف بے اختیار دوڑ پڑتا ہے۔ ایران کے حکیم شاعر عرفیؔ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جس پیاسے مسافر کے قدم بے اختیار سراب کی طرف نہ اٹھ جائیں، اس کی عقل خواہ پختہ ہو اس کی تشنگی خام ہے۔ یہ شعر دنیا کی زبانوں کے منتخب ترین اشعار میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

زنقص تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

جہاں تک دہلی میں ماہ دسمبر میں منعقد ہونے والے مسلم پولیٹکل کنونشن کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر فریدی صاحب اوران کے رفقاء کا تخیل اور تجویز تھی۔ مجھ سے اس کے لیے ایک پیام کی فرمائش کی گئی، اور ہر صاحبِ فکر وصاحب دعوت کی طرح میں نے بھی یہ سمجھ کر کہ اس میں ملک کے چیدہ عناصر شامل ہوں گے، اوراس تقریب سے میرے خیالات اور آواز ان حلقوں تک بھی پہنچ جائے گی جہاں آسانی سے نہیں پہنچتی، اس لیے میں نے اس معذرت کے ساتھ کہ میں ایک مذہبی اور گوشہ نشین انسان ہوں، ان حقیقی خطرات کی نشاندہی کی جو ملک کو درپیش ہیں، اوراس مُہیب اخلاقی پستی، بے اصولی اور سیاسی سودے بازی کا ماتم کیا جو اس وقت ہمارے پورے معاشرہ میں کارفرما ہے، اور مسلمانوں کو ان کی اخلاقی ذمہ داری اور فرض منصبی یاد دلایا، وہ ملک کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی کوشش کریں۔ (۱)

کانفرنسوں اور جلسوں میں ہر نقطۂ نظر کے لوگوں کے پیامات کا حاصل کرنا، اور اہلِ فکر کا اس سے فائدہ اٹھانا ایک عام دستور ہے۔ اس لیے اگر میں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا، اور خالص اپنے فکر ونظر کے مطابق بات کہی، تو یہ کون سا جرم ہے؟ پھر واقعہ یہ ہے کہ اس کنونشن نے سارے ملک کو پھر ایک بار مسلمانوں کے مسائل کی طرف متوجہ کر دیا، انگریزی پریس نے اس کا جو چرچا کیا وہ عرصہ سے کسی سیاسی اجتماع کا نہیں ہوا تھا۔

جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے، میں ابتداء میں چند سال اس میں شریک رہا ہوں، لیکن اپنے ذہنی پرداخت، اپنے فہم دین اور طریقۂ فکر کی بنا پر، نیز عملی تجربوں کی روشنی میں اس سے علاحدہ ہو گیا۔ اب بھی اس میں میرے بہت سے قابل قدر دوست ہیں، اور وہ بہت سے مفید کام بھی کر رہے ہیں؛ لیکن میرے اور مولانا مودودی کے فہم دین اور دینی حقائق کی تفہیم وتعبیر اور صحابہ وسلف کے بارے میں طرزِ تحریر وگفتگو میں خاصا فرق ہے، جو میری اوران کی تحریریں پڑھنے والوں پر مخفی نہیں۔ (۲) اب اس پرانی بات کو دہراتے رہنا اور ایک الزام کے طور پر اس کا اعادہ کرنا کوئی معقول بات نہیں۔

---

(۱) حضرت مولانا کا یہ تحریری پیغام بعنوان: 'خطبۂ افتتاحیہ آل انڈیا مسلم پولیٹکل کنونشن منعقدہ نئی دہلی ۱۹-۲۰ر دسمبر ۱۹۷۰ء علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوا۔

(۲) تفصیل کے لیے حضرت مولانا کی کتاب 'عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح' (شائع کردہ: دار عرفات، گوئن روڈ، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء) کا مطالعہ کریں۔

اخوان المسلمین سے میرا تعلق اتنا ہے کہ میں اس کو مشرق وسطی کی سب سے بڑی دینی واصلاحی تحریک سمجھتا ہوں، اور اس کے ختم ہو جانے کو میں مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی اور مشرق وسطی کی بہت سی خرابیوں اور عربوں کی نکبت وشکست کا ذمہ دار۔ صدر ناصر کے متعلق میرے خیالات سب کو معلوم ہیں، [1] اور ہر صاحبِ فکر کو حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے۔ جو لوگ ان باتوں کی بار بار تشہیر کرتے ہیں، ان کا مقصد سیاسی اور زیادہ تر ذاتی ہوتا ہے، اور مجھے اس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔

(۱) تفصیل کے لیے حضرت مولانا کی کتاب 'عالم عربی کا المیہ' میں مضمون 'صدر ناصر کی مخالفت کیوں؟' کا مطالعہ کریں۔

تحریک پیامِ انسانیت:
پس منظر، محرکات و مقاصد اور طریق کار

تحریک پیام انسانیت کے قیام کے محرّکات و مقاصد اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں یہ جامع اور دستاویزی حیثیت کا حامل انٹرویو مولانا اسحاق جلیس ندویؒ (سابق رئیس التحریر ''تعمیر حیات''، لکھنؤ) نے لیا، اور ''تعمیر حیات'' (شمارہ ۱۰/ جون ۱۹۷۸ء) میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ انٹرویو متعدد بار دفتر تحریک پیامِ انسانیت، لکھنؤ سے علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوا۔

سوال: میں آج آپ سے تھوڑا سا وقت ''پیامِ انسانیت'' کی تحریک کے سلسلے میں لینا چاہتا ہوں۔ خدا کے فضل سے ہندوستان کی چار ریاستوں مدھیہ پردیش، ہریانہ، پنجاب، راجستھان میں اس کے کامیاب دورے ہوئے، بہار کے شہر سیوان میں بھی اس کا عظیم جلسہ ہوا،[1] ہندو مسلمانوں کی یکساں دلچسپی، عظیم تعداد میں شرکت، غیر مسلم فضلاء و عمائدین شہر کا ذوق وشوق سے شرکت کرنا، اور اپنے گہرے تأثر کا اظہار، جلسوں کا سکون اور نظم وضبط، ان جلسوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو سالہا سال سے اس ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے دل کی آواز، اور وقت کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وسیع ملک میں (مسلسل تلخ تجربوں کے بعد بھی) خلوص اور بے غرضی کی سچی طلب اور قدر ہے، اور یہاں کے معاشرے کا ضمیر خوابیدہ کہا جاسکتا ہے، مردہ اور مفلوج نہیں ہے، اور خدا کی رحمت، انسانیت پر ہمیشہ سے جو اس کی نظر کرم رہی ہے، اور انسانوں کی اندرونی صلاحیتوں سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اب جبکہ یہ اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ ملک کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر اس پر پڑنے لگی ہے اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی طرف سے دورے کی دعوت اور محبت وقدر کے پیام آرہے ہیں، میں آپ سے ایک صحافتی انٹرویو کی ضرورت سمجھتا ہوں، تاکہ اس کے اصل محرکات ومقاصد لوگوں کے سامنے آجائیں۔

اس کام کا آپ کو کیسے خیال پیدا ہوا؟ جب کہ آپ کا اصل مزاج علمی وفکری ہے، اور مطالعہ و تصنیف (جس کے لیے سکون اور گوشہ نشینی کی ضرورت ہوتی ہے) آپ کی زندگی کا پسندیدہ مشغلہ ہے؛ جو جہاں تک مجھے علم ہے، آپ کو وراثت میں بھی ملا ہے، اور ماحول نے بھی اس کو تقویت اور

(۱) سیوان کے جلسہ میں بیس ہزار سے زائد مسلم وغیر مسلم شریک ہوئے، اس جلسہ میں کی گئی تقریر 'جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ تحریک پیام انسانیت کے قیام کے بعد اس کے جلسوں میں کی گئی تقریروں کے مجموعہ 'انسانیت کی مسیحائی' (شائع کردہ سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی) میں بھی یہ تقریر شامل ہے۔

غذا پہنچائی ہے۔ یہ کام سب سے پہلے آپ نے کب شروع کیا؟ کیا یہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا، یا اس میں کچھ وقفے بھی آئے؟

جواب: مجھے اگر چہ صحافتی انٹرویو سے بہت کم مناسبت ہے، اور عام طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن پیام انسانیت کی تحریک کے اس مرحلہ پر نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ کسی درجہ میں اس کی ضرورت اور افادیت بھی محسوس کرتا ہوں۔ بعض غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو رفع کرنے کے لیے بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے پس منظر، محرکات ومقاصد اور اس کے طریق کار پر روشنی ڈالی جائے۔

تحریک پیام انسانیت کے قیام اصل محرک

سوال: سب سے پہلے تو میں اپنی وہ بات دہراؤں گا کہ آپ کے لیے اس تحریک کا اصل محرک اور باعث کیا تھا؟

جواب: یہ بالکل فطرتی اور قدرتی امر ہے کہ آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا جس میں اس کو رہنا ہے، اور جہاں اس کی عزیز متاع اور زندگی کی پونجی ہے، اور جس کے بنانے اور سنوارنے پر اس کی اور اس کے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں۔ یہ ہر سلیم الفطرت بلکہ صحیح الفطرت انسان کا خاصہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے، اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاخ پر اس کا نشیمن ہے، عقل وہوش کی موجودگی میں نہ اس پر خود تیشہ چلا سکتا ہے، اور نہ کسی کو تیشہ چلانے کی اجازت دے سکتا ہے۔

روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ یہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی؛ بلکہ قومی واجتماعی خودکشی کی طرف جا رہا ہے، اخلاقی قدریں بے دردی کے ساتھ پامال کی جا رہی ہیں، خودغرضی بلکہ خود پرستی کا جنون (ان افراد کو مستثنیٰ کر کے جن پر مذہب واخلاق کی کسی وجہ سے گرفت مضبوط ہے، یا جو زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہیں) سب پر سوار ہے، انسان کی جان ومال، عزت وآبرو کا احترام تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے، حقیر شخصی فوائد کے لیے اجتماعی وملکی مفاد کو آسانی سے قربان کر دیا جاتا ہے، کام چوری، احساس ذمہ داری کا فقدان، رشوت خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، بے عنوانی یہ سب اسی درخت کے پھل ہیں، اور انھوں نے پوری زندگی کو عذاب بنا دیا ہے، اور ان کی

وجہ سے ملک کے آزاد اور بااختیار ہو جانے کے بعد بھی اس میں جینے اور آزادی سے فائدہ اٹھانے کا مزہ نہیں رہا۔

یہ خرابیاں اور کمزوریاں انگریزوں کے زمانے میں بھی تھیں؛ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے دورِ اقتدار اور نظامِ تعلیم کو ان کے پیدا کرنے یا ان کو ترقی دینے میں بڑا دخل ہے؛ لیکن ایک بدیشی جابر طاقت، چوکس انتظامیہ اور مجبوری و بے اختیاری نے ان کو بہت کچھ دبا رکھا تھا، ہانڈی کے اوپر سے اس سرپوش کے اٹھ جانے سے یہ خرابیاں ابال اور بھاپ کی طرح نکل پڑیں، آزادی کی جنگ اور بدیشی جوئے کو اتار پھینکنے کی مصروفیت نے قومی تعمیر اور کردار سازی کی مہلت نہیں دی، ملک تو آزاد ہو گیا لیکن ضمیر اندر سے غلام تھا، برطانیہ یا کسی غیر ملکی طاقت کا نہیں، بلکہ ہوئی و ہوس، دولت و قوت، عزت و اقتدار اور تنگ نظری و تنگ دلی کا۔

اتنے بڑے ملک کے نظم و نسق اور سیاسی پارٹیوں کی باہم کشمکش اور کرسیٔ اقتدار کی حفاظت نے اس کی مہلت نہ دی (اور چند کو مستثنیٰ کرکے) ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ذہن میں اس کی کچھ اہمیت بھی نہ تھی کہ وہ عوام سے رابطہ پیدا کرکے ان کے دل و ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کریں، ان کی اخلاقی حس کو تیز اور متحرک کریں، اور جو باتیں ملک کے لیے حقیقی خطرہ بنی ہوئی ہیں، ان کی طرف متوجہ کریں۔ بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی و بے اثری کا پورا علم و احساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلا تفریق مذہب و ملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا، کہ جب کسی محلّہ یا گاؤں میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا، گونگے بھی چلا اٹھتے ہیں، اور اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں۔

تصنیفی، تالیفی اور دعوتی مشغولیتوں کے باوجود تحریک پیامِ انسانیت کا قیام کیوں کیا؟

سوال: قبل اس کے کہ میں آپ سے یہ سوال کروں کہ آپ نے اوّل اوّل اس کام کی دعوت کب دی تھی؟ میں آپ سے اس سوال کی اجازت چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے لیے اس کی گنجائش نہ تھی کہ آپ اپنے تصنیف و تالیف کے کام اور ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ کی خدمت و ترقی میں مصروف رہتے؟ آپ شروع سے ''تبلیغی جماعت'' کے ایک اہم داعی، ترجمان اور اس کے مقاصد کے شارح اور مبلغ رہے ہیں، اور آپ کو اس جماعت کے خلوص و مقبولیت، اس کے

وسیع اور ہمہ گیر اثرات پر اب بھی اطمینان ہے، پھر جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ ہندوستان کے کئی اہم تعلیمی و تصنیفی اداروں کی انتظامی کمیٹیوں کے رکن بھی سالہا سال سے چلے آرہے ہیں، آپ پوری یکسوئی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے اسلاف اور بزرگوں اور استادوں کی طرح ان اداروں کی خدمت میں مصروف رہ سکتے تھے۔ میرے نزدیک کوئی شخص بھی جو آپ کے طبعی مذاق، صحت کی کمزوری اور خاندانی گوشہ پسندی سے واقف ہے، آپ کو ملامت نہ کرتا، اور نہ اس سلسلے میں آپ کا گریباں گیر ہوتا۔

جواب: آپ نے بڑا اچھا سوال کیا، اور بڑی خوبی سے میرے لیے اپنے علمی کاموں میں انہماک اور اپنے میدانِ عمل کے انتخاب کے لیے عذر تلاش کرلیا، لیکن میں اپنے اس اندرونی یقین اور بدیہی حقیقت کو کیسے نظر انداز کردوں کہ کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی و تعمیری کاموں کے لیے (خواہ وہ کتنے مقدس، ضروری اور مفید ہوں) شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل (Normal) حالات ہوں۔ جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو، وہاں تعلیمی و تعمیری کاموں کے لیے دماغی سکون اور ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہوسکتا ہے؟ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں، اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں؛ لیکن جہاں پر فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں پر اعصابی (ہسٹیریا) کے دورے جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت وقوت کے سوا کوئی حقیقت زندہ اور مسلم نہ مانی جاتی ہو، اور جیسا کہ میں نے ابھی سیوان کی تقریر میں کہا تھا کہ

> ''یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا عمارت پر بجلی گر جائے، نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے، کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہوکر انسانوں کی جان لے لے، اس لیے کہ یہ سب بے شعور و بے ضمیر چیزیں ہیں؛ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی کسی پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے، جیسا کہ جمشید پور، راوڑکیلا اور رانچی میں ہوا، ایک ہی کالج میں پڑھانے والا استاد دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے، طالب علم طالب علم کی مخبری کرے، اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے۔''

اور یہ دورے کسی بھی وقت معاشرہ پر پڑ سکتے ہیں، اورلوگ معمولی بات پر اپنا دماغی توازن کھو سکتے ہیں، وہاں کسی تعلیمی وتعمیری کام یا ادارے کے بقا کی ضمانت کب تک دی جاسکتی ہے؟ اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے کیا سکتا ہے؟ بقولِ میر ؔ ع

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب وشاعری اور فنونِ لطیفہ اور اقبالؔ کے الفاظ میں ''لذت کردار'' اور ''جرأت اندیشہ'' کی بھی کیا گنجائش ہے؟

اور یہ تو ملک گیر اور وسیع پیمانہ کے حوادث ہیں، جہاں سوسائٹی اتنی مسخ (Corrupt) ہو جائے کہ کسی کو رشوت دیے بغیر نہ اس کا حق ملے، نہ ریل پر وہ آرام سے سفر کر سکے، نہ طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوں، نہ استاد پڑھانے کی طرف، انتظامیہ کے تمام شعبے بے عمل اور سست ہوں، پورے ملک میں وقت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، سفر غیر محفوظ اور قیام مخدوش ہو جائے، وہاں اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں افراد کے لیے اپنے اصولوں پر قائم رہنا کب تک ممکن ہے؟

تحریک پیام انسانیت ملک کی تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں کے لیے حصار کی حیثیت رکھتی ہے

اس بنا پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیامِ انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے، اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی، اس لیے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت وتحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ کم سے کم اس کی حیثیت وہ ہے جو کسی فراش یا سقہ، یا زمین برابر کرنے والے، یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی بھی جلسہ یا اجتماع ہوسکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو یا تعلیمی بحث ومذاکرہ کا۔

ملک کی کشتی

سـوال: اب مجھے پوچھنے کی اجازت دیجیے کہ اس بھرے پُرے ملک میں، جس میں

اکثریت غیر مسلموں کی ہے، آپ ہی نے کیوں اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اس دعوت کو لے کر کھڑے ہوں؟ اور کسی کا انتظار کیے بغیر میدان میں آئیں؟

جواب: آپ کا سوال بالکل حق بجانب ہے؛ لیکن آپ خود صاحبِ علم ہیں، اور قرآن وحدیث اور سیرت نبویؐ پر آپ کی نظر ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان خالص اپنے مذہب کے رو سے بھی اس کا ذمہ دار ہے کہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر خطروں سے آنکھیں بند نہ کرلے، اور ''سب خیریت ہے'' کا سبق نہ دہرائے۔ مسلمان کو ہر جگہ بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا حکم ہے۔ اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ زندگی کی جس کشتی پر سوار ہے، وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی، اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت حال کے لیے جو مثال دی ہے، اس سے بہتر مثال کم سے کم مجھے مذہبی و اخلاقی لٹریچر میں نہیں ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ایک کشتی پر کچھ لوگ بالائی منزل پر سوار ہیں، اور کچھ نیچے کی منزل پر، میٹھے پانی کا انتظام اوپر ہے، نیچے والے مجبور ہیں کہ اوپر جاکر پانی لائیں، اور اپنی پیاس بجھائیں۔ پانی گرتا اور چھلکتا ضرور ہے، کشتی کے ''بالانشینوں'' کو اس سے کچھ تکلیف ہوئی، اُنھوں نے روک ٹوک کی، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر انسان کا گزارا نہیں، اگر اوپر والے پانی نہیں لینے دیتے تو ہم نیچے کے حصے میں سوراخ کرلیں گے، اور وہیں بیٹھے بیٹھے دریا سے پانی حاصل کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اوپر والوں میں ذرا بھی سمجھ ہے تو وہ ان کو ایسا کرنے سے روک دیں گے، اور پانی لے جانے کی اجازت دے دیں گے، اگر اُنھوں نے ایسا نہ کیا، اور کشتی میں سوراخ ہوگیا، تو نہ اوپر والے بچیں گے نہ نیچے والے۔''

بس ہم سب اسی کشتی کے سوار ہیں، یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے، اگر خدانخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے، نہ کتب خانے، نہ مقدس اور خدارسیدہ افراد، نہ عالم و فاضل، نہ بزرگ۔

تحریک پیام انسانیت - اندیشے اور خطرات

سوال: کیا آپ کو تحریک شروع کرتے وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ مسلمانوں کے اس اخلاقی سدھار کی قیادت کی آواز لگانے اور اس کا جھنڈا ہاتھ میں لینے سے برادرانِ وطن میں بدگمانیوں کا ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا، اور مسلمانوں کو اس کے ذریعہ سیاسی مقاصد کے پورا

کرنے کا الزام دیا جائے گا؟

جواب: جی ہاں! یہ خطرات تو تھے، لیکن خطرات اور اندیشوں کی بنا پر کوئی ضروری کام چھوڑا نہیں جاسکتا۔ جب کام شروع کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ دلوں اور دماغوں کے دروازے بند نہیں ہیں، اور جب کوئی کسی آتش زدہ محلے یا گاؤں میں صدا لگاتا ہے: ''آگ لگی ہے! آگ لگی ہے!'' تو کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ صدا لگانے والے کا مذہب کیا ہے؟ میں اس موقع پر اپنی ایک پرانی تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جو ۵۴-۵۵ء کی ہے:

''عالم انسانی کی ایک ضرورت یہ ہے کہ اغراض وتعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد و بے تعلق ہوکر، عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرے سے دوچار اور موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ یہ حقیقتیں اپنے اپنے زمانے میں پیغمبروں نے بیان کی تھیں، اور ان کے لیے سخت جدوجہد کی تھی، یہ حقیقتیں اب بھی زندہ ہیں، لیکن سیاسی تحریکوں، مادی تنظیموں اور قومی خود غرضیوں نے گرد و غبار کا ایسا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ یہ روشن حقیقتیں ان کی اوٹ میں اوجھل ہوگئی ہیں، لیکن انسانی ضمیر ابھی مردہ، اور انسانی ذہن ابھی مفلوج و معطل نہیں ہوا ہے۔ اگر پوری بے غرضی، پورے یقین اور پورے خلوص کے ساتھ ان حقیقتوں کو عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں بیان کیا جائے، تو یہ انسانی ضمیر و ذہن اپنا کام کرنے لگتا ہے، اور بڑی گرم جوشی سے ان حقیقتوں کا استقبال کرتا ہے، اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تقریروں میں اس کے دل کی ترجمانی اور اس کے درد کا مداوا ہے۔''

آپ نے کم سے کم بھوپال کے صدر منزل، لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال[1]، آگرہ کے سینٹ جارج کالج ہال، اندور کے ٹیگور ہال،[2] بہرائچ کے ٹاؤن ہال اور چنڈی گڑھ، جے پور، جونپور اور ناگپور کے عظیم جلسوں میں غیر مسلم بھائیوں کا گہرا تأثر اور ان کے ذوق وشوق کی کیفیت دیکھی ہے۔

---

(۱) لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں کی گئی تقریر 'اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے' کے عنوان سے شائع ہوئی، یہ تقریر بھی 'انسانیت کی مسیحائی' میں شامل ہے۔

(۲) اندور کے ٹیگور ہال میں کی گئی تقریر بعنوان: 'ذرائع کی افادیت نیک مقاصد پر منحصر ہے' کتاب 'انسانیت کی مسیحائی' میں شامل ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں میں موجودہ صورت حال سے بے اطمینانی، بیزاری کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ تاریخ کا مسلسل تجربہ ہے کہ ایسے موقع پر وہ لوگ تو کم تعداد میں ہوتے ہیں جو اس صورت حال سے پنجہ آزمائی کے لیے میدان میں آجائیں، لیکن وہ لوگ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں جو اس صورت حال کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں، یا کم سے کم دل سے اس کو پسند کرتے، ان کے حق میں کلمۂ خیر کہتے، یا دل سے دعا دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر کسی فرد یا جماعت کا میدان میں آنا شرط ہے، اگر کوئی میدان میں آنے کے لیے تیار نہ ہو تو حالات کا یہ دھارا اسی رخ پر بہتا رہتا ہے، اور یونان وروما کی شاندار تہذیبوں کی طرح وہ تہذیب یا معاشرہ بھی زوال کا شکار اور تاریخ کا قصۂ ماضی بن کر رہ جاتا ہے۔

سوال: کیا آپ اس سوال کا جواب دینا پسند کریں گے کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ بھی اس دعوت وتحریک سے کچھ فائدہ پہنچے گا؟

جواب: آپ نے ذرا نازک سوال کیا ہے، میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہنچے، اور ملک کو فائدہ پہنچ جائے، جب بھی ان کو یہ کام کرنا چاہیے، وہ اپنے دین ومنصب کے لحاظ سے اس کے لیے مامور ہیں، اور ملک کے ہر فائدے میں شریک، لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے اس ملک میں باعزت طریقے پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں، اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پر کریں جو عرصۂ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت وضرورت اور بے لاگ و بے غرض قیادت ودعوت کے بغیر عزت واطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، اقبال نے صحیح کہا ہے:

زندگی جہد است، استحقاق نیست

تحریک پیامِ انسانیت کا آغاز

سوال: اب مختصراً یہ بتا دیجیے کہ آپ نے یہ کوشش کب شروع کی تھی؟ اور اس میں تسلسل یا کوئی وقفہ بھی پیش آیا؟

جواب: یوں تو میں نے تقسیم اور ملک آزاد ہو جانے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ، اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین اور رسائل کے ذریعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون

''ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجیے،،[1] کے عنوان سے نکلا تھا، جس کا ہندی انگریزی ترجمہ میں نے اس وقت ملک کے تقریباً تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں اور وزرائے اعلیٰ کو بھیجا تھا۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ کوشش ۱۹۵۴ء کے آغاز میں شروع ہوئی، اس سلسلہ کی پہلی تقریر جس سے اس مہم کا آغاز کیا گیا، ۹ رجنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال، لکھنؤ میں ایک ایسے اجتماع میں کی گئی، جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی۔ اس زمانہ میں تبلیغی دوروں کے ساتھ اس جزو کو شامل کیا گیا تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی مشرقی اضلاع کا ایک دورہ کیا گیا، جس میں جونپور، غازی پور، مئو اور گورکھپور میں بڑے بڑے ملے جلے اجتماعات ہوئے، اس دورے کی تقریریں ایک مجموعہ میں جمع کر دی گئی ہیں، جس کا نام ہی ''پیامِ انسانیت'' ہے، اس سلسلے کا دوسرا نمبر ''مقامِ انسانیت'' کے نام سے شائع ہوا،[2] لیکن کچھ ہی دن کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اس کو تبلیغی دوروں کے ساتھ ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہوگا، ادھر یہ احساس غالب آنے لگا کہ ایسی تقریروں کے لیے جن احتیاطوں اور رعایتوں کی ضرورت ہے، ان پر سب کو قدرت نہیں، اس لیے ان تقریروں کا بوجھ زیادہ تر اس ناچیز پر اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی پر تھا، اور جہاں ہم نہ ہوتے وہاں اس طرح کا کوئی اجتماع بھی نہ کیا جاتا۔

ادھر میرے بیرونی ملک کے سفر پیش آنے لگے، کہ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہی مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت آئی، اور میں کئی مہینے کے لیے ملک سے باہر رہا۔ وہاں سے آنے کے بعد اپنے دوسرے تصنیفی و علمی مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے ساری عمر اس کا قلق رہے گا کہ یہ سلسلہ کیوں نہ جاری رکھا گیا۔ میں اس کو اپنی ایک اخلاقی کوتاہی سمجھتا ہوں، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس پر ہمارا محاسبہ نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو رفقاء بھی تیار ہو جاتے اور ملک کی فضا پر بھی اس کا ضرور اثر پڑتا۔ اس طویل وقفہ کے بعد دسمبر ۱۹۷۴ء کو الٰہ آباد سے پھر اس مہم کا آغاز کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری ہے۔[3]

---

(۱) یہ مضمون علاحدہ رسالہ کی شکل میں مکتبہ اسلام، لکھنؤ سے فروری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا، اب یہ حضرت مولانا کی کتاب 'اصلاحیات' میں بعنوان: 'اپنے سماج کی جلد خبر لیجیے' شامل ہے۔

(۲) مخلوط اجتماعات میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ بعنوان 'تعمیر انسانیت' سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی سے شائع ہوا ہے۔

(۳) تحریک پیام انسانیت کے قیام کے بعد اس کے جلسوں میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ بعنوان 'انسانیت کی مسیحائی' سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی سے شائع ہو چکا ہے۔

تحریک پیام انسانیت اور وحدت ادیان کا غلط اندیشہ

سوال: اب دو سوالات میں اور کرنا چاہتا ہوں، آپ نے اپنی علالت اور تکلیف کے باوجود اتنے تفصیلی جوابات دیے، اور یہ انٹرویو میرے اندازہ اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا، میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اس تحریک سے بعض حضرات کو بعض خدشات ہیں، ان میں سب سے بڑا خدشہ یہ ہے کہ کہیں اس سے وحدتِ ادیان کا فتنہ پیدا نہ ہو، آپ اس سلسلے میں کوئی وضاحت مناسب سمجھتے ہوں تو فرمائیں!

جواب: اس کا سارا انحصار داعیوں کی نیت، ان کے یقین وعزم اور ان کے دعوت پیش کرنے کے طریقہ پر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں شروع سے وحدتِ ادیان کا مخالف اور وحدتِ حق کا قائل ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہی میں نے اس پر مضامین لکھنے شروع کیے، اور ہر اس چیز کی مخالفت شروع کی جس سے مسلمانوں میں کسی دوسری تہذیب یا دعوت میں تحلیل ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں میں اپنے دو رسالوں کا تذکرہ کروں گا، جن کا تعلق علی الترتیب ڈاکٹر سمپورنانند (وزیرِ اعلیٰ ریاست اتر پردیش) اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن (صدر کانگریس اور اسپیکر یوپی اسمبلی) کی بعض تقریروں اور مضامین سے تھا۔ ایک کا عنوان ''مسلمان اور ہندوستانی پوروج''،(۱) اور ایک کا نام ''مذہب یا تہذیب''(۲) ہے۔

درحقیقت یہ تحریک وحدتِ ادیان کی نہیں، وحدتِ انسان کی ہے۔ اس لیے ہم ان تقریروں میں اس سے امکانی حد تک احتیاط برتتے ہیں کہ ان میں مذہب کی دعوت دی جائے۔ ہم صرف اخلاق، خدا ترسی، انسان دوستی اور اخلاقی اور شہری شعور کی دعوت دیتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ اس غیر مسلم اکثریت کے ملک میں اس ''حلف الفضول'' کی ایک تقلید ہے جو بعثت سے قبل مکہ معظمہ میں ایک انجمن یا معاہدہ کی شکل میں قائم ہوا تھا، جس کے اہم دفعات یہ تھے کہ ''ہم ملک سے بے امنی دور کریں گے، مسافروں کی حفاظت کریں گے، غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے، زبردست کو

---

(۱) یہ رسالہ 'مسلمان اور ہندوستانی پوروج - ایک اہم اصولی بحث' کے عنوان سے نومبر ۱۹۶۱ء میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس کا عربی ترجمہ موقف المسلم إزاء أسلافه الجاهليين کے عنوان سے شائع ہوا۔

(۲) یہ مضمون حضرت مولانا کی کتاب 'اصلاحیات' میں شامل ہے۔

زیردست پر ظلم کرنے سے روکا کریں گے۔'' آنحضرت ﷺ اس میں شریک تھے، اپنے نبوت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام سے کسی کو مدد کے لیے بلائے تو میں سب سے پہلے اس کی امداد کو تیار پایا جاؤں گا۔

ہر کام کے لیے معتدل حالات کی ضرورت ہوتی ہے

سوال: اب میرا آخری سوال یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس تحریک کا ہندوستان کی دوسری دینی کوششوں سے تصادم نہ ہو جائے یا یہ تحریک ان کو کچھ نقصان نہ پہنچائے جو عرصۂ دراز سے جاری ہیں، اور جن کے اثرات اور فوائد روز روشن کی طرح واضح ہو چکے ہیں؟

جواب: میں اس کو ''اندیشۂ دور دراز'' سے زیادہ وقعت نہیں دیتا، اس لیے کہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ تحریک سب کے لیے مفید و معاون، اس کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، جس کے بغیر کوئی تحریک سکون واطمینان کے ساتھ اپنا عمل نہیں کر سکتی ہے۔ ہر کام کے لیے معتدل (Normal) حالات کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ضرورت ہے کہ دماغ اپنا توازن نہ کھوئیں، طبیعتوں میں اشتعال، برہمی اور بے جا بدگمانیاں نہ پائی جائیں، ان میں بات سننے کا موڈ اور اچھی بات کی قدر کی صلاحیت ہو، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک یہ مقصد پورا کرتی ہے۔

جہاں تک تصادم اور ٹکراؤ کا تعلق ہے، تو ٹرین ٹرین سے لڑ سکتی ہے، موٹر موٹر سے ٹکرا سکتی ہے؛ لیکن ٹرین اور کشتی یا جہاز میں کوئی ٹکر نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ ایک خشکی پر چلتی ہے، دوسری پانی میں۔

''تحریک پیامِ انسانیت'' کے مخاطب بلا تفریق مذہب وملت ملک کے تمام باشندے ہیں۔ اس کا موضوع انسانیت اور اخلاق ہے۔ اس کا مقصد اس ملک کے رہنے والوں میں زندگی کا سلیقہ اور شہریت کا احساس پیدا کرنا ہے۔

آخر میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ میں ان حضرات کو اس تحریک میں شامل کرنے کے بارے میں کتنا محتاط ہوں، جو دوسری دینی، دعوتی وتبلیغی تحریکات میں شامل ہیں، ان کے بارے میں مطمئن ہیں، اور مفید کام کر رہے ہیں، بلکہ عام طور پر ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے کام میں پورے

انہماک کے ساتھ لگے رہیں۔اس کے بعد بھی اگر کسی کو مخالفت یا تصادم کا اندیشہ ہے،تو آپ کو معلوم ہے کہ وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا اور قلوب کی حفاظت کرنے والا ہے۔فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ.

ہندوستانی مسلمانوں میں دینی شعور کی بیداری اور ان میں شرعی و عائلی قانون پر عمل کرنے کی دعوت و تبلیغ

اوّلین اور اہم ترین کام

۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے محمد احمد خاں بنام شاہ بانو کیس میں نہ صرف یہ کہ مطلقہ کے لیے تاحیات یا تا نکاح ثانی شوہر پر نفقہ لازم کیا، بلکہ قرآن کریم کی من مانی تفسیر اور تشریح کی، اور ایسا مطلب بیان کیا کہ جو اسلامی تاریخ میں کسی نے نہیں بیان کیا تھا، اور احادیث رسول، آثار صحابہ اور فقہ اسلامی کے بالکل خلاف اور شریعت میں کھلی مداخلت تھا۔ اس نے ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور اس کو اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری، اور غیرت و خودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلہ پر لا کھڑا کیا۔ مسئلہ کی اہمیت اور وقت کی اس اہم ترین ضرورت کے تحت مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی ازہری (استاد دار العلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ) نے حضرت مولاناؒ سے یہ تفصیلی انٹرویو لیا، جو "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا، بعد میں علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی بعنوان: 'تحفظ شریعت کے لیے مسلمانوں کا اتحاد- ان کی بیداری کا پیش خیمہ' شائع ہوا۔

[تحفظ شریعت کا مسئلہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ ہے، سیاسی و معاشی پس ماندگی، سرکاری ملازمتوں سے محرومی، فرقہ وارانہ فسادات، تعلیم میں مشرکانہ عقائد کے بعد اب نکاح وطلاق جیسے خالص خانگی امور میں بھی اسلامی شریعت پر عمل کو ختم کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں، مسلم پرسنل لا پر ہر طرف سے ہونے والے جارحانہ حملوں نے مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو مجروح کررکھا ہے، حکومت کے مبہم ومشکوک رویہ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے اس ملک میں اسلام کے مستقبل کو مخدوش بنادیا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ مسلمان بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر حالات کو مزید خراب کرنے پر تلے نظر آرہے ہیں، اور کچھ لوگ مسلسل نیش زنی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں، ان حالات نے ذہن کو اس طرف متوجہ کیا کہ حالات کی نزاکت، مسئلہ کی اہمیت اور وقت کی اہم ترین ضرورت کے بارے میں تحفظ شریعت مہم کے سربراہ کے افکار وخیالات سے براہ راست روشنی حاصل کی جائے، اسی خیال سے ادارہ صحافت اسلامیہ کی جانب سے جناب نذر الحفیظ صاحب ندوی کچھ سوالات لے کر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت مولانا پریشان کن حالات سے دوچار تھے، قیام گاہ سیلاب سے گھری ہوئی تھی، کشتی کے علاوہ باہر سے کوئی رابطہ نہیں تھا، چاروں طرف سے امنڈتے پانی کی لہریں گھر کی دہلیز سے ٹکرا رہی تھیں، ان سخت حالات کے باوجود مولانا نے ملت اسلامیہ کے لیے خطرات کی امنڈتی لہروں اور مسلمانوں کے دلوں کے زخموں کی طرف توجہ دینا ضروری سمجھا، اور سوالات کے جوابات تفصیل سے دیے، جنھیں انھیں کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نور عظیم ندوی]

۲رصفر ۱۴۰۶ھ

۱۶راکتوبر ۱۹۸۵ء

مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے اسباب

سوال: آپ نے اپنے سیاسی خیالات، علمی ودینی مشاغل کی سرگذشت اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق بعض ایسے اہم انٹرویو دیے ہیں جو اس ملک میں ملّی اور دعوتی جدو جہد کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر قلم اٹھانے والا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا، مثال کے طور پر فروری ۱۹۷۱ء میں ''ندائے ملت'' کے لیے آپ نے 'آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت'، اس کے بعد 'تحریک پیامِ انسانیت' کے متعلق تفصیلی انٹرویو دیے[1] جن سے بہت سے حقائق آشکارا ہوئے۔ اب پھر آنجناب کو ایک ایسے مسئلہ پر بعض وضاحتوں کی زحمت دینا چاہتے ہیں، جس نے کچھ عرصے سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، ہماری مراد مسلم پرسنل لا سے ہے، لیکن مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض اہم مسائل پر گفتگو سے قبل ہم اس بورڈ کی صدارت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت، اپنے مخصوص مزاج اور غیر معمولی علمی ودعوتی مصروفیات، نیز سابقہ روایات کے خلاف کیوں قبول کی؟ جب کہ اس سے پہلے (جہاں تک ہمیں یاد ہے) مسلم مجلس مشاورت کی صدارت آپ نے ڈاکٹر سید محمود جیسی محترم شخصیت کے اصرار پر بھی قبول نہیں فرمائی۔ آخر اس کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: آپ نے ایک اچھی تمہید کے ساتھ جس نے مجھے واقعات کی بعض بھولی ہوئی کڑیاں یاد دلادیں، اور ایک مناسب انداز کے ساتھ مجھ سے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی صدارت قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ میری افتادِ طبع، خاندانی روایات اور مشاغل کی نوعیت سے جو لوگ واقف ہیں، ان کو اس بارے میں ضرور ایک تضاد سا

---

(۱) یہ دونوں انٹرویوز پیش نظر کتاب میں شامل ہیں۔

محسوس ہوتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اجتماعی اور تنظیمی کاموں میں سے دو سب سے اہم کام

جن لوگوں کو میرے مضامین ورسائل اور کم سے کم سرگذشت حیات ''کاروانِ زندگی'' پڑھنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی اور تنظیمی کاموں میں سے دو کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس کی ہے، اور یہ ملتِ اسلامیہ کی روح، مزاج، اس کے مقاصد وپیغام سے کسی قدر واقفیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے:

ا:- ایک ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ نسل کے ایمان وعقیدے کی حفاظت، اور ان کے معنوی اور روحانی تسلسل کو برقرار رکھنے اور نہ صرف ذہنی اور تہذیبی بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی ارتداد سے بچانے کے لیے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام، اور ان کی طرف اسلامی ورثے کی منتقلی، اور ان کو اس کا حامل ومحافظ بنانے کی جدو جہد۔

۲:- دوسرے اس ملت کو ہندوستان جیسے ملک میں (جو مذاہب، تہذیبوں اور قومیتوں کا گہوارہ ہے) اپنے ملی تشخص کے ساتھ اور ایک ایسی صاحبِ شریعت ملّت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی جدوجہد، جس کا رشتہ آسمانی تعلیمات اور الٰہی قانون کے ساتھ استوار ہے، اور جس کے یہاں دین کا مفہوم عقائد وعبادات کے دائرے میں محدود نہیں، پوری زندگی پر حاوی ہے، اور جو اپنا مستقل عائلی (خاندانی) نظام وقانون رکھتی ہے، جو اس کے دین کا جزو اور کتاب وسنت کے صریح احکام وہدایات پر مبنی ہیں، اور ایک مسلمان کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اس احساس وشعور اور فکر ومطالعہ کا نتیجہ ہے کہ جب ۱۹۵۹ء کی آخری اور ۱۹۶۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت پر بستی میں صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی، اور اجلاس کی صدارت کا قرعۂ فال میرے نام نکلا، تو میں نے اس کو بلا تردد قبول کرلیا، پھر جب اس کی مستقل صدارت کے لیے میرا انتخاب ہوا، تو میں نے ادائے فرض کے اسی احساس سے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اور ابھی تک اس کو ایک سعادت وعبادت سمجھ کر، اور کم سے کم ہندوستان میں اس کو ایک اہم خدمت باور کر کے اس ذمہ داری کو نبھا رہا ہوں۔

مشترک عائلی قانون کا خطرہ

یہی حال ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے مسئلہ کا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، وہ حکومت کا یہ رجحان اور خود مسلمانوں کے ایک تجدد پسند اور آزاد خیال گروہ کا یہ مطالبہ تھا، کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (Uniform Civil Code) ہو کہ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہوسکتی۔ یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعہ کی شکل میں سامنے آنے لگا، خود حکومت کے بعض محتاط، لیکن معنی خیز بیانات وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہنچاتے تھے، خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا تھا، جو ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی و معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ [المائدة: ٤٤] (اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام

اس خطرے کا احساس جن لوگوں کو ہوا، واقعہ یہ ہے کہ ان میں مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب (امیر شریعت بہار واڑیسہ) پیش پیش تھے، انھوں نے بروقت رہنمائی کی اور اس کے خلاف ایک منظّم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ طے ہوا کہ ۲۷-۲۸/ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن بلایا جائے۔ میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اس سال رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے (جو ماہ ذیقعدہ میں ہوا کرتا تھا) حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرۃً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا؛ لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم لوگوں نے ایسے وقت ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا، جب حج میں صرف پندرہ، بیس دن باقی تھے، اور بمبئی کنونشن میں شرکت کی۔ یہاں اس ادارہ کے قیام کی تاریخ اور تفصیلات کو بیان کرنا مقصود نہیں، صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

ایک یہ کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی، جیسی اس کنونشن کے موقع پر نظر آئی۔ دوسرے یہ کہ اس اجلاس کے نتیجہ میں ایک '' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی تشکیل عمل میں آئی، جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم

(مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔

قاری صاحب مرحوم (جن کو اللہ تعالی نے ایک دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی) کی صدارت کی موزونیت پر تقریباً سب کا اتفاق تھا۔ رانچی کے سالانہ اجلاس (۱۹۷۷ء) کے موقع پر صدارت میں تبدیلی کا مسئلہ زور شور سے اٹھا، بعض حلقوں کی طرف سے میرا نام پیش کیا گیا، لیکن میرے اس کہنے پر سب خاموش ہوگئے کہ "طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی۔"

میرے لیے اس کا ایک بڑا محرک یہ بات بھی تھی کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسا باوقار اور ہردل عزیز صدر ملنا مشکل ہے، اور "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" جیسے مشترک ادارہ کی صدارت کے لیے وہی موزوں ہیں؛ لیکن ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اس جہان فانی سے رحلت کی اور ان کی جگہ خالی ہوگئی۔ اس سال ۲۸-۲۹ر دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کا سالانہ اجلاس کا ہونا طے پایا، میں اپنے بعض بیرونی پروگراموں اور خرابیِ صحت کی بنا پر اس سے پہلے کے عاملہ کے بعض اجلاسوں میں شرکت نہیں کرسکا تھا، اس اجلاس میں شرکت کا عزم مصمم تھا اور سفر کے سب انتظامات کر لیے گئے تھے کہ عین موقع پر مجھ پر نقرس (Gout) کی تکلیف کا (جس کا میں پرانا مریض ہوں) شدید حملہ ہوا، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں ایسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا کہ چارپائی سے اترنا بھی مشکل تھا، مجبوراً سفر کے اِلتوا کا فیصلہ کرنا پڑا۔

اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لیے پیش کیا گیا، جو لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں، انھوں نے یہ کہا کہ وہ صرف اسی صورت میں منظور کرسکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے، مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا۔ جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو "سنگ آمد و سخت آمد" کا مضمون تھا، یہ فیصلہ میری افتادِ طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں رکھتا تھا؛ لیکن اگر یہ کسی بھی سیاسی ملی تنظیم اور باعث افتخار و اعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا، تو میں بلا ادنیٰ تردد کے انکار کردیتا؛ لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت و اہمیت کی وجہ سے جس کو میں اپنے عقیدہ کا جز اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لیے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں، دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بنا پر، جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں، چار و ناچار اس کو قبول کرنا پڑا۔ دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت

بورڈ کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی، نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں، بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے، جو شاید اس سے پہلے پیش نہیں آئے، اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم وعزم، ملت کے نظم وضبط، علماء دین وماہرین قانون کے علم ومطالعہ، ذہانت وتدبر اور عوام کے انقیاد واطاعت، صبر وتحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض وتسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ میرا اشارہ خاص طور پر ''نفقۂ مطلقہ'' کے بارے میں سپریم کورٹ کے اس ہنگامہ خیز فیصلہ کی طرف ہے، جو ۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء میں دیا گیا، اور جس نے ملت کو اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور غیرت وخودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلے پر لا کھڑا کردیا۔ تقدیر الٰہی کی یہ کارفرمائی (جس کی حکمتوں کو کوئی نہیں جانتا) کہ یہ نازک وفیصلہ کن مرحلہ (جو اگر کامیابی کے ساتھ گزار لیا گیا اور ملت نے اس میں فتح حاصل کرلی، تو عرصۂ دراز تک کے لیے ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا عائلی قانون عدالتوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائے گا) [1] مجھ ناتواں کے دور صدارت میں پیش آیا، جو سخت جسمانی جدوجہد، قوت برداشت اور فرصت وفراغت کا طالب ہے۔ شاید یہ بات غیرتِ الٰہی اور رحمتِ الٰہی دونوں کو حرکت میں لانے کا باعث بن جائے، جن کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے قائدین اور اولوالعزم مصلحین بھی کوئی

(۱) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک اور جدوجہد کے نتیجہ میں حکومت ہند نے ۶/مئی ۱۹۸۶ء کو قانون حقوق مسلم مطلقہ ۱۹۸۶ء پاس کر کے سپریم کورٹ کے فیصلہ کو رد کردیا، اور اسلامی قانون نفقہ جاری کیا، اس مطلقہ بل کے سلسلہ میں جس کا تعلق صرف مسلم مطلقہ عورتوں سے تھا، نیشنل پریس یعنی انگریزی وہندی اخبارات نے مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کردیا، اور بقول مولانا علی میاں انگریزی وہندی اخبارات نے اس قانون کی اس انداز سے مخالفت کی کہ گویا کوئی غیر ملکی طاقت ہندوستان پر حملہ کرنے والی ہے، نہ صرف یہ بلکہ حکمراں جماعت کی بہت بڑی اکثریت بھی اس قانون کے خلاف تھی، لیکن وزیر اعظم نے اپنا منصب داؤں پر لگا کر اس قانون کو پاس کیا، اگرچہ قانون مسلم مطلقہ پاس ہوگیا، لیکن پھر بھی اس پر مکمل عمل درآمد میں کچھ قانونی پیچیدگیاں ہیں، جن کو حل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: 'مسلم پرسنل لا بورڈ - خدمات اور سرگرمیاں' (شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، صفحہ ۱۲-۱۶)

کامیابی حاصل نہیں کرسکتے ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ [آل عمران: ۱۲۶] (نصرت تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔)

سوال: کیا مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بورڈ کی اب تک کی کارگزاری پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: آپ کو معلوم ہے کہ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا اجلاس عام گذشتہ مارچ ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں ہوا تھا۔ بورڈ کے جلسہ میں اس کی سابقہ روایات کے مطابق مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی مکمل نمائندگی تھی، اور تقریباً تمام مسلم جماعتیں اور تنظیمیں اور مکاتبِ فکر اور مذہبی فرقے شامل تھے، میرا خطبہ زبانی تھا جو اردو اور انگریزی میں چھپ گیا ہے اور جس میں مسئلہ کی نوعیت و اہمیت پر اصولی اور علمی اور حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔[1] آخری اجلاس ''شہید مینار چوک'' میں ہوا جس میں محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ انسان تھے۔ میں نے ضرورت سمجھی کہ اس میں خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کیا جائے، اور خود ان کا دینی اور علمی احتساب کیا جائے کہ وہ قانونِ خداوندی پر خود کتنا عمل کرتے ہیں؟ اُنھوں نے اس کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا غیبی اور اخلاقی اثر کیا پڑ رہا ہے؟ یہ خطبہ بھی چھپ گیا ہے۔[2]

اس کے بعد دہلی میں عاملہ کے دو اجلاس ہوئے (پہلا اجلاس ۱۴ر مئی اور دوسرا اجلاس ۱۰ر جولائی کو دہلی میں ہوا)، جس میں وزیر اعظم راجیو جی سے بورڈ کے ایک نمائندہ وفد کا ملنا طے ہوا۔ اس وفد میں تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کے سربرآوردہ اور ذمہ دار ترین افراد شریک تھے۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۵ء کو وفد نے وزیر اعظم کو یادداشت پیش کی اور اس کے بعد ایک مفصل نوٹ جو بہت غور و فکر اور مشورہ اور تبادلۂ خیال کے بعد مرتب ہوا تھا، پیش کیا گیا؛ جس میں ان کے لیے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پورا مواد اور ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں، اور یہ کہ اب ان کے لیے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کون سا دستوری اور عملی آسان راستہ ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا اور کہتا چلوں کہ میں نے بحیثیت صدر کے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے راجیو جی سے کہا کہ راجیو جی! میری عمر اب ۷۲-۷۳ سال کی ہو رہی ہے، میں نے آپ کے نانا موتی لال جی کو بھی دیکھا ہے، اور ان کی تقریر امین آباد پارک (لکھنؤ) میں سنی ہے، اور جواہر لال

(۱) یہ خطبہ بعنوان ''مسلم پرسنل کی صحیح نوعیت و اہمیت'' آفس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مونگیر نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

(۲) یہ خطبہ بعنوان ''شرعی عائلی قوانین پر عمل کرنے کے بارے میں مسلمانوں کا غیر جانبدارانہ احتساب اور دعوت فکر و عمل'' آفس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مونگیر نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

جی اور اندرا جی کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کا اچھا زمانہ پایا ہے۔ لکھنؤ میں رہنے اور خاص طرح کے خاندانی اور تعلیمی ماحول کی وجہ سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی سے لے کر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی جس کا میں نے قریب سے مطالعہ نہ کیا ہو، اور اس کے اثرات نہ دیکھے ہوں۔ میں اپنی اس طویل واقفیت کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی مسئلہ پر کم سے کم مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال، سیاسی جماعتوں، پارٹیوں اور تنظیموں اور افراد کا ایسا مکمل اتفاق دیکھنے میں نہیں آیا جیسا کہ اب مسلم پرسنل لا کے تحفظ پر عمومیت کے ساتھ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے خلاف خصوصیت سے دیکھنے میں آرہا ہے۔

راجیو جی نے یہ باتیں غور سے سنیں اور ان پر کوئی جرح نہیں کی، پھر دوسرے معزز ارکان وفد نے، جن میں جناب غلام محمود بنات والا، سید شہاب الدین اور الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ زیادہ نمایاں تھے، مسئلہ پر روشنی ڈالی اور پر مغز طریقہ پر اس کی وکالت کی۔

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' نے جب رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کو ''یوم تحفظ شریعت'' منانے کا فیصلہ کیا، تو پورے ملک میں بڑے وقار و احترام اور کسی نعرے بازی اور ہنگامہ کے بغیر یہ دن منایا گیا، مساجد میں تقریریں کی گئیں، اور وزیر اعظم اور وزیر قانون کو احتجاجی ٹیلیگرام کثرت سے روانہ کیے گئے کہ اس سے پہلے شاید ایسا ہوا ہو۔

اسی طرح جب تحفظِ شریعت کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلمانوں کے مختلف مسلک رکھنے والی جماعتوں اور مکاتبِ فکر نے تحفظِ شریعت کا ہفتہ منانے میں کسی جماعتی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اُنھوں نے اس موقع پر مکمل ہم آہنگی، اِتحاد، جذبۂ تعاون اور ملی غیرت و حمیت کا ایسا ثبوت دیا ہے اور دے رہے ہیں، جس کی تمنا عرصہ سے تھی، اور اگر یہ کہوں تو بے جا بات نہ ہوگی کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ نے مسلمانوں کے اندر اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کا ایسا کام کیا جو شاید بڑی جدوجہد کے بعد بھی اس طرح انجام نہ پایا ہوتا۔

تحفظ شریعت کا ہفتہ بہار و اڑیسہ اور یوپی میں منایا جا چکا، دوسری ریاستوں میں باقی ہے، ہر جگہ جلسے غیر معمولی طور پر کامیاب رہے، اور سالہا سال کے بعد مسلمانوں میں وہ جوش و خروش، جلسوں میں حاضرین کی تعداد اور کام کرنے والوں میں ہم آہنگی دیکھنے میں آئی، جس کا مشاہدہ برسوں سے نہیں ہوا تھا۔ کانپور کے جلسہ میں لوگوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کے درمیان تھا، مراد آباد میں بھی ہزاروں کی تعداد تھی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ اپنے مخصوص موضوع ومقصد (تحفظ شریعت)، مشترک عائلی قانون کی مخالفت کے علاوہ مسلمانوں میں عام بیداری کا سبب بن جائے گا، اور ان کو اندازہ ہوجائے گا کہ وہ کسی مسئلہ پر متفق ہوکر اپنی زندگی کا ثبوت دے کر کتنے بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اور کتنے بڑے خطرات سے اپنے کو بچاسکتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی دو بڑی کمزوریاں

سوال: مسئلہ کے اس روشن پہلو اور افادیت کے ساتھ جو ہر مسلمان بلکہ محب وطن کے لیے تسلی بخش ہے، آپ کو اس سلسلہ میں سب سے بڑا خطرہ کیا محسوس ہوتا ہے؟ آپ نے نہ صرف ہندوستان کی؛ بلکہ امت اسلامیہ کی علمی، فکری، اصلاحی اور تجدیدی تاریخ لکھی ہے، اور آپ نے عالم اسلام کا رباط ومراکش سے لے کر سری لنکا وبنگلہ دیش تک کا سفر کیا ہے، اور ان ملکوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ اور خطرات سے ہوشیار کیا ہے۔ ہم آپ سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس سفر میں (جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے) سب سے زیادہ دشوار گزار گھاٹی کون سی ہے، جس سے آپ زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہیں؟

جواب: آپ نے یہ سوال کرکے میرے دل ودماغ کے داغِ کہن تازہ کردیے اور ''ناگفتنی'' کو ''گفتنی'' بنادیا۔ مجھے اب یہ ناخوش گوار فرض انجام دینا ہی پڑے گا کہ بقول اقبالؔ

چمن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

مجھے سب سے زیادہ خطرہ (جواب خطرہ نہیں رہا، بلکہ مشاہدہ بنتا جارہا ہے) مسلمانوں کی ان دو کمزوریوں یا بیماریوں سے ہے، جو دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حد تک ملی مزاج بنتا جارہا ہے: ایک عجلت وبے صبری، وہ یہ کہ مسئلہ کتنا ہی طویل المیعاد، صبر آزما اور پیچیدہ ہو، یہاں کے مسلمان ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے قائل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جو مہم صبح شروع ہوئی ہے وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کامیاب ہوجانی چاہیے، اور بیل منڈھے چڑھ جانی چاہیے۔

مسائل کو کامیابی سے حل کرنے میں ایک بڑا فیکٹر (Factor) صبر وتحمل، قوت برداشت اور بلند حوصلگی ہے۔ مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں، تمام زندہ وفاتح قوموں کی تاریخ (خود سیرت نبوی جس سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی اسوہ اور نمونہ نہیں) تلخ وشیریں، سرد وگرم، نشیب وفراز کے

مناظر کا مجموعہ، اور ایک طویل، صبر آزما، زہرہ گداز جدوجہد کی روداد ہے۔ تحریکات اور مہمات کی تاریخ بھی ہمیں یہی سبق دیتی ہے، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برخلاف ہر معرکہ کو چٹکیوں میں فتح کر لینے کا قائل ہے۔

ابھی ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں میں بمبئی میں تھا، وہاں مہاراشٹر مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایکشن کمیٹی کا جلسہ تھا، مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا، سنجیدہ اور تعمیری انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، اور ''ہفتہ تحفظِ شریعت'' منانے کے لیے ضروری اقدامات پر غور کیا جارہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے ایک مضمون پڑھنا شروع کیا کہ زندہ قوموں اور ملکوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی جماعت کسی مسئلہ کے حل کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتی ہے اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے، اتنی طویل مدت ہوگئی اور مسلم پرسنل لا بورڈ مسئلہ کو حل نہیں کرسکا، اس لیے اس کو اب اپنی ناکامی کا اقرار کر لینا چاہیے اور دوسروں کو کام کا موقع دینا چاہیے۔

یہ سن کر میرے اندر اپنی افتادِ مزاج کے برخلاف سخت تأثر پیدا ہوا اور میں نے کہا کہ یہ ایک مریضانہ ذہنیت کی علامت ہے، آپ نے برادرانِ وطن کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے؟ انھوں نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں نیز اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل میں کتنے صبر وتحمل سے کام لیا اور اپنے رہنماؤں کو کام کرنے کا کتنا طویل موقع دیا؟ گاندھی جی ہوں یا مالوی جی یا دوسرے ہندو سیاسی لیڈر اور قومی معمار، انھوں نے کتنے سکون واطمینان قلب کے ساتھ کام کیا، دو ہی دن بعد قوم نے ان کا دامن جھٹکنا اور گریبان پکڑنا نہیں شروع کیا، مسلمان کو تو صبر وتحمل کا زیادہ عادی ہونا چاہیے کہ ان کا صحیفہ اور ان کے نبی کا اسوہ اور خدا کی قدرت کاملہ پر یقین ان کو زیادہ وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیتا ہے، مگر افسوس ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔

مسلمانوں کی دوسری کمزوری جواب ایک نیشنل کیرکٹر کا رنگ اختیار کر گئی ہے، وہ اپنے قائدین کے بارے میں بے اعتمادی، بدگمانی، شدید احتساب، بے ضرورت تنقید اور کردار کشی ہے۔

پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برادرانِ وطن کا اپنے سیاسی، تعلیمی، تعمیری رہنماؤں اور سماجی کام کرنے والوں کے بارے میں رویہ بالکل مختلف ہے۔ اپنے رہنماؤں سے بلند اخلاقی معیار، ہر شک وشبہ سے بالاتر دیانت کی توقع، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تصورات کے عین مطابق ہے؛ لیکن اس میں اس حد تک افراط وغلو کہ ہر کام بدگمانی سے شروع کیا جائے، اور ہر قائد

وخادم ملت کو بے اعتمادی اور بے توقیری کی نظر سے دیکھا جائے اور اس پر بڑے سے بڑا الزام لگانے میں پس وپیش نہ کیا جائے، اس کے بارے میں بعید از قیاس سے بعید از قیاس بات کو فوراً باور کرلیا جائے، افواہ پھیلانے اوران کو مان لینے میں ذرا بھی احتیاط وتأمل سے کام نہ لیا جائے، ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو پورے شیرازۂ ملت کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے اور بڑے سے بڑے شیر دل، کوہ وقار اور پاکباز و پارسا خادم دین اور بڑے بڑے طوفانوں میں کشتیٔ ملت کے سرپھرے ملاح کا دل توڑ دینے اوراس کی ہمت پست کردینے کے لیے کافی ہے، وہ دشمنوں کی اذیتوں، قید و بند کی سزاؤں، بچوں اور افرادِ خاندان کے فاقے کو برداشت کرسکتا ہے اور اس کی پیشانی پر شکن نہیں آسکتی، لیکن اتہام والزام، کردار کشی اور ملت کا غدار بنائے جانے سے اس کا دل چور چور ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک بڑھیا کو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے ٹوکنے، اعرابی کو سوال پوچھ لینے کی روایات کو ہمارے قومی جلسوں اور مجالسِ وعظ میں ایسے مبالغے اور بے اعتدالی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص نے اس کی تقلید شروع کردی ہے، چاہے امیر المؤمنین فاروق اعظم کے مقام کا آدمی نہ ہو، لیکن پوری قوم بڑھیا اور اعرابی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے۔ اکثریتی فرقہ کا اپنے رہنماؤں اور قومی کارکنوں کے بارے میں رویہ واضح طور پر اس کے برعکس ہے۔ اپنی دوسری کمزوریوں کے باوجود وہ نمایاں طور پر اس سلسلہ میں محتاط، فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

[**سوال:** ایک بات اور پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں، اس لیے کہ ایک اردو اخبار میں - جو کچھ زیادہ ذمہ دار اور محتاط نہیں لیکن بہرحال ایک حلقہ میں پڑھا جاتا ہے- یہ بات کہی گئی ہے کہ شاہ بانو کے کیس میں -- جس نے یہ سارا مسئلہ پیدا کیا، اور ملت اسلامیہ ہندیہ کو تحفظِ شریعت کے بارے میں سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے- سید شہاب الدین صاحب نے اس مستعدی اور ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان سے توقع تھی اور جس کا وہ معاوضہ وصول کرتے تھے۔ مقدمہ کی پیروی اس اہتمام، بیدار مغزی اور قابلیت کے ساتھ نہیں کی گئی جس کی ضرورت تھی، اور اس میں ان کی کوتاہی کو دخل ہے۔ اخبار نے یہ بات آپ کے کسی معتمد کے حوالہ سے کہی ہے اور اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔

جواب: یہ بات بھی اسی مریض ملی مزاج کی کمزوری کا ایک نتیجہ ہے جس کا میں نے ابھی رونا رویا ہے۔ ملی مزاج کی یہ کمزوری اور غیر ذمہ دارانہ روش بلکہ ناخداترسی جب صحافت کی سطح پر آجائے تو اور خطرناک ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کے پھیلنے کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ میں سید شہاب الدین صاحب سے سالہا سال سے واقف ہوں، وہ جب Foreign Service میں تھے، پھر جب وہ سعودی عرب میں ہندوستانی سفارت خانہ کے فرسٹ سیکریٹری تھے، اس وقت سے واقف ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاندانی شرافت، فطری ذہانت، قانونی قابلیت اور انگریزی خطابت وتحریر کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی ہے، بورڈ نے ان کی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہا اور جب وہ پارلیمنٹ کی مصروفیت سے آزاد ہوئے، تو یادداشتوں کی ترتیب، مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کو انگریزی میں ممبران پارلیمنٹ اور ماہرین قانون کے سامنے پیش کرنے میں ان کی ذہانت، تجربے اور خلوص نے فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کیے، اور انھوں نے ہمیشہ یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ خود مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے کہ میں نے بعض اہم خطوط ان سے ڈرافٹ کروائے، رسالہ مسلم انڈیا (Muslim India) ان کی انفرادی صحافتی وقانونی صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔

حقیقت میں اس مقدمہ کی پیشی میں بعض اضطراری واقعات پیش آئے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ جن دو مقدموں کے بعد، جن کا تعلق غیر مسلم فریقین سے تھا، اس کو پیش ہونا تھا، وہ ملتوی ہو گئے اور اچانک مقدمہ کا نوٹس دیا گیا۔ جس نامور اور تجربہ کار پارسی وکیل کو پیروی کے لیے طے کیا گیا تھا، اور انھوں نے اس کا وعدہ بھی کر لیا تھا، انھوں نے عین موقع پر معذرت کر دی، دوسرے فاضل مسلمان وکیل جن کا تعلق غالباً کیرالہ سے تھا، ان کا کچھ ہی پہلے انتقال ہو گیا۔ اس تھوڑے وقت میں جو کچھ کیا جا سکتا تھا وہ کیا گیا، لیکن فیصلہ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے اور ہر عمیق نظر انسان دیکھ سکتا ہے کہ جج پہلے سے گویا بھرے بیٹھے تھے، اور ان کو اسی انداز میں یہ فیصلہ کرنا تھا۔ اس میں سید شہاب الدین صاحب کی کوئی غلطی نہیں، وہ خود سپریم کورٹ میں بحث نہیں کرتے تھے اور نہ انھوں نے پیروکاری کی۔ مجھے افسوس ہے کہ ایک اخبار کی اس غیر ذمہ دارانہ روش سے ہمارے ایک لائق اور مخلص قومی کارکن کی پوزیشن خراب ہوئی اور مجھے اپنی عادت وروایت کے خلاف اس تفصیل کے ساتھ اس کی تردید کرنی پڑی۔] [1]

---

(۱) اضافہ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۵ء)

ایک اہم ضرورت

سوال: مسلمانوں میں سے بعض ''معروف'' اشخاص نے ''تجاہل عارفانہ'' سے کام لیا ہے، اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے اس جزو کی حمایت کی ہے کہ مطلقہ کو سابق شوہر کی طرف سے (جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے) حین حیات گزارہ دیا جائے، تو اس میں کیا حرج ہے؟ اور اگر اس کا حکم شریعت میں نہیں ہے، تب بھی اس کو مان لیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے، کہ قانون شریعت کوئی چھوئی موئی نہیں ہے کہ ایسی چیزوں سے ٹوٹ جائے، اور اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم بھی ہو جاتی ہے تو بھی کوئی بڑی مصیبت نہیں آتی، یہ ائمہ کے اجتہادات ہیں جو وہ ہر زمانہ میں کرتے آئے ہیں، اور ائمہ کو بت نہیں بنانا چاہیے، نیز انھوں نے قرآن مجید میں ''متاع'' کے لفظ کی تشریح میں اور مطلقۂ بائنہ کو عدت کے بعد بھی گزارہ دینے کو قرآنی سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔ ان کے بارے میں ہمارے علمائے دین اور خاص طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقتدر اراکین جو ہندوستان کے عظیم ترین مذہبی تعلیمی اداروں کے سربراہ وذمہ دار ہیں، فتوی کی زبان کیوں نہیں استعمال کرتے، اور ان پر فقہی حکم لگا کر مسلم معاشرے سے کیوں نہیں خارج کرتے، تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی جرأت سے کام نہ لیں؟

جواب: آپ نے ایک معقول بات پوچھی ہے، بورڈ کے دوسرے اہلِ علم ارکان اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہیں، لیکن میرا ذاتی رجحان اور مشورہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اور ہمارے مذہبی اداروں کو اس عہد اور اس ملک میں مسیحی یورپ کے قرون وسطی۔ جس کو قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کی طرح اعتقادات کی تحقیق کی عدالتوں (Courts of Inquisition)، جن کو عربی کتابوں میں "مَحَاکِمُ التَّفْتِيْشِ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کا کردار ادا کرنا مناسب نہیں جو اپنے نزدیک بد اعتقاد عیسائیوں کو دائرۂ عیسائیت سے خارج کیا کرتی تھیں اور ان کو لرزہ خیز سزائیں دیتی تھیں، اور جن کی وجہ سے یورپ میں ایک طبقہ کلیسا سے بیزار اور عیسائیت سے متنفر ہو گیا۔

میرے خیال میں اس کے مقابلہ میں ہمیں مسلم معاشرہ میں وہ دینی شعور بیدار کرنا چاہیے جو خود ان تجدد پسندوں یا برخود غلط ''فقیہوں'' اور ''مفسروں'' کا محاسبہ کرے، اور ان کو محسوس کرائے کہ انھوں نے اپنے کو مسلم معاشرہ سے خود کاٹ لیا ہے اور فتنہ کا ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا ہے۔ معاشرہ کا یہ طرز عمل ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے اور (اگر ان میں ذرا بھی ملی

غیرت ہے) تو اپنی روش اور طرزِ عمل کی غلطی محسوس کرادینے کے لیے کافی ہے، اور وہ یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ اس مسلم معاشرہ میں ایک فردِ معاشرہ کی طرح رہنا اچھا ہوگا، جس کے ساتھ مرنا اور جینا ہے اور جو دکھ سکھ میں کام آتا ہے، یا اس عارضی عزت، تعریف وتعارف کا خیال کرنا جو ڈھلتی چھاؤں اور بے وفا ساتھی ہے۔

سوال: ایک آخری سوال کی اور اجازت چاہتا ہوں جو اپنی اہمیت اور افادیت میں پچھلے سوالات سے کم نہیں، اور میرے خیال میں بہت سے حساس اور حقیقت پسند مسلمان اور دانشور طبقہ کے ذہن میں یہ سوال گشت کرتا ہے؟

جواب: وہ سوال بھی ضرور کرلیجیے، تاکہ مسئلہ کا کوئی اہم پہلو تشنہ نہ رہے۔

اولین اور اہم ترین کام

سوال: آپ کے نزدیک اس مسئلہ اور اس اہم دینی وملی مہم کے سلسلے میں اب کرنے کے کام کیا ہیں؟ اور آئندہ کا نظامِ عمل کیا ہوگا؟

جواب: آپ نے بہت ضروری اور برمحل سوال کیا، اس انٹرویو میں بڑی کمی رہ جاتی اگر یہ گوشہ سامنے نہ آتا۔

۱۔ میرے نزدیک اوّلین اور اہم ترین کام خود مسلمانوں میں شرعی عائلی قانون پر عمل کرنے کی دعوت وتبلیغ ہے، جس کے اہم اور مرکزی اجزاء حقوق الزوجین، اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنا، شفقت ومحبت اور قرآنی الفاظ میں ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ [الروم: ۲۱] کے اصول پر ایسی ازدواجی وعائلی زندگی گزارنا جس میں مودّت ومحبت اور رحمت کا عنصر غالب ہو، صلہ رحمی، ترکہ کی شرعی تقسیم، طلاق کے حق کا نہ صرف شرعی بلکہ مسنون طریقہ پر استعمال ہو، اور ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ﴾ [النساء: ۱] (اور اس اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو) کی اس ہدایت قرآنی پر عمل، جو تمام انسانی، اسلامی واخلاقی پہلوؤں اور گوشوں پر حاوی ہے، اس کے لیے ایک طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے جس کے اثر سے شہر تو شہر، کوئی قصبہ اور گاؤں اور مسلمانوں کا کوئی محلّہ اور خاندان بھی بے خبر اور بے اثر نہ رہے، اس کے لیے مساجد کے منبر ومحراب کی طرح مجالسِ وعظ،

اسلامی اجتماعات وتقریبات، اخبارات ورسائل اور ابلاغ عامہ کے سارے ذرائع پوری سرگرمی سے استعمال ہونے چاہئیں۔

میرے نزدیک یہ بنیادی کام ہے، اور ان میں ان مشکلات اور خرابیوں کا اصل علاج ہے جنھوں نے اس وقت ایک نازک مسئلہ کی صورت اختیار کرلی ہے، اور اللہ تعالی کا وعدہ ہے: ﴿إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَاناً وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾ [الأنفال: ۲۹] ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالی سے ڈرتے رہوگے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے دے گا، اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا۔''

میں نے کلکتہ کے آخری اجلاس میں، جس میں حاضرین کی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ کیا گیا ہے، صفائی سے اس معاملہ میں مسلمانوں کا احتساب کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ وہ خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں اور اپنے گھروں کا جائزہ لیں کہ وہ اس شرعی قانون وتعلیم (جو دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے) پر کس قدر عمل کرتے ہیں؟ ضرورت ہے کہ اس خطبہ ومقالہ کی اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

۲۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اور ملک کے دانشور اور حقیقت پسند غیر مسلموں کو اسلام کے عائلی نظام کی برتری، اس کے منصفانہ، عقل سلیم اور فطرت انسانی کے مطابق ہونے کو (جو خدائے حکیم ودانا، رؤوف ورحیم اور خالقِ کائنات اور مربیِ نوع انسانی کا بنایا ہوا ہے) علمی انداز، ناقابل تردید دلائل، اور مذاہب اور عائلی قوانین اور نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ انگریزی، اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں پیش کیا جائے، یوں تو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (ندوۃ العلماء، لکھنؤ)، مرکزی پرسنل لا آفس (مونگیر)، مکتبہ جماعت اسلامی ہند (دہلی) اور بعض دوسرے تصنیفی وتحقیقی اداروں کی طرف سے متعدد وقیع چیزیں شائع ہوچکی ہیں؛ لیکن اس میں وسعت، ترقی اور اضافہ کی ضرورت ہے۔

اس موضوع پر صاحبِ نظر وصاحبِ ایمان ماہرین قانون اور اہلِ قلم سے کتابیں لکھوائی جائیں، سیمینار، سمپوزیم منعقد کیے جائیں، جن میں ممالک عربیہ کے چوٹی کے فضلاء وماہرین فقہ اسلامی کو دعوت دی جاسکتی ہے، اور میں بھی رابطہ عالم اسلامی کی اَلْمَجْمَعُ الْفِقْهِيُّ (مسائل وتحقیقات کی اکیڈمی) کا بنیادی رکن ہونے کی بنا پر اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو لبیک کہیں گے اور شوق سے شرکت کریں گے۔ اس سلسلے میں اس موضوع پر نیز دوسرے ملی

مسائل پر ڈائلاگ (Dialogue) کا انتظام کرنا بھی مفید ہوگا، اور بعض اہل فکر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور بھی کررہے ہیں۔

۳۔تیسری اور ایک بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر چہ بائنہ کو عدّت کے بعد سابق شوہر سے قانونی طور پر مستقل گزارہ دلانا، جس کو (Maintenance) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، شرعاً، عقلاً کسی طرح درست نہیں۔شرعاً تو اس لیے کہ قرآنی نصوص واحکام اور امت کے تعامل کے مطابق اس کی گنجائش نہیں، انتظاماً اس لیے کہ پھر اس کے بعد مسلم معاشرہ میں بھی سفاکی اور بے دردی کے وہ واقعات رونما ہوں گے، جو ملک کے ایک وسیع معاشرہ (سماج) میں پیش آرہے ہیں، اورنئی بیاہی ہوئی عورتیں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر جلائی جارہی ہیں، اوران سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جارہا ہے۔میں نے وزیراعظم صاحب سے اپنی ایک نجی گفتگو میں صفائی سے کہا تھا کہ راجیوجی !اگر یہ قانون بن گیا تو لکھ رکھیے کہ بجائے طلاق کے ذریعہ پیچھا چھڑانے کے ایسی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات کوزہردے کر، یا جلاکرختم کیا جائے گا، جیسے آج ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ہورہا ہے۔

نفقۂ مطلقہ کی اس مستقل قانونی شکل (گزارہ) کوچھوڑکر،ہمیں شریعت کے بتائے ہوئے ان متبادل انتظامات کوزندہ اورقائم کرنا پڑے گا،جن کی شریعت نے ترغیب دی ہےاور جوشریعت اسلامی کی برکات میں سے ہیں، مثلاً عورت کو والدین اور دوسرے مورو ثین کے ترکہ سے شرعی حصہ دلانا، جوبعض شکلوں میں واجب ہے،اور بہت سے خاندانوں اور معاشروں میں عرصہ سے متروک ہے، مطلقہ کے قریبی رشتہ داروں (ذوی الارحام) اولاد، بھائیوں اوراگر والدین زندہ ہوں تو ان کواس کے ساتھ اعانت ومواسات (ہمدردی وغمخواری) اورصلہ رحمی کی ترغیب دینا، اس کی کفالت کا مناسب بندوبست کروانا، اگر نکاح ثانی کی عمراور حالات ہیں تو اس کی ترغیب و تحریض، نیز اسلامی بیت المال کا قیام جس سے نادار اور ضرورت مند افراد کوضروریات زندگی اور قُوت مالایموت فراہم کیا جائے۔

اس سے بڑھ کر پورے مسلم معاشرہ میں ہمدردی، سلوک، ایثار وفیاضی کا جذبہ پیدا کرنا، جو ہزار بیماریوں کا علاج ہے،اور ہزار مشکلات ومسائل کا حل، اور جومسلم معاشرے کو وضعی قوانین سے مستغنی کرتا ہے،اور صدر اول اوراسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس کی تابناک مثالیں ہیں اور اس کا زندہ ثبوت ملتا ہے۔

یہ ہیں کرنے کے وہ کام جن کو جلد سے جلد شروع ہو جانا چاہیے، اور جو اسلام کی روح، مزاج اور شریعت الٰہی اور تعلیمات آسمانی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں، اور انھیں میں شریعت کا اصل تحفظ اور اس ملک و عہد میں مسلمانوں کے ایک صاحبِ شریعت، صاحبِ کردار اور صاحب مقام مستحکم و باعزت، خوددار اور غیوّر ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔

مسلم پرسنل لا اور جدید تقاضے

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کی وفات کے بعد ۲۷-۲۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو منعقد بورڈ کے پہلے اجلاس میں حضرت مولاناؒ کو بورڈ کا بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد یکم مارچ ۱۹۸۴ء کو دارالعلوم، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں بورڈ کی تشکیل شدہ مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ اسی موقع پر ''قومی آواز'' کے نمائندہ حسین امین نے بورڈ کے نومنتخب صدر حضرت مولاناؒ سے یہ انٹرویو لیا، جس میں مولانا نے مسلم پرسنل لا کے بارے میں بعض اہم سوالات کے جوابات دیے۔ یہ انٹرویو بعد میں ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر مارچ ۱۹۸۴ء) میں بھی شائع ہوا۔

سوال: آپ بورڈ کے کاموں کو کس طرح چلائیں گے؟ کیا ابھی تک جس طرح کام ہوا ہے، اس سے آپ مطمئن ہیں، یا اس طریقۂ کار میں کوئی تبدیلی پسند کریں گے؟

جواب: خدا کا شکر ہے کہ بورڈ کو اس کے ابتدائے قیام سے ہی بڑے مخلص، بیدار مغز اور فعال کارکن مل گئے، خاص طور پر اس کے جنرل سکریٹری (جنرل سکریٹری ہی پر زیادہ تر کسی ادارہ یا تحریک کے چلانے کا دارومدار ہوتا ہے)؛ اس لیے اس کے چلانے کے طریقوں میں تو کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں؛ کیونکہ وہ پہلے ہی سے بہت صحیح طریقوں (جنرل سیکریٹری کی فعال اور بیدار مغز قیادت اور بورڈ کے مخلص ممبران کے گراں قدر مشوروں) سے چل رہا ہے۔ اس لیے اب تک کی بورڈ کی کارکردگی سے نہ صرف میں، بلکہ ہر مخلص جو واقف ہے، پوری طرح مطمئن ہے، اور اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے بھی توقعات بجا طور پر قائم کی جاسکتی ہیں۔ یوں کسی وقت جزوی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، تو بورڈ کے عہدیداران وممبران، جن میں پورے ملک کے منتخب اور ممتاز علماء اور اہل الرائے شامل ہیں، کے مشوروں سے کی جاسکتی ہے۔ اور ایسی جزوی تبدیلیاں کرنا ہر زندہ اور متحرک ہیئت و جماعت کے لیے بعض اوقات ضروری ہوتا ہے۔

مسلم پرسنل لا کے تئیں حکومت کا رویہ

سوال: پرسنل لا کے بارے میں حکومت کی طرف سے ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ ایسی صورت میں غیر سرکاری لوگوں کے بیانات پر اتنی توجہ کیوں دی جاتی ہے اور اندیشے محسوس کیے جاتے ہیں؟ خود حکومت کے رویے کے بارے میں بورڈ کا کیا ردعمل ہے؟

جواب: حکومت اگرچہ یقین دہانی کراچکی ہے کہ پرسنل لا میں مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی؛ لیکن حکومت کے حلقہ سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد کی

طرف سے بکثرت ایسے بیانات آئے دن دیے جاتے رہے ہیں کہ ان سے بجا طور پر مسلمانوں کو ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ حکومت رائے عامہ کو پرسنل لا کے خلاف ہموار کرنے اور چند نام نہاد مسلمانوں (پروگریسیو مسلمانوں) کے خیالات کو مسلمانوں کی مرضی قرار دے کر پرسنل لا میں تبدیلی کے لیے میدان تیار کر رہی ہے۔ اور کبھی تو غیر سرکاری ہی نہیں، سرکاری لوگ بھی بعض ایسے بیانات پارلیمنٹ تک میں دیتے ہیں کہ جن سے ان شبہات کو تقویت پہنچ جاتی ہے۔ متبنّٰی بل کے سلسلہ میں اقلیتی کمیشن کے چیرمین کی رائے پر نائب وزیرِ قانون کا کچھ عرصہ قبل دیا جانے والا بیان اس کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے، جس سے مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ جانا قدرتی ہے۔ چنانچہ وہ مضطرب ہوئے اور اُنھوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ خود میں نے بھی اس موقع پر بیان دے کر اسی کا اظہار کیا تھا۔

کیا مسلم پرسنل لا کو کلیۃً شرعی قانون کہہ سکتے ہیں؟

سوال: کیا مسلم پرسنل لا کو کلیتاً شرعی قانون کہہ سکتے ہیں؟ یہ قانون انگریزوں نے وضع کیا تھا، کیا آپ اس سے بالکل مطمئن ہیں؟

جواب: مسلمانوں کے لیے پوری زندگی کے واسطے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا قانون موجود ہے، جس پر عمل کرنے کا ہر مسلمان از روئے عقیدہ پابند ہے۔ زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات نکاح، فسخِ نکاح، طلاق، وراثت، ہبہ، وصیت وغیرہ (جنھیں پرسنل لا کہا جاتا ہے) بھی اس میں شامل ہیں۔ انگریزی دورِ حکومت میں مسلمانوں سے ان کی پوری زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق قانون شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق تو جبراً چھین لیا گیا تھا، البتہ مسلمانوں کی قربانی و کوششوں کی بناء پر صرف چند معاملات (نکاح و طلاق وغیرہ) میں اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کا قانونی حق دے دیا گیا تھا، اسی کا نام عدالتی زبان میں ''مسلم پرسنل لا'' ہوگیا۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ ''مسلم پرسنل لا'' انگریزوں کا وضع کیا ہوا قانون نہیں ہے؛ بلکہ انگریزی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی زندگی سے متعلق چند گوشوں میں - جن کا ذکر اوپر آیا - اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا قانونی حق جو ان کو دیا گیا تھا، اس کو ''مسلم پرسنل لا'' کہا جاتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ''مسلم پرسنل لا'' قانون شریعت کا ایک حصہ ہے، نہ کہ کل شریعت۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد مسلمانوں کو اپنی آزاد حکومت سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کو ان کی پوری زندگی سے متعلق قوانین شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا قانونی حق دے گی، مگر بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس (یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے خطرے سے) انگریزی دورِ حکومت میں ملے ہوئے حق کو بچانے کی فکر میں مسلمانوں کو مبتلا ہو جانا پڑا، اور اسی کے لیے بورڈ کی تشکیل کرنا پڑی، اس وجہ سے پوری زندگی سے متعلق قوانین شریعت کا نفاذ تو گویا بعید از قیاس بن کر رہ گیا اور اس کے بارے میں سوچنا بھی اب تقریباً ناممکن ہو گیا۔

کسی مسلم ملک کی حکومت یا فرد کا رویہ و تشریح ہرگز حجت نہیں

سوال: پاکستان میں عائلی قانون (Family Law) بنا ہے، اس کے تحت مرد کو لامحدود طاقت نہیں دی گئی ہے، اور اس قانون کے تحت طلاق دینا آسان بات نہیں ہے، اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: پاکستان کے عائلی قانون کی تفصیل میرے سامنے نہیں، لیکن اتنا یاد پڑتا ہے کہ پاکستان کے ایک سابق صدر جنرل ایوب خان نے جب وہاں شرعی عائلی قانون میں بعض ایسی تبدیلیاں کرنا چاہیں جو شریعت اسلامیہ سے متصادم تھیں یا اس سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھیں، تو وہاں علمائے حق نے متفقہ طور پر اس کی مخالفت کی اور اس بارے میں بڑا گراں قدر علمی و فکری لٹریچر پیش کیا؛ جس سے ایک طرف تعلیم یافتہ طبقہ کی عائلی قانون شریعت کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہوئیں اور دوسری طرف عوام بیدار ہوئے۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ نکلنا تو واضح ہے کہ ایوب خاں وہ سب کچھ نہیں کر سکے جو کرنا چاہتے تھے۔ اگر اب بھی پاکستان کے یا کسی اور مسلمان ملک کے قوانین میں ایسی بات ہے جو قانون شریعت سے متصادم ہے یا پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے، تو ہم ہندوستانی مسلمان ان ملکوں کو اپنے لیے نمونہ بنانے کے لیے تیار نہیں، اور جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہم اسلام کے وفادار ہیں اور قرآن و سنت کو حجت سمجھتے ہیں، کسی مسلم ملک کو یہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں، اور ہم ہندوستانی مسلمان بالخصوص علماء، قانون اسلامی کی تشریح و تفہیم کا حق بھی کسی دوسرے مسلمان ملک کے کسی فرد یا عالم سے کم نہیں سمجھتے۔ اس لیے ہمارے نزدیک کسی مسلمان ملک کی حکومت یا فرد کا رویہ و تشریح ہرگز حجت نہیں۔

اسلامی شریعت میں ہر قسم کے استحصال و ناانصافی کا خاتمہ کردیا گیا ہے

سوال: کیا ایسا کچھ ہوسکتا ہے کہ عورتوں کی مجبوری سے مرد فائدہ نہ اٹھا سکیں؟

جواب: ہمارا یہ احساس اور یہ عقیدہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ہر قسم کے استحصال و ناانصافی کا خاتمہ کردیا گیا ہے، اور اس میں عورتوں کے حقوق کی زبردست وکالت کی گئی ہے، ان کو صحیح مقام دیا گیا ہے، اور ان کے شایانِ شان فرائض سپرد کیے گئے ہیں، اور مرد کے صرف مرد ہونے یا عورت کے صرف عورت ہونے کے بسبب حقوق و فرائض میں غیر منصفانہ کمی و زیادتی، یا ناروا ترجیح و رعایت نہیں کی گئی ہے۔ قرآن و حدیث میں مرد و زن دونوں کے حقوق و فرائض اس طرح بتائے گئے ہیں کہ انھیں صحیح طور پر برتنے کی صورت میں کسی کی حق تلفی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسلام کی اخلاقی و انسانی تعلیمات میں انسان تو کیا، شجر و حجر اور نباتات و حیوانات کے ساتھ بھی انصاف کیا گیا ہے۔ اسلام میں زوجین کے تعلقات کی بہتری کے لیے اتنے حدود و قیود ہیں، جو عام حالات میں بہت کافی ہیں۔ ہاں! اگر کوئی عقیدہ و اخلاق کے تقاضوں کو پامال ہی کرنے پر تلا ہو تو اسے خدا کے علاوہ کون روک سکتا ہے؟

سوال: کیا کوئی شرعی ادارہ بنایا جاسکتا ہے جو گائیڈ لائف بنائے؟

جواب: مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے بہت سے شرعی و قانونی ادارے بنائے جاتے رہے ہیں۔ قریبی زمانہ میں سب سے پہلے بہار واڑیسہ میں ''امارت شرعیہ'' قائم ہوئی، جس کے مفید کاموں کو دیکھ کر دوسرے صوبے بھی اس نظام کو اپنا رہے ہیں۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء میں ''مجلسِ تحقیقات شرعیہ'' قائم ہوئی، جو عرصے سے اس موضوع پر بنیادی مگر خاموش اور ٹھوس علمی کام کر رہی ہے، اور اس موضوع پر اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ملک کے بڑے مدارس میں ''دارالافتاء'' قائم ہیں جو اس طرح کے مسائل میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' بھی مسلمانوں کا متفق علیہ ادارہ ہے جو نئے حالات میں ان کی رہنمائی کرتا ہے، اور اس کے مقاصد میں ایسا لٹریچر تیار کرنا اور معاشرہ میں پھیلی کمزوریوں کو دور کرنا بھی ہے، جن سے حقوقِ زوجین پامال نہ ہوں۔

کل ہند پیمانے پر شرعی عدالت

سوال: کل ہند پیمانے پر شرعی عدالت کیوں نہیں بنائی جاتی، تاکہ عدالت میں جانے

کے بجائے اپنی [شرعی] عدالت میں جائیں؟

جواب: مذکورہ اداروں کو فعال بنا کر یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس کی بہتر صورت یہ ہوسکتی ہے کہ گاؤں اور قصبات سے شرعی پنچائتوں کی ابتدا کی جائے ،اور پھر انھیں شہروں تک وسیع کیا جائے۔اسے مدارس عربیہ،مقامی علماء ومشائخ اور دیندار مسلمان بآسانی شروع کر سکتے ہیں ،پھر اس کی کل ہند تشکیل بھی ہوسکتی ہے؛لیکن کسی نئی ہیئت یا کل ہند پیمانہ کی نئی شرعی عدالت قائم کرنے کے بجائے بہار کی امارت شرعیہ۔جس کے طویل تجربہ اور کامیابیوں سے بھر پور تاریخ نے پورے ملک میں ایک طرح کا اعتماد حاصل کرلیا ہے۔کی شاخیں قائم کر کے اسی کے ذریعہ اس مقصد کے حصول کی کوشش زیادہ مناسب ہوگی۔

اسلامی شریعت-حقائق اور غلط فہمیاں

تحریک پیام انسانیت کے تعارف اور دعوت کے سلسلے میں ۲۱ تا ۳۰ر مارچ ۱۹۷۸ء کی مدّت میں پنجاب اور ہریانہ کا دورہ حضرت مولاناؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ کیا۔ اس دورے میں ضلع انبالہ کے مختلف مقامات کے علاوہ مالیر کوٹلہ، سرہند اور چنڈی گڑھ بھی جانا ہوا۔ چنڈی گڑھ کے ایک روزہ قیام میں، ایک مقامی انگریزی روزنامہ کے نمائندہ خصوصی شری چاولہ نے مولانا سے انٹرویو لیا؛ اس طویل انٹرویو کا وہ حصہ ٹیپ ریکارڈ سے قلمبند کر کے، جس کی صحیح رپورٹنگ اس اخبار میں نہیں ہو سکی، ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر اپریل ۱۹۷۸ء) میں شائع ہوا، جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

فقہ اسلامی میں ہر زمانے کے مسائل کا حل موجود ہے

اس سوال کے جواب میں کہ ''کیا اسلامی شریعت ایسی بے لچک ہے کہ تبدیل شدہ حالات میں اس سے مطابقت نہیں ہوسکتی؟''، مولانا نے فرمایا:

''زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے قانون میں گنجائش پیدا کرنے اور اسے قابل عمل بنانے کی نہ صرف ہمارے یہاں گنجائش ہے، بلکہ عالموں اور شریعت کے اسکالرس کو اس کی ہدایت ہے کہ وہ برابر یہ کام کرتے رہیں، وہ برابر Revise کرتے رہیں اور دیکھیں کہ اس وقت تمدن، تجارت، عام تعلقات اور سیاسی قوانین نے ایسے کون سے نئے حالات پیدا کردیے ہیں، جس میں اپنے پرسنل لا اور اسلامی Jurisprudence پر نظر ڈال کر، اگر کہیں کوئی دِقّت پیدا ہوتی ہے اور کوئی پرابلم پیدا ہوتا ہے، تو اسے Solve کرنا ہے؛ ہمارے مدارس یہ کام کرتے ہیں؛ وہاں یہ Function جاری ہے؛ آپ جس مدرسے میں بھی کوئی سوال بھیجیں، جسے ہماری اصطلاح میں ''استفتاء'' کہا جاتا ہے، تو مفتی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ کتابیں دیکھیں، قرآن مجید کا مطالعہ کریں، اسلامی قوانین وفقہ کی کتابیں دیکھ کر اس مسئلہ کا حل اور اس سوال کا جواب دیں۔ ہمارے یہاں فقہ کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے کسی مذہب میں فقہ کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں ہے۔

ہمارے یہاں جو اصول فقہ ہے جسے Principles of Jurisprudence کہہ سکتے ہیں، یعنی کسی نئی بات میں رہنمائی حاصل کی جائے، کوئی Directive اور نئی رہنمائی کی جائے، اس کے لیے ہمارے یہاں اصول فقہ ہے۔ یہ اصول اتنے باریک، گہرے اور ہمہ گیر ہیں کہ اس کا سب نے حتی کہ یوروپین مصنفین اور قانون دانوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ نہایت وسیع اور اعلیٰ ذہانت پر مبنی ہیں؛ مسلمانوں نے اصول فقہ پر جس محنت، ذہانت اور وسعت سے کام لیا ہے، اس کی مثال کسی اور قوم میں نہیں ملے گی۔

دوسری بات یہ کہ مسلمانوں نے چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی سے بارہویں صدی تک دنیا کے بڑے خطہ پر حکمرانی کی ہے۔ مسلمانوں کا اس دور میں امپائر دنیا میں سب سے بڑا تھا۔ اتنی بڑی سلطنت کے لیے قانون وضع کرنے کے لیے کتنے غور وفکر، لچک اور وسعت کی ضرورت تھی؛ اس کا اندازہ آپ کریں، اس بڑے امپائر میں مختلف قومیں، مختلف تہذیبیں، مختلف تمدنی حالات تھے؛ Irrigation کا نظام، ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ کہیں کچھ تھا تو کہیں کچھ، پیداوار میں بھی یکسانیت نہیں تھی، افریقہ کے صحراء، مشرق وسطی کا سرسبز علاقہ، کہیں ریگستان (Desert)، تو کہیں متمدن شہر، یہ سب مسلم مملکت کا حصہ تھے۔ اس کی وجہ سے مسلم ماہرین قانون اور علمائے شریعت اس پر مجبور بھی تھے اور ان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ انھوں نے قرآن وسنت کو سامنے رکھ کر اپنی دماغی صلاحیت کا اس سلسلہ میں بہترین ثبوت دیا، اسلامی دماغ اس معاملہ میں کبھی بھی معطل نہیں ہوا، یہ الزام بالکل غلط ہے۔

یہ تھوڑا سا عرصہ جو ابھی گزر رہا ہے، جس میں ہم نئے سیاسی حالات میں گھرے ہوئے ہیں، اس کا ہمیں اعتراف ہے کہ جو ٹھوس کام ہونا چاہیے تھا، وہ تقسیم ہند کے بعد نہیں ہوا، لیکن پھر بھی ہمارے ہندوستان میں ایسے علماء ہیں کہ جنھیں نہ صرف یہ کہ عرب علماء کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے؛ بلکہ عرب علماء ان کے علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت بھی تین چار ایسے عالم ہیں کہ عرب دنیا میں جن کا لوہا مانا جاتا ہے، عرب علماء اور دانشوران سے خط وکتابت کرتے ہیں اور دینی، علمی حتی کہ ادبی مسائل کے بارے میں بھی ان سے پوچھتے ہیں۔

میں خود آپ کے سامنے بیٹھا ہوں، میں وہاں کی مختلف کمیٹیوں اور تنظیموں کا ممبر ہوں، یہ محض سیاسی غرض سے نہیں بلکہ خالص علمی، دینی، قانونی؛ بلکہ عربی زبان ولٹریچر کے موضوعات میں وہ ہم سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں؛ Arabic Literature میں بھی ہماری کتابیں نصاب میں داخل ہیں، عرب ممالک کی تعلیمی کانفرنسوں میں بھی ہمیں دعوت دی جاتی ہے اور ہندوستانی اسکالرز کی رائے کو وقعت دی جاتی ہے۔ میری ایک کتاب "مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِیْنَ" جس کا انگریزی ترجمہ "Islam and The World" کے نام سے ہو چکا ہے، اس کتاب کے عربی میں گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں، غیر قانونی ایڈیشن اس کے علاوہ ہیں، اس کتاب کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔"

نئے مسائل میں اسلامی شریعت کیا گنجائش دیتی ہے؟

"یہ آپ نے اچھا سوال کیا کہ نئے حالات جو پیدا ہوتے ہیں، اس میں اسلامی شریعت کیا گنجائش دیتی ہے؟ ہمارے یہاں دین وشریعت کے علم میں Hereditary نہیں ہے، شریعت کے قانون میں حالات وزمانہ کے لحاظ سے جو تبدیلی ہوگی، وہ قرآن اور سنت کے حدود میں رہتے ہوئے ہوگی، اور یہ کام بھی ایسے علماء کریں گے، جو اس موضوع کے Expert ہیں، عام آدمی یا رائے عامہ اسے نہیں کرے گی۔ ویسے بھی یہ قانونی مسئلہ ہے، لہذا اسے قانون کے ماہروں اور علماء کے ذریعہ ہی حل ہونا چاہیے، یہ ایک فطری بات ہے۔"

اسلامی شریعت کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی نہیں ہوسکتی

سوال: مسلم پرسنل لا میں Amendment کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اسلامی شریعت کے جو بنیادی اصول ہیں، وہ تو ہم بدل نہیں سکتے، لیکن وہ اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، اور یہ پروپگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت میں قدم قدم پر رکاوٹ ہے، ایسی بات نہیں، جو اصول تبدیل نہیں ہوسکتے وہ چند ہیں، اور ایسے فطری ہیں کہ ہر دور میں اور زمانہ میں ان کی روشنی میں چلا جاسکتا ہے۔ آج تک ان اصولوں کے سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ان میں انسانی فطرت کے خلاف کوئی بات نہیں۔

سوال: ان میں سے کوئی مثال کے طور پر؟

جواب: مثلاً ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ عورت بھی ملکیت اور وراثت کا حق رکھتی ہے، وہ پراپرٹی کی Owner ہوسکتی ہے، مرد کے ذمہ اس کا نان نفقہ Maintenance ہے، شوہر کو اپنی بیوی کی زندگی کی ضروریات پورا کرنا ہوگا، عورت کی مرضی کے خلاف اس کا بیاہ نہیں کیا جائے گا، اس کی رضامندی ضروری ہے، یہ گویا Fundamentals ہیں۔

اصل میں لوگوں کو وقت نہیں ملا اور ہماری بھی غلطی ہے کہ ہم نے ان اصولوں کو بہتر طور پر پیش نہیں کیا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "اسلام نے اس قدر جکڑ دیا کہ زندگی چاہے کتنی بھی بدل جائے، وہ زندگی کا ساتھ نہیں دیتا"، یہ خیال بالکل غلط Baseless ہے، ہمارے قوانین میں اتنی گنجائش ہے کہ ترکی جس کے حدود یورپ میں بھی ہیں، مصر جیسا Advance ملک، اسی طرح

شام، الجیریا سب ممالک میں یہ قوانین صدیوں سے چلتے آرہے ہیں؛ لیکن یہ کام ایکسپرٹس کا ہے، فقہاء کا کام ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ اسلام کے بنیادی اصول قائم رکھتے ہوئے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، جو نیا Crisis پیدا ہوگیا ہے، جو نیا موڑ آگیا ہے، اس میں ہمیں کیا رہنمائی دینی چاہیے، یہ کام کبھی بند نہیں ہوا۔

مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ ایک شخص نے کسی عورت سے شادی کی اور پھر اسے چھوڑ کر یورپ چلا گیا، یا کسی اور ملک چلا گیا، نہ خط بھیجتا ہے، نہ ازدواجی تعلقات رکھتا ہے، نہ خرچ دیتا ہے اور نہ طلاق دیتا ہے، اب ایسی صورت میں ہمارا جو خانگی اور عائلی ڈھانچہ بنا ہوا ہے، اس میں کچھ دقتیں تھیں، اس سلسلے میں ہمارے علماء نے کتابیں لکھیں۔ آپ نے شاید مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام سنا ہوگا، جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور ذہین انسان تھے، انھوں نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی، اور علماء نے اس مسئلہ کا حل نکالا، اس طرح کی صورت حال میں ہمیں اپنے قانونی ڈھانچے پر از سر نو غور کرنا ہوگا؛ لیکن یہ سب شریعت کے علماء اور اسلامی قوانین کے ماہروں کے ذریعہ ہوگا۔ اس سلسلے میں باہر کے علماء سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

سوال: مسلم Divorce سسٹم میں تبدیلی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ بھی علماء اور اسلامی قانون دانوں کے ذریعہ ہوگا، اسلامی شریعت پوری دنیا میں Common ہے۔ باہر کے علماء اور یہاں کے علماء کا ایک سیمینار بلایا جائے اور طلاق کا جو پورا نظام اور اصول ہے، اس کا جائزہ لیں، موجودہ مشکلات کو سامنے رکھ کر ہم اپنے مسائل طلاق کا جائزہ لیں کہ اس میں دین و شریعت کے فریم کے اندر رہتے ہوئے کون سی مفید، ضروری اور مناسب تبدیلی ہوسکتی ہے، یا کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جو ابھی سامنے نہیں آئے، ہم انھیں فقہ کی کتابوں کی مدد سے روشنی میں لائیں، ہم اپنے فقہی مسائل کو جو طلاق سے تعلق رکھتے ہیں دیکھیں کہ ان میں کیا لوچ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ ان مسائل پر غور کیا جاتا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بھی بنا ہوا ہے، میں بھی اس کا ایک بنیادی ممبر ہوں۔

سوال: پاکستان میں پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتے؛ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہم اس سے Agree نہیں کرتے، ہم اس سے متفق نہیں ہیں۔

فیملی پلاننگ

سوال: ایک Burning Topic فیملی پلاننگ کا ہے؟

جواب: اس میں بھی خاص حالات میں اجازت دی گئی، میڈیکل گراؤنڈ پر یا کسی دینی وجہ سے؛ لیکن اس کا اختیار شوہر پر ہوگا، اس میں حکومت کا جبر صحیح نہیں، اس کے لیے ماحول تیار کرنا ضروری ہے۔!!

پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ

اور اسلامی قوانین کی تدوین ایک بڑا کارنامہ ہوگا

رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے پہلی ایشیائی کانفرنس ۶-۸؍ جولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی میں منعقد ہوئی۔ حضرت مولاناؒ نے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان کا سفر کیا تھا۔ اسی موقع پر ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' (کراچی) کے نمائندے اقبال احمد صدیقی نے یہ انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو بعد میں ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۱۰-۲۵؍ اگست-۱۰؍ ستمبر ۱۹۷۸ء) میں بھی شائع ہوا۔

رابطۂ عالم اسلامی اور پاکستان کی وزارت امور مذہبی کے اشتراک وتعاون سے کراچی میں ۶ / ۷ / ۸ / جولائی ۱۹۷۸ء کو ایشیائی اسلامی کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ ان میں ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ناظم اعلیٰ اور دنیائے اسلام کے عظیم مفکر، متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف اور عصر جدید کے شہرہ آفاق مقرر و محقق، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی شرکت کی۔ بھارت سے مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا اسحاق جلیس ندوی (مدیر پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ) اور دوسرے علماء براہ راست تشریف لائے، جبکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس موقع پر سعودی عرب میں قیام فرما تھے، انھوں نے کانفرنس میں شرکت کے لیے رابطہ کے ذریعہ پاکستان کا ویزا حاصل کیا۔ ۷ا رجولائی کی علی الصبح تک (جب انھیں اسلام آباد کے لیے کراچی ایرپورٹ روانہ ہونا تھا) مسجد نیوٹاؤن میں جناب قاری رشید الحسن صاحب خطیب مسجد کی رہائش گاہ پر مولانا مقیم رہے۔

متعدد جلسوں وتقریبات میں ان کی فکر انگیز تقریریں سننے کا موقع ملا، کئی بار ان کی خدمت میں قیام گاہ پر شرف باریابی بھی حاصل ہوا۔ ہر مرتبہ مولانا کی شستہ اور شگفتہ گفتگو کے کچھ ایسے حصے سننے اور ان کا ذاتی اخلاص وانداز دیکھنے کا موقع ملا کہ ہر بات دل پر نقش ہو جانے والی اور دماغ پر چھا جانے والی تھی۔ کوئی بات تحقیق، تجزیہ تاریخ، مشاہدۂ زندگی اور اسلام کی سربلندی کے لیے بے پناہ دردمندانہ جذبات سے خالی نہ تھی۔ ان مختصر ملاقاتوں کو، جن کا سبب مولانا کی بے پناہ مصروفیت تھی، ناکافی سمجھتے ہوئے راقم الحروف نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مخلصانہ التماس کی کہ ''اخبارِ جہاں'' کے لیے جو پاکستان کا ایک مشہور اور نہایت بااثر جریدہ ہے، اپنا ایک انٹرویو قلمبند کرائیں، اور عدیم الفرصتی کے باوجود چند اہم سوالات کے جوابات دینے کے لیے کچھ قیمتی وقت نکالیں۔ چنانچہ مولانا نے بہ کمال مہربانی وشفقت وعدہ فرمایا کہ انشاء اللہ جمعہ کے دن غسل کے بعد اور نمازیوں سے خطاب سے قبل مطلوبہ انٹرویو دیا جائے گا، اور واقعی اس مقررہ وقت پر مولانا نے

اپنا وعدہ پورا کردیا، اگر چہ کمرۂ ملاقات میں تشریف لانے سے قبل ہی ممتاز علماء، معززین شہر اور صحافیوں کی بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی۔

مولانا غسل کے بعد کمرے میں تشریف لائے تو زیر لب تلاوت کا سلسلہ جاری تھا۔ حاضرین گرم جوشی سے مولانا کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھے؛ لیکن مولانا کو تلاوت میں مشغول پا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ مولانا بھی فرش پر بیٹھ کر مسلسل پڑھتے رہے۔ مولانا نے ورد مکمل کرنے کے بعد فرمایا کہ "اپنی والدہ ماجدہ کی ہدایت کے مطابق وہ عالمِ نوجوانی ہی سے ہر جمعہ کو غسل کے بعد سورہ کہف کی تلاوت فرماتے ہیں، جو قربِ قیامت کے دجالی فتنوں سے بچانے کے لیے نہایت مفید وظیفہ ہے۔"

بہر حال مجھے وہ قیمتی لمحات میسر آ ہی گئے، جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسی مایۂ ناز علمی شخصیت سے بالمشافہ گفتگو کرنے اور مختلف سوالات کے جواب حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوگئی۔ اس روداد کو سوال وجواب کی صورت میں ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

پاکستان پر ہی نظام اسلامی کے مکمل نفاذ کے لیے مؤثر اور بنیادی کردار ادا کرنے کے لیے زور کیوں؟

سوال: مولانا! آپ نے قیامِ پاکستان کے دوران جن جلسوں میں تقریریں کی ہیں، میں نے ان میں شرکت کی ہے، رابطہ کانفرنس کی کارروائی نظر سے گزری ہے، اس کے اجلاس میں آپ کی معرکہ آرا تقریر[1] سنی ہے۔ آپ نے اور دوسرے مندوبینِ کانفرنس نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا ہے، اور پاکستان پر ہی نظامِ اسلامی کے مکمل نفاذ کے لیے مؤثر اور بنیادی کردار ادا کرنے کے لیے زور دیا ہے، جبکہ دنیا میں اور بھی بہت سے ممالک موجود ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

جواب: جی ہاں! دنیا میں مسلم ممالک پہلے بھی موجود تھے، آج بھی ہیں، انھیں جغرافیائی اور تاریخی حوالے سے ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی پہچانا جائے گا؛ لیکن پاکستان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کے نام پر ہی وجود میں آیا ہے اور یہاں نہ صرف وعدے کے مطابق مکمل اسلامی نظامِ حیات رائج ہونا ہے؛ بلکہ دوسرے مسلم ممالک کے لیے ایک مثال، ایک نمونہ بننا ہے۔ میں اپنے اس وسیع تجربے اور مشاہدے کی بنا پر، جو مجھے یورپ، امریکہ، افریقہ، دنیائے عرب اور ایشیائی ممالک کے

(۱) یہ تقریر حضرت مولانا کی کتاب 'دعوت فکر وعمل' میں بعنوان: 'کاروان ملت کا جلیل القدر مسافر' شامل ہے۔

طویل مشاہدہ و سفر میں حاصل ہوا ہے، پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سلطنت عثمانیہ کے انحطاط کے بعد یہ مواقع پاکستان ہی کو حاصل ہوئے ہیں کہ تاریخ کے اس نازک ترین لمحہ میں منجدھار میں ڈگمگاتے ہوئے سفینۂ ملی کو ساحلِ مراد تک پہنچائے اور مساواتِ انسانی کا نمونہ پیش کرے۔

تقدیر کا مسئلہ

سوال: عام طور پر لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا، یہ تقدیر کا مسئلہ کیا ہے؟

جواب: یہ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ علمِ غیب کی بنا پر جانتا ہے کہ کون کیا کرے گا؟ اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ انسان بے خبر ہے، اس لیے اسے ہر اچھی تدبیر کرنے کا موقع حاصل ہے اور بہتر راستے پر چل کر کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے، جبکہ ظلم اور ضلالت کرنے والا اپنے انجام کو پہنچتا ہے، چونکہ اس نے راستہ ہی تباہی کا اختیار کیا۔

سوال: آپ نے تقدیر بدل جانے کے موضوع پر ایک تقریر میں روشنی ڈالی تھی؛ لیکن کیا واقعی یہ ممکن ہے؟

جواب: اصل میں صورت حال یہ ہے کہ ایک مریض لاعلاج ہوتا ہے یا اچھا معالج میسر نہیں آتا اور وہ بالآخر مر جاتا ہے، اس کی تقدیر یہی ہے۔ دوسرا شخص شدید بیمار ہے، لیکن موزوں علاج اور ماہر معالج کی بدولت صحت یاب ہو جاتا ہے، اس کی تقدیر میں یہی ہے۔ تقدیر دو طرح کی ہوتی ہے: تقدیر مبرم اور تقدیر معلق، مسئلۂ جبر و قدر پر سیر حاصل کتابیں عربی زبان میں موجود ہیں۔

دعا کیسے کی جائے؟

سوال: علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں کسی کو مصیبت کے وقت صمیم قلب سے دعا کرنے کا مشورہ دیا تھا، اور لکھا تھا: دعا مسلمان کے لیے تلوار ہے!

جواب: اس مفہوم سے مماثل ایک حدیث نبوی (علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام) موجود ہے --- اس سے آگے مولانا کے یہ الفاظ نہایت توجہ کے لائق ہیں --- دعا کے لیے اس ہستی کے یقین کی ضرورت ہے جس سے دعا کی جائے، پھر اس یقین کی کہ اس کو ہر طرح کی قدرت ہے اور دینے کے لیے اس کے پاس سب کچھ ہے، پھر اس یقین کی کہ اس کے در کے سوا اور کوئی در نہیں، پھر اس یقین کی کہ وہ خود بھی دینا چاہتا ہے اور محبت و رحمت، بخشش و عطا اور احسان

وانعام اس کی خاص صفت ہے اور کوئی لے کر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا وہ دے کر خوش ہوتا ہے، پھر اس یقین کی کہ مخلوق محتاج محض اور سرتاپا کشکول گدائی ہے، پھر اس یقین کی کہ وہ معبود اپنی ہر مخلوق سے، دنیا کی ہر چیز سے، یہاں تک کہ اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ہر حال میں مدد کر سکتا ہے۔

بہت زیادہ کانفرنسوں کا انعقاد وقت کا ضیاع ہے

سوال: حال ہی میں کراچی میں منعقد ہونے والی اسلامی ایشیائی کانفرنس کی کامیابی کے بارے میں آپ کی توقعات کیا ہیں؟

جواب: مجموعی طور پر صورت حال کچھ اور بہتر ہوئی ہے۔ اس کانفرنس کی بدولت اتنے بہت سے مسلمان نمائندوں کو یکجا ہو کر مشترکہ مسائل پر غور کرنے کا موقع ملا، بہت سے اہم مسائل زیر بحث آئے، اصولی طور پر میں بہت زیادہ کانفرنسوں کو وقت کا ضیاع سمجھتا ہوں، اور زیادہ باتوں سے میرے دل میں زیادہ حسنِ ظن پیدا نہیں ہوتا؛ کیونکہ وقت بھی صرف ہوتا ہے اور سرمایہ بھی۔ تاہم یہ کانفرنس متعدد وجوہ سے بہتر رہی۔ عربی زبان کی ترویج، قرآن کریم کے نسخوں کی اشاعت، مسلمان نوجوانوں کی اصلاح وتربیت، باہمی مسائل میں ربط وتعاون اچھی باتیں ہیں۔ بہر حال کانفرنس کے نتائج کی باضابطہ رپورٹ جلد سے جلد سعودی عرب سے جاری ہوگی؛ لیکن جس جذبے سے کانفرنس بلائی گئی اور جس اتحاد فکر سے کارروائی جاری رہی اور جتنے زیادہ مندوبین نے اس میں سرگرم حصہ لیا، اس سے میں یہی توقع کرتا ہوں کہ نتائج بھی حوصلہ افزا ہوں گے، عالم اسلام میں اتحاد بڑھے گا۔ اصل مسئلہ عمل درآمد کا ہے، زعمائے ملت اپنی ذمہ داری کو بخوبی پورا کریں گے، تو ان شاء اللہ کانفرنس کے اعلیٰ مقاصد کو تکمیل تک پہنچانے کا مرحلہ بھی آسان ہو جائے گا۔

سوال: آپ بھارتی علماء کے وفد کے قائد کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے، لیکن دوسرے علماء کراچی پہلے پہنچ گئے؟

جواب: اصل میں میں ہندوستان سے براہ راست یہاں نہیں آیا، میں رابطہ کی تاسیسی مجلس کا رکن ہوں اور سعودی عرب کی جامعہ اسلامیہ کی سپریم کونسل کا بھی۔ وہاں ۲۰-۲۱-۲۲؍رجب کو طلبہ کی کونسل کا سالانہ اجلاس تھا، میں اس میں شرکت کے لیے سعودی عرب گیا ہوا تھا۔ جب ایشیائی اسلامی کانفرنس میں شرکت ضروری قرار پائی تو رابطہ ہی کے

ذریعہ ویزا حاصل کیا، اور جدہ سے کراچی پہنچا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی بعض خبروں کے سلسلے میں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ رابطہ عالم اسلامی نے یہ دعوت نامے مختلف ممالک میں اسلامی تنظیموں کو جاری کیے تھے، اس لیے سرکاری سطح پر ہندوستان سے بھی علماء کا کوئی وفد نہیں آیا، پھر یہ کہ میں اور مولانا منظور نعمانی رابطہ کی تاسیسی مجلس کے رکن ہیں، اس لیے رابطہ ہمیں دنیا کے کسی حصے میں بھی کانفرنس یا اجلاس میں مدعو کرے، ہمارے لیے اس میں شرکت ضروری ہوتی ہے۔

اسلامی قوانین کی تدوین ایک نازک اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے

سوال: مولانا! اسلامی تاریخ اور تحقیق و تصنیف میں آپ کا مقام بلند ہے۔ پاکستان کی اسلامی مشاورتی کونسل کے ایک اجلاس میں کونسل کے چیرمین ریٹائرڈ چیف جسٹس افضل چیمہ کی خصوصی دعوت میں آپ نے شرکت فرمائی، مولانا ظفر انصاری، جناب خالد اسحاق بار ایٹ لا، وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اے. کے. بروہی اور دوسرے اراکینِ کونسل سے تبادلۂ خیال کا موقع آپ کو ملا، کیا آپ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل کے کام سے مطمئن ہیں؟

جواب: اسلامی قوانین کی تدوین ایک نازک، مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ کام بہت تاخیر سے شروع ہوا، اس کام کو عثمانیہ خلافت کے اختتام سے پہلے ۶۰-۷۰ برس پہلے ترکی میں شروع ہو جانا چاہیے تھا۔ بہر حال میں نے محسوس کیا ہے کہ پاکستان میں یہ کام کرنے والے لوگ لائق اور سنجیدہ ہیں۔ ایک زمانے میں یہ کام مصر میں شروع ہوا تھا؛ لیکن پورا نہ ہو سکا، پھر کویت کی حکومت نے ممتاز علماء و فقہاء کے تعاون سے اسلامی قوانین کی تدوین شروع کرائی، لیکن کام کی رفتار سست اور مصارف کثیر ہونے کے باعث روک دینا پڑا۔ اب یہ کام اگر پاکستان میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اور جس کی طرف ہم سب لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں، تو نہ صرف پاکستان کے مستقبل اور تحفظ کی ضمانت بھی ہوگا؛ بلکہ پورے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور یورپ اور مسلم دنیا کے لیے ایک قابل تقلید مثال ہوگا۔ میں اس کام کی دشواریوں سے واقف ہوں، اس لیے اس نقطۂ نظر کی حمایت نہیں کر سکتا کہ مدوّن اور منضبط قوانینِ شریعت، جن میں معاشیات، تمدّن، اقتصادی نظام، طرزِ تعلیم، قانونِ جرم و سزا، نظامِ محاصل اور تشکیلِ حکومت سب کچھ شامل ہے، ان کے بغیر بس ایک فرمان سے نظامِ اسلامی نافذ کرنے کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔!!

مسلمانوں کی تہذیب وتمدن یورپ کی تہذیب وتمدن سے زیادہ شاندار تھی

سوال: مولانا! ہماری نئی نسل مغربی سائنسدانوں اوران کی ایجادات سے غلبہ کی حد تک متاثر ہے، صحیح صورت حال کیا ہے؟

جواب: ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب مسلمانوں کی تہذیب وتمدن یورپ کی تہذیب وتمدن سے زیادہ شاندار تھی۔ اس نے یورپ کو بہت سی انقلابی قسم کی صنعتی وفنی ایجادات عطا کیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے یورپ کو اس عملی طریقے کے اصول ومبادی دیے جس پر علمِ جدید اور تہذیب جدید کی بنیاد ہے، لیکن اس کے باوجود ''جابر بن حیّان'' کا کیمسٹری کا علم عربی نہیں کہلایا، اسی طرح ''الجبرا'' اور ''علم مثلثات'' کو اسلامی علوم نہیں کہا گیا، حالانکہ اوّل الذکر کا موجد ''خوارزمی'' ہے اور مؤخر الذکر کا ''بتانی'' اور یہ دونوں ہی مسلمان تھے۔ ٹھیک اسی طرح نظریۂ کشش کو کوئی انگریزی علم نہیں کہہ سکتا، اگرچہ اس کا موجد انگریز تھا۔ یہ بڑے بڑے علمی کام نوعِ انسانی کی میراث ہیں، اگر مسلمان صنعتی علوم وفنون ترقی کی فطری خواہش سے اپنائیں تو حق بجانب ہیں؛ لیکن باطنی حریت کے ساتھ جو بہر حال مقدم ہے۔

ہند-پاک تعلقات

سوال: مولانا! ہندوستان کے مسلم علماء کے پاکستان آنے سے یہاں کے مسلمانوں میں جو گرمجوشی پائی جاتی ہے، جس محبت، اخوت، یگانگت اور عقیدت واحترام کا اظہار کیا جارہا ہے، کیا آپ نے اس سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان-پاکستان کے تعلقات پر بھی اس دورے کا خوش گوار اثر مرتب ہوگا؟

جواب: آپ نے بہت اچھا سوال کیا، مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے اس دورے سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خیر سگالی میں نمایاں اضافہ ہوگا، باہمی تعلقات کو مزید فروغ حاصل ہوگا، جتنا زیادہ دونوں ملکوں کے افراد اور اہم شخصیتیں ایک دوسرے ملک میں جائیں گی، ماضی کی تلخی میں کمی آئے گی، مثلاً میں جب ہندوستان واپس پہنچوں گا تو یہاں میں نے ہندوستان کے مسلمانوں یا حکومت ہند کے لیے جو اچھے جذبات دیکھے ہیں، ان کا ذکر ضرور کروں گا۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے بہت سے حلقوں میں یہ تأثر عام طور پر موجود ہے کہ پاکستان میں ہر شخص برسر جنگ بیٹھا ہے اور اس کے دل میں ہندوستان کے لیے نفرت اور دشمنی کے سوا کچھ

نہیں، حالانکہ میں نے یہاں اس خیر سگالی کو خوب محسوس کیا جو ہندوستان کے لیے موجود ہے، ہر شخص دونوں ملکوں کو دوستانہ تعلقات مستحکم کرتے اور ترقی کرتے دیکھنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے باہمی وفود کا تبادلہ بین المملکتین غلط فہمی کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ماضی میں دونوں ملکوں کے معاملات میں جو خلیج پیدا ہوگئی ہے، دونوں ملکوں کے سنجیدہ لوگ اسے جلد ختم کردیں گے۔

سوال: یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اندرا حکومت کے دور میں پاکستان ہندوستان کے تعلقات متواتر نازک مرحلوں سے گزرتے رہے؛ لیکن آج کل پاکستان اور ہندوستان میں جو حکومتیں ملک کا انتظام چلا رہی ہیں، وہ بنیادی طور پر باہمی تعلقات کو دوستانہ خطوط پر استوار رکھنے میں نہایت سنجیدہ ہیں، اس طرح علمائے ہند کا دورۂ پاکستان ایک اور اچھی پیش رفت ثابت ہوسکتا ہے۔!!!

جواب: یقیناً اس وقت دونوں حکومتوں کی یہی خواہش ہے، اور میں تو زیادہ واضح طور پر کہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں اور ان کے عوام کی بھلائی اسی میں ہے کہ ایک دوسرے سے پورا تعاون کریں، اپنے درمیان تمام مسائل مفاہمت سے دور کریں اور اپنے اپنے ہاں کے عوام میں خوشحالی، ترقی اور دوستی کا یکساں جذبہ پیدا کریں۔

اس دور کا مجدد

سوال: کیا آپ اسلامی قوانین کی تدوین کے اس کام میں تعاون فرمائیں گے؟

جواب: میں ہندوستان میں رہتا ہوں، اس لیے اصل ذمہ داری تو یہیں کے علماء و فضلاء کی ہیں، تاہم ہماری ہمدردیاں اور نیک تمنائیں اس بڑے کام کی تکمیل سے وابستہ ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اس دور کا مجدد وہ ہوگا جو آج کے دور میں اسلامی دستور اور قوانینِ زندگی کو باقاعدہ منضبط اور مدوّن کرے گا۔

سوال: کچھ لوگوں نے الزام لگایا ہے کہ ایک خاص اور نئے فقہ کو مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔!!!

جواب: یہ بالکل غلط اندیشہ ہے، فقہ حنبلی یا کوئی اور نیا فقہ مسلط کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسلامی دستور کو مِن حیث المجموع لانے کی کوشش جاری ہے، اسلام میں تنگ

نظری اور عصبیت کی کوئی گنجائش نہیں، رابطہ اور حکومت سعودیہ اس کام کی تکمیل میں اصولی اعتبار سے تعاون کررہے ہیں۔

مسلمان ابلاغ عامہ کے اداروں میں زیادہ سے زیادہ شامل ہوں

سوال: مسلم ممالک میں اشتراکی صہیونی اور قادیانی عنصر ابلاغ عامہ کے اداروں کو غلط خطوط پر چلا کر مسلمانوں کو گمراہ کررہے ہیں، فحاشی پھیلا رہے ہیں، علاقائی اور مذہبی فرقہ بندی کو ہوا دے رہے ہیں۔!!

جواب: یہ فتنے صرف پاکستان کے لیے نہیں، پوری دنیائے اسلام کے لیے مستقل خطرہ اور چیلنج ہیں۔ مجھے پاکستانی اخبارات اور نشریاتی اداروں میں ان عناصر کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوکر بہت رنج ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے مخالف اور مسلمانوں کے اتحاد کے دشمن بہت پہلے سے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے ابلاغ عامہ کے اداروں میں جا گھسے ہیں، لیکن انھوں نے اس فن میں جلدی مہارت حاصل کرکے اپنا غلبہ بڑھایا ہوگا، اس کا علاج یہی ہے کہ صحیح العقیدہ مسلمان، اور اسلام اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد ان فنون میں درک حاصل کریں، اور زیادہ سے زیادہ ان اداروں میں شامل ہوں تاکہ اپنی مہارت اور قابلیت کی بنیاد پر انھیں بااختیار حیثیت حاصل ہوسکے، اور اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اخلاص سے ان ذرائع کو استعمال کرسکیں۔

اخبارات وجرائد اخلاقی قدروں کالحاظ رکھ کر شائع کیے جائیں

سوال: پاکستانی اخبارات وجرائد کے بارے میں آپ کا تأثر کیا ہے؟

جواب: اخبارات وجرائد اور کتابیں ان اخلاقی قدروں کالحاظ رکھ کر شائع کی جائیں کہ مسلمان انھیں خرید سکیں اور اپنے گھروں میں لے جاسکیں، محض دولت کمانے کے لیے عریانی یا فحاشی پر مبنی لٹریچر شائع کرنا ملی سطح کا نقصان ہے۔

سوال: مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد (کراچی) کی جانب سے جناب فضل ربی ندوی نے نہایت معقول انتظام کردیا ہے کہ جیسے ہی آپ کی کوئی کتاب دنیا کے کسی ملک میں شائع ہو، اس کا اردو ترجمہ پاکستان میں شائع ہوجائے؛ لیکن آپ کی کتاب ''پرانے چراغ'' کی جلد دوم کی کمی شدت سے محسوس ہورہی ہے؟

جـــــواب: ''پرانے چراغ'' کی جلد دوم[1] کی تیاری ہو رہی ہے، جس میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے لے کر مولانا ماہر القادری تک دوسری بہت سی شخصیتیں شامل ہوں گی۔ ماہر صاحب کے انتقال پر نہایت افسوس ہے، مجھے سعودی عرب کے قیام کے دوران بتایا گیا کہ انتقال سے تین چار گھنٹے قبل میرا ہی ذکر کرتے رہے۔

عالم انسانیت کے نام پیغام

ســـــوال: عالم انسانیت کے نام آپ کا پیغام جس میں مسلمانوں کے جملہ مسائل شامل ہوں؟

جـــواب: اغراض وتعصّبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد اور بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں، جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدّن اور انسانی سوسائٹی، اس وقت سخت خطرے سے دوچار اور موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار ہے، یہ حقیقتیں اپنے اپنے زمانے میں پیغمبروں نے بیان کی ہیں۔!!!

(۱) پرانے چراغ (جلد دوم) کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں، اور جلد سوم کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں مکتبہ فردوس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

عالم اسلام - اِمکانات اور اَندیشے!

مئی ۱۹۸۴ء میں حضرت مولاناؒ نے یمن کا سفر کیا تھا، واپسی میں جدہ ہوتے ہوئے کراچی بھی تشریف لے گئے، اور وہاں چار دن قیام رہا۔ اسی موقع پر عالم اسلام کے مختلف مسائل سے متعلق پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبار ''جنگ'' کے ایک پینل نے دو نشستوں میں یہ انٹرویو لیا، جو ''جنگ'' کے ''مڈ ویک میگزین'' (شمارہ ۲۰ تا ۲۶ رجون ۱۹۸۴ء) میں شائع ہوا۔

پہلی نشست:

اسلامی دنیا کی مجموعی صورت حال - ایک تجزیاتی جائزہ

سوال: محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی! آج ہمارے لیے یہ بات انتہائی مسرت اور خوشی کی ہے کہ آپ جیسی عظیم المرتبت علمی شخصیت نے ''جنگ'' کے لیے ہمیں انٹرویو دینے کا موقع دیا، جو ہمارے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت آپ کی ذات عالمِ اسلام کی سب سے بڑی علمی شخصیت ہے، جسے عربی اور عجمی دونوں نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور آپ کی علمیت کا لوہا مانتے ہیں۔ عالم اسلام کو بجا طور پر آپ پر ناز ہے۔ آپ کی اردو، انگریزی اور عربی زبان میں تصانیف دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں، اور اسلام کی دعوت کو عام کرنے اور مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ آپ اس وقت دنیائے اسلام کی ایک بڑی علمی شخصیت ہیں اور اس حیثیت سے آپ کی پورے عالم اسلام پر یقیناً گہری نظر ہوگی۔ کیا آپ قارئین ''جنگ'' کو بتانا پسند کریں گے کہ اس وقت اسلامی دنیا کی مجموعی صورت حال کیسی ہے؟ اس کا ایک تجزیاتی جائزہ!

جواب: آپ نے میرے بارے میں جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں خود کو ابھی تک طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔ جہاں تک عالم اسلام کے بارے میں جائزہ لینے کا خیال ہے، یہ فی الحقیقت ایک بڑی ذمہ داری کی بات ہے اور اس پر مختصر طور پر تبصرہ کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔

عالمِ اسلام متعدد متضاد حقیقتوں کا نام ہے۔ عالمِ اسلام کی طاقت اس کی اثر انگیزی کی صلاحیت اور کردار ادا کرنے کا نام ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں، جن کے جائزے اور جن پر نگاہ

ڈالے بغیر دنیائے اسلام کا حقیقی تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔

امتِ اسلامی دنیا کی خیر و برکت اور اس کی امامت کے لیے بھیجی گئی ہے۔ یہی اس کی بعثت کا مقصد ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ملتِ اسلامیہ کی بڑی اہمیت ہے، اور اس کا بلند مقام ہے؛ لیکن جہاں تک موجودہ صورتِ حال کی حقیقتوں کا تعلق ہے، عالمِ اسلام مختلف مجبوریوں اور کمزوریوں کی وجہ سے وہ کردار ادا نہیں کرسکا جو اسے کرنا چاہیے تھا؛ بلکہ بعض اوقات یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ عالمِ اسلام کہیں فن عروض کے اس بحر کی طرح تو نہیں جس کی تمام وسعتوں کے باوجود اس میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں ہوتا۔

اسلام مخالف طاقتیں کسی صحیح اور صحت مند تحریک اور شخصیت کو اُبھرنے نہیں دیتیں

عالمِ اسلام جہاں اس وقت بڑے انتشار میں مبتلا ہے، وہاں دوسری طرف نمایاں بیداری بھی ہے اور اسلامی شعور بھی اپنا کام کر رہا ہے، مگر ساتھ ساتھ بعض دوسری طاقتیں اسے بے دست و پا بنائے ہوئے ہیں، اور کسی صحیح اور صحت مند تحریک اور با اثر اور صحیح الخیال شخصیت کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتیں، اور اگر کہیں اس کے اثرات نظر آتے ہیں اور کوئی بڑی شخصیت یا تحریک نظر آجاتی ہے، تو یہ بڑی طاقتیں ایسی تحریکوں اور ایسی شخصیات کا کسی طریقے سے اور اس ملک میں اپنی زیر اثر طاقتوں کے ذریعہ خاتمہ کرادیتی ہیں۔

عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا المیہ

عالمِ اسلام کے لیے انسانیت کی خدمت کرنے کے اس وقت بڑے امکانات ہیں اگر وہ اس انتشار سے محفوظ ہوجائے جو اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ اکثر ممالک کا یہ حال ہے کہ وہاں قائدین اور رہنماؤں کی طاقتیں اس ملک کے عوام کے ایمانی جذبے، صحیح اسلامی شعور اور اسلامی جذبے کو دبانے یا ختم کرنے میں صرف ہورہی ہیں، اور اس ملک کی سیاسی قیادتوں یا غیر اسلام پسند قوتوں کی قوتِ عمل، صلاحیت اور ذہانت عوام کے اندر، خصوصاً نوجوانوں میں پائی جانے والی بیداری کو ختم کرنے پر صرف ہورہی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ سیاسی قیادتیں کسی غیر ملکی طاقت یا دشمنِ اسلام کیمپ کا مقابلہ کریں، وہ اپنے عوام ہی کے جذبۂ اسلامی کو کچلنے کے

در پہ ہیں، خاص طور پر ممالکِ عربیہ میں صورتِ حال بہت نمایاں ہے۔ وہاں اصل کشمکش یا اصل معرکہ وہاں کی سیاسی طاقتوں، حکومتوں اور عوام کے درمیان ہے، اور اس طرح اپنی قوت کار اور اپنی توانائی کو ضائع کرنے کا کام ہو رہا ہے، اور دنیا کی سب سے بڑی اس طاقت کو اس طرح مفلوج بنایا جا رہا ہے، جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا، اور جو اَب بھی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اسے اس کے اصل جذبۂ ایمانی اور جذبۂ انقلابی سے محروم کرنے پر پوری قوت اور توانائی صرف ہو رہی ہے، جو نہ صرف عالمِ اسلام کے لیے بلکہ عالمِ انسانیت کے لیے بہت بڑا المیہ ہے۔

روشن پہلو

تاہم اس صورت حال کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں اسلامی بیداری کی لہر موجود ہے، اور یہ جذبہ خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں میں بتدریج بڑھ رہا ہے، اور اس بیداری کے آثار ہر جگہ نمایاں ہو کر سامنے آ رہے ہیں۔ کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے اور کچھ پچھلے ۵۰-۶۰ برسوں کے دوران اسلامی دعوت نے ایسا کام کیا اور ایسا طاقتور لٹریچر تیار کیا، خاص طور پر ممالک عربیہ میں اس بیداری اور اس لٹریچر نے اتنا واضح اثر چھوڑا، اور یہ بیداری اور اسلامی شعور و جذبہ اب اتنا راسخ ہو چکا ہے اور اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے کہ اس کو ختم کرنا اب ممکن نہیں رہا۔

مسلمانوں میں تخریبی کوششوں کے قبول کرنے کی صلاحیت — سب سے بڑا خطرہ

سوال: عالمِ اسلام اس وقت متعدد خطرات سے دوچار ہے، جن میں کمیونزم اور قومیت کے خطرات زیادہ اہم ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے؟

جواب: سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں میں تخریبی کوششوں کے قبول کرنے کی صلاحیت کا خطرہ ہے، جو ان کے شعور کے پوری طرح بیدار نہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان اپنے نفع و نقصان کو سمجھے بغیر تخریبی قوتوں کا تر نوالہ بن جاتا ہے۔ یہ وہ خطرہ ہے، جیسے کسی مریض میں مرض کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس میں مقابلے کی طاقت اور صلاحیت موجود نہ ہو، یا کمزور پڑ جائے، اور اس کا بیماریوں کو دفع کرنے کا مزاج کمزور ہو جائے، اور اس کی وجہ سے وہ بیماریوں کی مزاحمت نہ کر سکے، اور اپنی صحت کے مزاج کو قائم نہ رکھ سکے۔

میں کسی خاص فلسفے یا دعوت کا نام نہیں لوں گا، میں مسلمانوں کی اس کمزوری کو اصل میں باعث تشویش سمجھتا ہوں کہ ان میں غلط، خلاف اسلام اور تخریبی باتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت اور اہلیت پائی جاتی ہے۔ جب تک یہ صلاحیت موجود رہے گی، اس وقت تک اطمینان نہیں کیا جا سکتا، یعنی مزاج کا صالح ہونا اور مقابلے کی طاقت رکھنا ہی کسی جماعت، ملت اور ملک کے لیے اس بات کی ضمانت ہے کہ اس میں کوئی تخریبی قوت خرابی پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر اس میں صالح مزاج نہ ہو، اس میں کوئی کجی پیدا ہو گئی ہے جس کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا﴾ [سورة الأعراف: ١٤٦] ''کہ اگر وہ سیدھا راستہ دیکھ لیں تو اسے اختیار نہیں کرتے، اور اگر ان کو ٹیڑھا راستہ نظر آتا ہے تو اسے فوراً اختیار کر لیتے ہیں۔'' جس گروہ میں یہ صلاحیت ہے کہ غلط چیز میں اس کا ذہن فوراً چل جائے، اور اس کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہو، تو یہ بڑے خطرے کی بات ہے۔

مسلمان ایک ارب کی تعداد میں ہونے کے باوجود قبلۂ اول کو آزاد کیوں نہیں کرا سکے؟

سوال: اس کے اسباب کیا ہیں کہ مسلمان ایک ارب کی تعداد میں ہونے کے باوجود ایک چھوٹی سی اسرائیلی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟ اور قبلۂ اوّل کو یہودی قبضہ سے آزاد نہیں کرا سکے، جو بہت بڑا المیہ ہے؟

جواب: میرے نزدیک حدیث کی روشنی میں یہ بات بالکل قابلِ تعجب نہیں ہے، اور قرآن وصحیح احادیث میں اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، موجودہ صورتِ حال اس کے مطابق ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے اور عنقریب آئے گا کہ جب ہمارے خلاف قومیں اس طرح جمع ہو جائیں گی، جس طرح بھوکے کھانے کے کسی طباق کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے دریافت کیا کہ کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ حضور ﷺ نے جواب دیا: ''نہیں! تمہاری تعداد کم نہیں ہوگی، تم تعداد میں بہت زیادہ ہوگے؛ لیکن تمہارا وزن نہیں ہوگا، جس طرح سیلاب اپنے ساتھ کوڑا کرکٹ بہا کر لاتا ہے اور اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا، اور ایک لہر آتی ہے اور سب کو بہا لے جاتی ہے، تم اس

طرح رہ جاؤ گے۔“(۱)

طاقت کا اصل مرکز قوت ایمانی اور سیرت و کردار ہوتا ہے

اصل میں مسلمانوں اور ملتوں کی طاقت کا اصل مرکز ان کی قوت ایمانی، ان کی سیرت اور کردار ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ کامیابی کا معاملہ ذات پر نہیں، صفات پر ہے۔ کہا گیا: ﴿وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] کہ ”تم ہی سربلند رہو گے اگر تم ایمان کی صفت پر متصف رہے۔“ قوموں کی تاریخ اور تقدیر دونوں یہ بتاتی ہیں کہ تعداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ایک چھوٹی سی تعداد بڑی تعداد پر غالب آ گئی۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی آتا ہے: ﴿كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً﴾ [البقرة: ۲۴۹] کہ ”کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی سی تعداد اور گروہ نے بہت بڑی تعداد پر اثر ڈالا، اور اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔“ مسلمانوں کی اصل طاقت ان کی قوت ایمانی تھی اور ان کے کردار، سیرت و کردار، ان کا خدا سے تعلق، صحیح مقاصد، صالح مقاصد اور ان کے لیے جدوجہد کی صلاحیت جب تک موجود رہی ہے، تو دنیا کی تمام قوتوں پر فتح پاتے رہے ہیں، اور جب یہ چیز جاتی رہی یا کمزور پڑ گئی، تو مسلمانوں کی تعداد بے اثر ہو گئی۔

اسرائیل اور یہودیوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمارے نزدیک ایک معتوب اور مغضوب علیہم ہیں، لیکن خدا کا تکوینی قانون اس عالم میں کارفرما ہے اور اکثر واقعات اسی کے زیر اثر پیش آتے ہیں۔ اس کے لحاظ سے ان کے اندر وہ جذبہ پیدا ہو گیا جو جذبہ تعداد پر غالب آجایا کرتا ہے۔ وہ اسی جذبہ کا کرشمہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں، اور اس کے گرد و پیش جو مسلمان حکومتیں ہیں، ان کے عوام میں یہ جذبہ پایا جائے تو پایا جائے، ان کی اکثریت میں یہ جذبہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمان اس جذبہ کی کمی کی وجہ سے مختصر سی یہودی طاقت پر بھی غلبہ حاصل نہیں کر پا رہے ہیں، یہ بالکل قانون فطرت ہے۔

آج کوئی پُرکشش شخصیت یا طاقتور قیادت موجود نہیں ہے

سوال: اتحادِ عالم اسلامی اب تک کیوں پیدا نہیں ہوا؟ اس کے لیے کی جانے والی کوششیں کیوں کامیاب نہیں ہو سکیں؟ اور ان میں کیا کمی رہ گئی ہے؟ اس مقصد کے لیے متعدد عالمی

---

(۱) رواه أبو داود في سننه، كتاب الملاحم، باب في تداعي الأمم على الإسلام.

تنظیمیں، مؤتمر اور رابطہ، یہ کیوں کامیاب نہیں ہوئیں، جس کی وجہ سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے؟

جـــواب: یہ کوششیں بے نتیجہ تو نہیں رہیں، لیکن ان کے جو نتائج نکلنے چاہیے تھے، وہ حاصل نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسی ذات اور گروہ ایسا موجود نہیں ہے کہ جس کو اعتماد اور محبوبیت اور کامل درجے کا اخلاص حاصل ہو۔ صلاح الدین ایوبی کی مثال سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ مختلف عناصر اور مختلف ممالک کے مسلمانوں کو اُنھوں نے ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا، اس لیے کہ ان میں وہ جذبۂ ایمانی طاری تھا، ان کی حالت اس ماں کی طرح تھی جس کے اکلوتے بچے کو ذبح کر کے اس کی گود میں ڈال دیا جائے، اور جس طرح وہ ماں بے قرار ہو جاتی ہے، اسی طرح وہ فلسطینیوں اور قبلۂ اوّل کو آزاد کرانے اور مسلمانوں کو خطرے سے بچانے کے لیے نہ صرف بے قرار ہو جاتے تھے؛ بلکہ ان پر ایک عجیب قسم کی والہانہ کیفیت طاری رہتی تھی؛ لیکن آج کوئی پرکشش شخصیت یا طاقتور قیادت موجود نہیں ہے۔

اقلیتی ممالک میں مسلمانوں کا رجحان لیفٹ کی جانب کیوں؟

ســـوال: اقلیتی ممالک جہاں مسلمان آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں، وہاں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمانوں میں اسلامی رجحانات غالب ہوتے، لیکن اس کے برعکس وہاں تخریبی اور کسی حد تک غیر اسلامی رجحانات پائے جاتے ہیں، اور ان کا جھکاؤ زیادہ تر لیفٹ کی جانب ہے، مثلاً فلپائن اور فلسطین کی مثال لیجیے۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟

جـــواب: فلسطینیوں اور بعض دوسرے ممالک میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، جو بے چینی پائی جاتی ہے، ان میں اکثر وہ ہیں جو بڑی طاقتوں سے مایوس ہو گئے ہیں، اور ردِ عمل کے طور پر ان میں ہر ایسی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جو ان کو کچھ بھی سکون دے سکے، ان کو حالات کی گہرائی میں جا کر تجزیہ کرنے کی فرصت نہیں ہوتی، اور وہ ہر ایسے تخریبی فلسفے اور تحریک کو، جو ان کے جذبات کی تسکین کرے، اُنھیں امید دلائے، اسے قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے ان میں غیر معمولی قوتِ مقابلہ پیدا ہو گئی ہے، اور اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کا ایسا طاقتور جذبہ پیدا ہو گیا ہے جو مسلم اکثریت رکھنے والے ممالک میں بھی موجود نہیں ہے۔ میں نام لیے بغیر کہوں گا کہ بعض مسلم اقلیت والے ایسے ملک بھی ہیں کہ

ان کے اندر ایسی دینداری اور اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے اور اپنے اسلامی پرسنل لا کے تحفظ کے لیے دینی تعلیم کے نظام کو نہ صرف باقی رکھنے، بلکہ اسے مزید ترقی دینے کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہوگیا ہے جو اکثریتی مسلمان آبادی رکھنے والے ممالک میں بھی مفقود ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی بے وزنی کی سب سے بڑی وجہ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ

سوال: مسلمانوں میں موجودہ انتشار کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسی ایک بھی اسلامی ملک میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی ایسی قیادت موجود ہے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو، اور جس میں کچھ کرنے کی اُمنگ اور جذبہ موجود ہو۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے عالم اسلام میں آپ کی نگاہ کس ملک پر جاتی ہے، جہاں اسلامی نظام کے نفاذ کا تجربہ کیا جائے اور وہ پورے عالم اسلام کے لیے رہنمائی اور قیادت فراہم کرنے کا ذریعہ ہو؟

جواب: میرے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی بے وزنی کی سب سے بڑی وجہ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہے، اور میں جس قدر اس پر غور کرتا ہوں، اتنا ہی مجھے نظر آتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کا زوال مسلمانوں کی اسلامی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ تھا، اور دوسرا المیہ یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سے اب تک کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو خلافت عثمانیہ کی جگہ لینے والی ہو، اور جن لوگوں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ان کو اس کی سزا ملنے کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا، اور حساب بے باق نہیں ہوا، اور جو کچھ آپ فلسطین میں ہوتا دیکھ رہے ہیں، میں اس کا اصل ذمہ دار خلافتِ عثمانیہ سے بغاوت کو سمجھتا ہوں۔

باقی یہ کہ کون سا ملک ایسا ہے کہ جو اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے؟ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر ملک کے مسلمانوں کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں، پھر یہ اس اسلامی ملک کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے جو بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے، اور جس کے قیام کے لیے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں، اور جہاں بہت وسیع امکانات پائے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص نیک کام کرنے کا ارادہ ظاہر کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے

سوال: آپ کے علم میں ہوگا کہ پاکستان کی موجودہ حکومت اسلامی نظام نافذ کرنے

کے لیے اقدامات کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ فرمائیں کہ کیا اسلامی نظام کے لیے کوششیں صحیح طریقۂ کار کے مطابق کی جارہی ہیں؟ یا اس میں کسی ردّوبدل کی ضرورت ہے؟ یا ترجیحی بنیادوں پر کچھ تبدیلیاں کی جانی چاہئیں؟ اس عمل کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: میں تاریخ کے مطالعہ سے اور عملی تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کہ اگر کوئی شخص نیک کام کرنے کا ارادہ یا اظہار کرے، اگر وہ ایک مرتبہ اظہار کرے تو اسے چار بار شاباشی دینا چاہیے، یہ انسانی نفسیات ہے، بجائے اس کے بارے میں بدگمانی اور شک وشبہ کا اظہار کیا جائے، کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں اچھا کام کرنا چاہتا ہوں، مسجد بنانا چاہتا ہوں، تو آپ اگر یہ کہیں کہ ''آپ کیا مسجد بنائیں گے؟ آپ کے باپ دادا نے بھی کبھی مسجد بنائی تھی؟ آپ نے کبھی خواب میں بھی کوئی مسجد بنتے ہوئے دیکھی تھی؟'' تو اس طرح وہ شخص کیسے کام کرے گا؟ اس کی حوصلہ شکنی ہوگی، اس کے بجائے اسے آپ کہیں کہ مبارک ہو! بہت اچھا ہے کہ آپ مسجد بنا کر ایک نیک کام کر رہے ہیں، ہم بھی آپ کا ساتھ دیں گے، آپ ضرور مسجد بنالیں، ہم اس کے لیے دعا بھی کریں گے۔

اسلامی نظام کے قیام کے دو راستے

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ اب راستے دراصل دو ہیں، میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بارے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ میں نے ابھی صنعاء (یمن) میں اپنی مختلف تقریروں میں بھی یہی کہا ہے کہ ایک راستہ یہ ہے کہ جو لوگ اہلِ ایمان ہیں، اسلام کا درد اور جذبہ رکھتے ہیں اور دیندار طبقہ ہے، اور جس کی دینداری سب کو معلوم ہے، وہ طبقہ حکومت کی کرسیوں تک پہنچ جائے، اور ان پر قابض ہو۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو طبقہ اس وقت حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہے، اس میں ایمان پہنچ جائے، اور وہ اس دعوت کا علم بردار بن جائے۔ یہ دوسرا راستہ زیادہ محفوظ اور زیادہ محتاط ہے، اور یہ وہ راستہ ہے جو ہمارے اس برِّصغیر کے سب سے بڑے مصلح اور اسلامی انقلاب لانے والی شخصیت حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اختیار کیا کہ اُنھوں نے سلطنت مغلیہ کے حکمرانوں کو یہ باور کرایا کہ ہم تمہاری حکومت اور کرسیوں پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے، یہ تو ہمارے مقام ومرتبہ سے فروتر بات ہے، ہم اگر اس کو خواب میں بھی دیکھیں تو پریشان ہو جائیں، ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کام ہمارے پیش نظر

ہے اور جس کے کرنے کی ہمیں آرزو اور تمنا ہے اور بڑی سعادت ہے، وہ تم کرو، اور ہم تمہارے ہاتھوں سے یہ کام کرانا چاہتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے ان فرمانرواؤں میں کام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا کیا، اور کہا کہ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ہم یا ہمارے تعلق والے تمہاری کرسیوں پر قبضہ کریں اور تمہیں ہٹادیں؛ بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے اور ہماری دلچسپی اس میں ہے کہ جو کام ہم بحیثیت مسلمان کرنا چاہتے ہیں وہ تم کرو، ہم اس سے راضی ہیں۔

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ ایک راستہ یہ ہے کہ اہل دین حکومت کی کرسیوں پر پہنچ جائیں، یا دین کرسی والوں تک پہنچ جائے، جو لوگ اس وقت اقتدار پر متمکن ہیں، اسلام اور دین ان تک پہنچ جائے، ان کے اندر ایمان پیدا ہو جائے، اور ان میں اسلام کا جذبہ پیدا ہو جائے، اور خدمت کرنے کا داعیہ پیدا ہو جائے، یہ راستہ زیادہ بہتر ہے، یا یہ کہ ان کو کرسیوں سے اتار کر، ان سے کرسیاں چھین کر اقتدار پر قبضہ جمایا جائے۔ اس میں بڑی کشمکش ہے اور یہ بڑا طویل راستہ ہے، اور اس میں کامیابی کا امکان بہت کم ہے۔

یہ وہ چیز ہے جو فرامین نبویؐ میں نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر و کسری کو جو خط لکھے ہیں، اس میں کہا کہ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ اسلام قبول کر لو، اس میں دوہرا اجر ہے۔ یہ تو غیر مسلم کا معاملہ ہے، جب کہ یہاں تو مسلمان موجود ہیں، جبکہ قیصر و کسری دونوں غیر مسلم تھے، ایک عیسائی تھا اور دوسرا خسرو پرویز [آتش پرست] تھا۔ دونوں کو جو خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھے ہیں، اس میں آپؐ نے یہ نہیں لکھا کہ سلطنت ہمارے حوالے کر دو یا دینداروں کے سپرد کر دو، دیندار اس پر بیٹھ کر دین کی خدمت کریں گے؛ بلکہ یہ کہا کہ تم اسلام لاؤ بچ جاؤ گے، تمہاری حکومت بھی محفوظ رہے گی، اور تم بھی محفوظ رہو گے۔ اسلام کا نبوی اور قرآنی مزاج یہ ہے، یہ نہیں کہ پہلے اس پر بے اعتمادی کا اظہار کیا جائے، ان کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی جائے؛ بلکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان کے منہ میں ایمان اور اسلام کا لقمہ رکھا جائے، ان پر اعتماد کا اظہار کیا جائے، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، وہ اگر تھوڑا کام بھی کریں، ایک قدم بھی اٹھائیں، تو اس کو سراہا جائے، اس کا شکریہ ادا کیا جائے، یہ انسانی فطرت ہے۔

سوال: قادیانیوں کا مسئلہ بھی امت مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑے فتنے سے کم نہیں ہے۔!!

جواب: اس بارے میں میرے خیالات معلوم ہیں، میری کتاب ''قادیانیت۔تحلیل و تجزیہ'' کا مطالعہ کیا جائے۔

سوال: ابھی ضیاء الحق صاحب نے قادیانیوں کو اسلامی اصطلاحات سے روکنے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں، وہ آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے؟

جواب: ضیاء الحق صاحب کے متعلق، ابھی میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے، آج ہی پہنچا ہوں، میں کوئی تفصیلی بات تو عرض نہیں کر سکتا؛ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، ابھی جو حال ہی میں انھوں نے اس سلسلے میں اقدامات اور فیصلے کیے ہیں، میرے نزدیک وہ قابل مبارک باد ہیں اور اس پر ان کو بھی مبارک باد دینی چاہیے، اور میں پاکستان کو بھی مبارک باد دیتا ہوں۔

دوسری نشست (بعد نماز فجر):

دوسرے طریقۂ کار پر ایک اشکال

سوال: پچھلی نشست میں جب گفتگو ختم ہوئی، تو بات یہاں تک پہنچی تھی کہ آپ نے فرمایا تھا کہ معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ جو اسلامی لوگ ہوں، وہ کرسیِ اقتدار تک پہنچ جائیں، اور یا یہ کہ جو لوگ کرسیِ اقتدار پر متمکن ہوں، ان کو اسلامی اقدامات پر آمادہ کیا جائے، اور یہ جو دوسری صورت ہے، یہ زیادہ محفوظ اور زیادہ بہتر ہے۔ یہ گفتگو آپ فرما رہے تھے، جس پر پچھلی نشست ختم ہوئی تھی۔

اب اس سلسلے میں ایک دو اشکال پیدا ہوتے ہیں، ان میں سب سے اہم حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا طرزِ عمل ہے کہ آپ نے حضرت زیدؒ کی بھی اور حضرت محمد بن عبداللہ نفس ذکیہؒ کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ باقاعدہ مدد بھی کی؛ حالانکہ اس وقت کے خلیفہ یا بادشاہ آج کل کے لوگوں سے بہرحال زیادہ بہتر مسلمان تھے، اور ان کے زمانہ میں آج کے مقابلے میں بہرحال زیادہ بہتر طور پر اسلامی نظام کارفرما تھا؟

کسی زمانہ پر کسی گذشتہ زمانے کے واقعات کو پورے طور پر منطبق کرنا بڑا نازک کام ہے

جواب: جہاں تک حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی جانب سے حضرت محمد بن عبداللہ نفس ذکیہؒ کی تائید کا تعلق ہے، اس کے اسباب اور محرکات پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے

''امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کسی زمانہ پر کسی گذشتہ زمانے کے واقعات کو پورے طور پر منطبق کرنا، یہ بڑا نازک کام ہے، حالات اتنے بدل جاتے ہیں اور زمانہ کا مزاج اور زمانہ کی نئی مشکلات، نئے مسائل ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ کسی زمانہ کی مثال کسی اور زمانہ کے لیے پورے طور پر صادق نہیں آتی، ماحول کا جائزہ لینا ہوتا ہے، پھر شخصیتوں کا تقابل اور اس زمانہ میں طریقۂ کار کا اندازہ بھی کرنا چاہیے۔

میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مختصر اور خطرات سے محفوظ طریقۂ کار یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت یا کچھ افراد کسی طرح سے اقتدار تک پہنچ گئے ہیں، تو ان سے سو فیصدی مایوسی کی ضرورت نہیں، ان کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنے کو بہتر بنا سکیں، اور ملک کسی بڑے زلزلے اور طوفان سے بچے، اس لیے کہ اس وقت کی سیاسی تحریکیں اور اس وقت کے اقدامات جو ہیں، ان کے محرکات کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خالص اسلامی ہیں، اور ان میں سوائے کلمۂ حق کو بلند کرنے کے اور کوئی جذبہ کام نہیں کر رہا ہے، یہ بڑا مشکل ہے، یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اُس زمانہ میں حکومت کی اصلاح کی کوشش کی، یا انقلاب لانے کی کوشش کی، اُن کی تربیت کیسی تھی، اور اُن میں کس درجہ کا اخلاص تھا؟ اور اِس زمانہ میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، ان میں کس درجہ کا اخلاص ہے، اور ان میں کس درجہ کی صلاحیت ہے؟

ہمیں ذرائع کے بجائے مقاصد پر نظر رکھنی چاہیے

بہر حال میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا راستہ جو ہے، یہ زیادہ مختصر اور محفوظ ہے، ملک ملک کے حالات مختلف ہوتے ہیں، [میں] یہاں پاکستان کے لیے نو وارد ہوں، اور میرا کچھ کہنا اس میں کوئی بڑی سند نہیں رکھتا؛ مگر میں دوسرے عرب ممالک اور اسلامی ممالک کو سامنے رکھ کر یہ کہتا ہوں کہ اکثر اس پر بڑی طاقت ضائع ہوتی ہے اور ایک اندرونی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں ذرائع کے بجائے مقاصد پر نظر رکھنی چاہیے، کوئی مقصد کم سے کم قربانیوں کے ساتھ پورا ہو سکتا ہو، تو پھر وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

مغربی ممالک میں قبول اسلام کے امکانات

سوال: مولانا! یہ فرمائیے کہ اس وقت جو یورپ کی حالت ہے، مغربی ممالک کی ہے،

جواشتراکی مما لک کی ہے، ان میں اس بات کے امکانات کہاں تک ہیں کہ وہاں اسلام پھیلے، وہاں اس کی زیادہ تبلیغ ہو سکتی ہے، اور وہ لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو سکتے ہیں، اس کے امکانات کیا ہیں؟

جواب: میں مغربی مما لک یا اشتراکی مما لک کے بارے میں بہت زیادہ حسن ظن نہیں رکھتا، اور یہ کہنا کہ چند دنوں کی بات ہے اور سب کے سب اسلام قبول کر لیں گے، اس میں خواہش مندانہ طرز فکر کو زیادہ دخل ہے۔ صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ مما لک خود اپنے مسائل میں یا اپنے خود ساختہ نظام میں جکڑے ہوئے ہیں، اور پھر ان میں جو معیار زندگی پیدا ہو گیا ہے، اس کے لیے جس شدید کوشش اور انہماک کی ضرورت ہے، اس نے ان مما لک کو سنجیدگی کے ساتھ کسی ایسے مسئلہ پر غور کرنے سے روک رکھا ہے جو ان میں بنیادی انقلاب لے آئے، جو اس پورے طرز فکر کو اور طرز حیات کو بدل دے جو اس وقت وہاں جاری ہے، بلکہ حاوی ہے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کے بارے میں یہ میں نے اپنے سفروں میں اندازہ کیا ہے کہ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ وقت نکالیں اور سنجیدگی سے کسی مسئلہ پر غور کریں، کسی کو وقت دیں یا کوئی مطالعہ کریں۔ زندگی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اب زندگی ان پر سوار ہے، وہ زندگی پر سوار نہیں، وہ زندگی کے راکب نہیں ہیں، زندگی کے مَرکب ہیں، ان کے لیے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ کچھ وقت نکالیں سوچنے سمجھنے کے لیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عالم اسلام اور مما لک اسلامیہ اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ ان کو دعوت فکر نہیں دے سکتے، وہ خود ان کے دست نگر بنے ہوئے ہیں، اور کاسۂ گدائی لیے ہر وقت کھڑے رہتے ہیں، ان [مغربی مما لک] کے اندر ان [مسلم مما لک] کے لیے، ان کے بارے میں کوئی احترام کا جذبہ نہیں ہے، وہ ایک ایسے مذہب اور اور ایک ایسی دعوت پر غور کرنے کے لیے بہت مشکل سے آمادہ ہوں گے جس کے علم بردار خود ان کے دروازے پر ہر وقت کھڑے رہتے ہیں، اور ایک سوئی تک کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ یہاں بیٹھ کر یہ سمجھنا کہ وہ سب کے سب اسلام پر غور کرنے کے لیے بے چین ہیں، اور وہ اپنی نجات اس میں سمجھتے ہیں، اس میں خوش خیالی کو زیادہ دخل ہے۔

مسلمانوں کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے

سوال: اسلامی دعوتوں اور تحریکوں نے جو کام کیا ہے، اس سے جو بیداری پیدا ہوئی،

اس کے کچھ اثرات تو مرتب ہوئے ہیں، وہاں کچھ نومسلموں کی تعداد بھی سامنے آئی ہے۔!!

جواب: جن لوگوں نے وہاں اسلام قبول کیا ہے، ان کے حالات معلوم کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں کوئی بہت بڑا مقام نہیں رکھتے، اور جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے، وہاں سیاہ فام لوگوں میں جو "بلیک مسلم" (Black Muslim) کہلاتے ہیں، ان میں زیادہ تر پہلے بھی مسلمان تھے، اور انھیں میں کچھ کام ہوا ہے۔ ان ملکوں میں اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے بڑی بلند سطح کی ضرورت ہے، زبان پر بھی بڑی قدرت کی ضرورت ہے، زبان ہمیشہ سے ایک بہت اہم عنصر رہی ہے، زبان اور طرز بیان اور پھر اس کے ساتھ داعیوں کا اخلاص اور ان کا شخصی اثر، یہ سب چیزیں اہمیت رکھتی ہیں، میں کسی کی ہمت شکنی نہیں کرنا چاہتا، جو بھی اسلام کے دائرے میں آئے، اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے اور اس کی بڑی قدر کرنی چاہیے؛ لیکن یہ خیال کہ وہ بالکل اسلام کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور بس اسلام لایا ہی چاہتے ہیں، درست نہیں، مسلمانوں کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، اور اس لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ زیادہ بہتر طریقے پر اسلام کی دعوت کا کام کر سکیں۔

نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لیے کچھ بنیادی نکات

سوال: نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لیے کچھ بنیادی نکات آپ تجویز فرمائیں۔ یہ آپ کا خاص موضوع ہے۔!!

جواب: نظامِ تعلیم بڑا ذمہ دار ہے نئی نسل کے پیدا کرنے کا، بلکہ سب سے بڑا ذمہ دار ہے، اور اس سلسلے میں ابھی تک میرے علم میں کوئی بڑا جامع اور عمیق انداز کا کام نہیں کیا گیا، ویسے تو چند سال ہوئے ملک عبدالعزیز یونیورسٹی کے تحت مکہ معظّمہ میں تعلیم کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا تھا، جس میں میں نے بھی شرکت کی تھی اور بہت سے حضرات دوسرے ممالک سے بھی آئے تھے؛ لیکن اصل میں ابتدائی مرحلہ سے لے کر یونیورسٹی کے مرحلے تک پوری اوور ہالنگ کی ضرورت ہے، پورے نظامِ تعلیم کو مسلمان ملک کی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی اور تمام علوم وفنون میں اسلامی روح پیدا کرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے بڑی مجتہدانہ اور جرأت مندانہ سعی درکار ہے۔

مجھے اس موقع پر بے اختیار مرحوم صدر اقبال اکیڈمی یاد آتے ہیں کہ انھوں نے اس کام کا

آغاز کیا تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک ایک پورا نصابِ تعلیم نیا وضع کیا جائے جس میں اسلامی روح کو پیوست کر دیا جائے، یہاں تک کہ سائنس اور ریاضیات میں بھی ایسی مثالیں دی جائیں اور ایسے نتائج نکالے جائیں جو اسلام کے اصول سے مطابقت رکھتے ہوں اور جو ایمان کو بڑھانے یا کم از کم ایمان کی حفاظت کا کام کر سکیں۔

یہ کام ایک فرد کا نہیں، ایک آدمی کا نہیں؛ [بلکہ] اکیڈمی کا ہے، اور اکیڈمی بھی کیا؛ بلکہ حکومتوں کا ہے۔ اور افسوس ہے کہ حکومتوں کو اپنے مسائل اور مقامی حالات سے اتنی فرصت نہیں مل سکی اور ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی رہی جو پورے نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس کی افادیت بلکہ ضرورت کے پورے طور پر قائل ہوں۔ میرے نزدیک یہ کام جلد سے جلد ہونا چاہیے، اس لیے کہ جو نسل تیار ہو رہی ہے، وہ ان مقاصد کو پورا کرنے کی نہ صرف یہ کہ پوری اہلیت نہیں رکھتی؛ بلکہ بعض اوقات رکاوٹ بنتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں دو طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں: ایک عوام کی طاقت جو اسلام کے سوا کچھ نہیں جانتے اور جن کو اسلام سے محبت ہے، اور ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان مقاصد اور اس طرزِ فکر اور طرزِ حیات کے لیے ہمدردی، گرمجوشی اور اپنے اندر کوئی جوش و خروش نہیں پاتا؛ بلکہ اس کا ذہن اس کو قبول کرنے سے قاصر رہتا ہے اور بعض اوقات وہ اس کے خلاف باغی ہو جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں تضاد کی یہ صورت حال اور ذہنی کشمکش ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے، جن کے لیے معاشرہ وجود میں آیا تھا، بہت مضر ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے نظامِ تعلیم کو بدلنے اور اسے ایک نئی روح اور نئی ترکیب کے ساتھ مرتب کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کون سا ملک اور کون سا معاشرہ اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھاتا ہے۔

صالح و مثالی معاشرہ کا قیام۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت

سوال: مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے آپ کیا ترجیحات تجویز کرتے ہیں، اور انھیں اس کے لیے سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں ایک بھی معاشرہ یا ملک ایسا موجود نہیں جو پوری طرح اسلامی زندگی کی بھرپور نمائندگی کر رہا ہو، اور جس کو دیکھ کر یہ محسوس ہو سکے کہ اسلامی اخلاق کیا ہوتا ہے، مسلمان کیا معاملہ کرتا ہے اور کس طرح وہ ہزار خطرات

کے باوجود سچائی کا دامن نہیں چھوڑتا۔ اس لیے میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا صالح معاشرہ قائم کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کی ان کی روح کے مطابق نمائندگی کرے، اور ان خصوصیات کا حامل معاشرہ ملکوں کی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر جلوہ گر ہو، اپنا وزن محسوس کرا سکے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی صالح انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔

آج پورے عالم اسلام کی کمزوری یہ ہے کہ ہم کسی ایک ملک یا خطے کا نام نہیں لے سکتے جہاں کوئی آنکھ بند کر کے چلا جائے اور دیکھ لے کہ اسلام عملی زندگی میں کیسا ہوتا ہے؟ اسلامی اخلاق کیسے ہوتے ہیں؟ جہاں دیکھا جا سکے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتا، ناپ تول میں کمی نہیں کرتا، دھوکہ نہیں دیتا، مسلمان زر کا پرستار نہیں ہے، وقتی منافع کی خاطر دائمی منافع کو ضائع نہیں کرتا، وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، مسلمان ظلم کرنا نہیں جانتا، اسے سیم وزر کی بڑی سے بڑی ترغیب اور دولت خرید نہیں سکتی، وہ اپنے ضمیر کے خلاف کام نہیں کرتا، وہ جس بات کو حق کہتا ہے اس پر اپنا گھر لٹا سکتا ہے، اور اپنا سر کٹا سکتا ہے، اپنے خاندان کو خطرے میں ڈال سکتا ہے، اور اس کی خاطر اپنے پیٹ پر پتھر باندھ سکتا ہے اور فاقہ کر کے مر سکتا ہے۔

آج پوری دنیائے اسلام کی سب سے بڑی احتیاج، اس کا سب سے بڑا فاقہ، اس کا سب سے بڑا فقر، سب سے بڑی تڑپ اور سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی ایسا معاشرہ قائم ہو جائے کہ جس کی طرف ہم انگلی اٹھا کر فخر سے یہ کہہ سکیں کہ اسلام کو دیکھنا ہے تو اس معاشرے کو دیکھ لو، یہ چلتا پھرتا اسلام ہے، یہ زندہ شریعت محمدی ہے۔

معاشرے تولے جاتے ہیں ناپے نہیں جاتے

سوال: ایسے مثالی معاشرے کے لیے آپ کس خطہ اور ملک میں حالات کو سازگار دیکھتے ہیں؟

جواب: اس کے لیے پاکستان کے علاوہ اور کون ملک ہوسکتا ہے جو اس امید اور اسی دعوے اور دلیل پر بڑی قربانیوں کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا کہ آپ دنیا کو اسلامی معاشرہ دکھا سکیں۔ یہ محدود سے محدود جگہ سہی، اس کا حجم اور رقبہ کچھ سہی؛ لیکن اس میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ قائم کر دیا جائے تو اس کا وزن بڑے بڑے رقبہ والے ملکوں سے بڑھ جائے گا؛ کیونکہ معاشرے تولے جاتے ہیں، ناپے نہیں جاتے، اصل چیز سیرت اور کردار ہے، ایک ایسے

معاشرے کا قیام ہمارے اسلامی تشخص کے لیے بہت ضروری ہے۔

آج ہماری نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں جب ہم سے کوئی یہ پوچھتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات برحق، آپ اسلام کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ سب درست، اور اس نے ماضی میں جو زبردست انقلاب برپا کیا، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، یہ بھی صحیح؛ مگر تم خدا کے لیے یہ بتادو کہ اس وقت کسی چھوٹے سے چھوٹے خطے میں اور معاشرے میں یہ مثالی اسلامی سیرت پائی جاتی ہے جہاں اسلام کی تمام خصوصیات اور برکات موجود ہوں؟ یہاں آکر ہمارا سر شرم کے مارے جھک جاتا ہے اور ہماری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

کرنے کا کام

آج کرنے کا کام یہ ہے کہ پاکستان میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے، جس کو باہر سے آنے والا کوئی غیر مسلم دیکھ لے تو کلمہ پڑھے اور پکار اٹھے کہ ہم نے اس سے بہتر معاشرہ نہیں دیکھا؛ اگر یہ نہیں ہے، آپ کے اندر تمدن کی ساری خرابیاں موجود ہوں، آپ کے اندر حق بات کہنے کی صلاحیت موجود نہیں ہو، آپ عقیدے پر پیسے کو ترجیح دیتے ہوں، آپ کے اندر بھی نسلی، علاقائی، لسانی تعصب موجود ہو، آپ کو دنیا کی کوئی بڑی طاقت خرید سکتی ہو، کوئی دشمنِ اسلام قوم آپ کے افراد کو آلۂ کار بنا سکتی ہو، پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے بھی افراد مل جاتے ہوں، تو آپ یقین جانیں کہ ان باتوں کے ساتھ ہم دنیا پر اسلام کی صداقت ثابت نہیں کر سکتے اور اس طرح دنیا کو مایوس کریں گے، اور یہ ثابت کریں گے کہ ہم دنیا کی نمائندگی اور رہنمائی کے اہل نہیں ہیں، ہم دنیا بھر کے دانشوروں، مؤرخوں، سیاحوں کو مایوس کریں گے۔ اگر وہ پاکستان آئیں اور دیکھیں کہ یہاں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو ہندوستان میں ہو رہا ہے، برطانیہ اور امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں ہوتا ہے؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو رہا ہے جو برطانیہ اور امریکہ میں ہو رہا ہے، وہ سیاسی شعور ہے، شہری میں احساس ذمہ داری ہے، جو بہت سی بدعنوانیوں سے انھیں روکتا ہے، یہاں وہ بھی نہیں ہے، یہ بڑی مایوسی کی بات ہوگی۔

ہوسکتا ہے کہ مجھے پھر یہاں آنے کا موقع ملے یا نہ ملے، اس لیے میں پاکستانی عوام اور اس کی قیادت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک پاکستان میں خالص اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہوگا، اپنا طرز زندگی اسلام کا نمونہ نہ بنالیں گے، اور ایک ایسی فضا قائم نہیں کریں گے جو خالص

اسلامی فضا ہو، یہ مثالی، معیاری اور آئیڈیل معاشرہ جب تک آپ قائم نہیں کریں گے، آپ اپنی ان قربانیوں کی قیمت ادا نہیں کر سکیں گے جو اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے دی تھیں۔ یہ قربانیاں صرف آپ نے نہیں دی تھیں؛ بلکہ لاکھوں افراد نے بھی دی ہیں اور زیادہ دی ہیں، جنھوں نے اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، جن کے حصے میں صرف قربانیاں آئیں، آپ کے حصے میں قربانیاں بھی آئیں اور انعامات بھی آئے۔ آپ ان کو قیامت کے دن کیا جواب دیں گے جنھوں نے قربانیاں دے کر آپ کو اس مقام تک پہنچایا، لیکن آپ نے اسلام کا معاشرہ قائم نہیں کیا؟

امریکہ، مغرب اور اسرائیل بمقابلہ عالم اسلام

حضرت مولاناؒ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام ۲۴-۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو لاہور میں ہونے والے دوروزہ سیمینار میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے تھے، اسی موقع پر ہفت روزہ ''زندگی''، (لاہور) کے نمائندے نے یہ انٹرویو لیا، اور ہفت روزہ مذکور کی اشاعت (۲ تا ۸/ نومبر ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوا۔

مجھے فکرِ اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ سے ایک خاص ذہنی و قلبی تعلق ہے

سوال: مولانا! لاہور آپ کافی مدت کے بعد تشریف لائے ہیں اور یہ سفر بھی آپ نے پیرانہ سالی اور ضعفِ صحت کے عالم میں کیا ہے، اس مرتبہ آپ کے کیا تأثرات ہیں؟ کیا آپ نے لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا، یا پہلے جیسا ہی ہے؟ اہل لاہور کو آپ نے کیسا پایا؟

جواب: جی ہاں! اس سے پہلے میں آخری مرتبہ غالباً ۱۹۷۸ء میں آیا تھا؛ لیکن لاہور سے میرا تعلق بہت پرانا اور گہرا ہے۔ یہ ایک علم دوست اور علم پرور شہر ہے۔ میں نے زمانۂ طالب علمی میں کچھ برس یہاں گزارے ہیں۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ سے قرآن مجید کی تفسیر پڑھی ہے۔

یہ شہرِ اقبال ہے۔ مجھے فکرِ اقبال اور کلامِ اقبال سے ایک خاص ذہنی و قلبی تعلق ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے "رَوَائِعُ إِقْبَال" کے نام سے کلامِ اقبال کے انتخاب کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ عرب دنیا کے اندر اقبال کے فکر و پیغام اور شاعری کو متعارف کرانے میں جتنا کام اس کتاب نے کیا ہے، کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکا۔

مجھے دو مرتبہ اقبال سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں، جب میری عمر محض چودہ پندرہ برس تھی، میں ان کی ایک نظم کا عربی میں ترجمہ کر کے خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر مسرور بھی ہوئے اور متعجب بھی۔ متعجب شاید اس لیے کہ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر کے طالب علم نے ان کے اشعار کا عربی زبان میں ترجمہ کر لیا ہے۔ چنانچہ مجھ سے چند سوالات اس نوعیت کے کیے جیسے وہ اس بات کا اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ یہ ترجمہ واقعی میں نے کیا ہے۔ دوسری ملاقات لاہور ہی میں ان کے انتقال سے چند ماہ پہلے ہوئی، تب علامہ علیل تھے، ان پر نقاہت طاری تھی، اس کے باوجود دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عالم عرب کے حالات کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ ان کے دیرینہ خادم علی بخش نے درمیان میں دو تین مرتبہ آ کر کہا بھی کہ ڈاکٹر جی! کچھ تو آرام کر لیجیے، لیکن ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے آرام کی کوئی پرواہ نہ کی اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

لاہور کے بارے میں تأثرات

سوال: آپ نے عالم اسلام کے تقریباً تمام علمی مراکز اور اہم شہروں کا دورہ کیا ہے۔ دنیا بھر کے بڑے بڑے شہروں اور یونیورسٹیوں میں گئے ہیں، لاہور سے بھی آپ کا تعلق عنفوانِ شباب سے ہے، اب پیرانہ سالی میں بھی یہاں تشریف لائے ہیں، علمی وادبی نقطۂ نظر سے اس شہر کو آپ کیا مقام دیں گے؟

جواب: لاہور کو برصغیر کے تمام شہروں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں علم دوستی کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اسے عروس البلاد کہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کئی ایک اہلِ علم ادیبوں اور شعراء نے یہاں بسیرا کر لیا۔ اورینٹل کالج، لاہور میں برصغیر کے کئی ایک نامور اساتذہ جمع ہو گئے، جن میں کئی ایک السنۂ شرقیہ کے نہایت درجہ ماہر اور فاضلین میں سے تھے۔

یہ اقبال، مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا مودودی کا مسکن رہا ہے۔ میرے مرشد گرامی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری خاص طور پر تقسیم کے بعد گرمیوں کا موسم یہیں گزارتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں جب یہاں پنجاب یونیورسٹی کے اہتمام میں بین الاقوامی اسلامی کلوکیم منعقد ہوا، تو عرب ممالک سے آئے ہوئے اسکالروں نے قادیانیت کے فتنے کو جاننے اور اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے میں بہت دلچسپی ظاہر کی۔ تب عربی زبان میں کوئی تحریر یا کتاب نہ تھی، جو انھیں مہیا کی جا سکتی۔ چنانچہ میرے مرشد گرامی حضرت رائے پوری نے حکم دیا کہ میں اس فتنے کے بارے میں عربی میں تفصیلی کتاب لکھوں جو مناظرانہ رنگ نہ لیے ہوئے ہو۔ چنانچہ میں نے لاہور میں گوشہ نشین ہو کر "القَادِيَانِيُّ وَالْقَادِيَانِيَّةُ" کے نام سے کتاب لکھی، جس کا اردو ترجمہ [1] بھی کئی ایڈیشنوں میں چھپ کر عام ہو چکا ہے۔ حضرت رائے پوریؒ کا انتقال بھی ۱۹۶۲ء میں یہیں ہوا تھا۔

اب میرا لاہور آنا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار میں شرکت کے لیے ہوا ہے۔ تقسیم کے بعد لاہور میں ایک بڑی تبدیلی جو میں محسوس کر رہا ہوں، وہ دینی تعلیم کے مدارس اور مراکز کا فروغ ہے۔ پہلے کے مقابلے میں [اب] کثیر تعداد میں لوگوں کی علم دین کی توسیع کے کام کی جانب رغبت ہے۔ ایک اور مثبت رجحان میں یہاں کے قیام کے دوران دیکھ رہا ہوں، وہ یہ کہ سنجیدہ علمی موضوعات پر خاصی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ مجھے گذشتہ تین چار

---

(۱) القاديانی و القاديانية کا اردو ترجمہ 'قادیانیت۔ تحلیل و تجزیہ' کے عنوان سے ہند و پاک سے شائع ہوا۔

روز کے دوران جو کتابیں پیش کی گئیں، انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ لاہور علم کے رسیا لوگوں کا شہر بن چکا ہے۔

یہ بہت حوصلہ افزا پیش رفت ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ لاہور اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز ہی نہیں، نمونہ بھی بن جائے، اور اس طرح یہ شہر پورے عالم اسلام میں ممتاز ہو جائے۔

عالم اسلام کو درپیش سب سے بڑا چیلنج

سوال: اس وقت عالم اسلام کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے، آپ کے نزدیک اس کی نوعیت کیا ہے؟

جواب: اس وقت امریکہ اور اسرائیل عالم اسلام کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان کے نظام سیاست کو، ان کے نظام فکر کو، ان کے عالمی استیلاء کے امکان کو کوئی چیز چیلنج نہیں کرتی، سوائے مسلمانوں کے متحد و مؤثر وجود کے۔ لہذا پورے مغرب اور عیسائی دنیا اور اس کے ساتھ خاص طور پر یہودی عنصر (جو ان مغربی ممالک کے شانہ بشانہ ہے) کی کوشش ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں دین کی حمیت ختم ہو جائے، دین سے انتساب پر جو فخر ہے وہ ختم ہو جائے، دین کا جو سرچشمہ ہے (یعنی ایمان) ختم ہو جائے، اور اس کے اندر اس کے متبادل طریقہ پر احساس کمتری (Inferiority Complex) پیدا ہو۔

مغربی طاقتوں کے ہتھکنڈے

سوال: اس کے لیے وہ کیا ہتھکنڈے استعمال میں لا رہے ہیں؟

جواب: مغربی طاقتوں نے اپنی ذہانت سے بالکل صحیح سمجھا کہ محض فوجی برتری و اقتدار اور محض سیاسی تنظیم و استحکام اور نئے اور مؤثر اسلحہ و طریق جنگ کافی نہیں، کسی ملک یا قوم کو مستقل طور پر غلام رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کا تعلیم یافتہ اور مثقّف طبقہ (Intellectual Class) قوت حاکمہ سے ذہنی طور پر مرعوب ہو۔ اس کے لیے انھوں نے مستشرقین (Orientalist) کو تیار کیا۔ بہت کم لوگوں نے اس راز کو سمجھا ہے کہ مستشرقین محض اپنے علمی ذوق کی بنا پر تحقیق و تصنیف کا کام نہیں کرتے، علمی ذوق تو محدود ہوتا ہے؛ لیکن استشراق کے پیچھے سیاسی و استعماری مقاصد اور سرپرستی کام کرتی ہے۔ یہ اس زمانہ کا بڑا خطرہ ہے اور اس خطرہ کا جو مرکز ہے، اس کو اور اس کے ہتھیار اور ہتھیار استعمال کرنے والوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مستشرقین اور خدمت استعمار

سوال: کیا سب مستشرقین نے صرف استعمار کی خدمت کے لیے علمی کام کیے اور اس میں عمریں صرف کر دیں؟

جواب: مستشرقین اور ان کی تحقیقات، دعاوی اور مباحث سے مغربی استعمار نے جو کام لیا، وہ ان کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب سے مغربی استعمار مشرقی ممالک سے بے دخل ہوا، یا بعض جگہ بالکل کمزور ہو گیا، اس مدت میں مستشرقین کا کام بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، نہ صحافت کو انحطاط ہوا ہے اور نہ ریڈیو کو، اور جو طریقے ہیں خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے، ان میں صرف انحطاط ہی نہیں؛ بلکہ اضافہ ہوا؛ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مستشرقین کا کام بالکل ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ کبھی کوئی کتاب آ جاتی ہے، اس میں وہ طاقت نہیں ہوتی، وہ قوت استدلال نہیں ہوتی جو پہلے ہوتی تھی۔ مستشرقین کا وجود محض عالم اسلام کے علمی، مذہبی طبقہ کے اعتماد کو کمزور و متزلزل کرنے کے لیے اور ان کے اندر اپنے دین کے بارے میں اور قرآن کے بارے میں اور پھر فقہ و کلام کے بارے میں اعتماد کو متزلزل کر دینا تھا۔

نئی نسل کے نوجوان اور مغربی لٹریچر کا مطالعہ

سوال: لیکن ہماری نئی نسل کے نوجوانوں میں کتنے ہوں گے جو مستشرقین کی کتب کو بالاستیعاب پڑھتے ہیں؟

جواب: مغرب سے آئے ہوئے رسائل و جرائد تو شوق سے پڑھے جاتے ہیں، ان میں جو تحریریں اسلام، مسلم ممالک اور مسلم معاشروں کے بارے میں چھپتی ہیں، وہ سب مستشرقین کی کتابوں اور انداز فکر سے متاثر ہو کر بلکہ رہنمائی حاصل کر کے لکھی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان میں صورت حال قدرے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اب تک برصغیر میں ایسے علماء، محققین اور شعراء۔ جیسا کہ مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال ہیں۔ پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے محکم دلائل اور استدلال کی قوت سے کام لے کر مغربی افکار و علوم کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت کو نہایت عمدہ طریق اور اسلوب کے ساتھ ذہنوں پر واضح کیا اور اس کا اثبات بھی کیا، جس سے یہاں کی نئی نسلیں بھی متاثر ہوئیں۔
لیکن عرب دنیا میں صورت حال ایسی نہیں، وہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر احساس

کمتری پیدا ہو رہا ہے۔ وہ جو کتابیں پڑھتے ہیں، فرنچ میں، انگریزی میں، یہاں تو اس کا کم رواج ہے، بعض دوسرے ملکوں میں خاص طور پر فرانس کے مقبوضات میں (مغربی شمالی افریقہ کا علاقہ فرانس کے ماتحت رہا ہے، مراکش اور الجزائر بھی فرانس کے ماتحت رہے ہیں، یہاں تک کہ لیبیا، طرابلس تک فرانس کے ماتحت رہے ہیں) تو یہاں فرنچ لٹریچر اور دوسرے ملکوں میں انگلش لٹریچر پھیلا ہوا ہے، اس میں یہ سب اثرات ہیں۔

اس وقت ممالک عربیہ امریکہ اور اسرائیل کا نشانہ بن چکے ہیں

سوال: لیکن الجزائر میں تو پچھلے سات آٹھ برسوں کے دوران بہت بڑی اسلامی تحریک اٹھی ہے اور اسے عوامی مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے؟

جواب: یقیناً ایسا ہوا ہے؛ لیکن وہاں کے حکمران طبقوں، وہاں کی سول بیوروکریسی اور وہاں کی فوجی قیادت پر جو لوگ چھائے ہوئے ہیں، وہ تو سب اسی مغربی لٹریچر سے شدید متاثر ہیں۔ ان کے اندر احساس کمتری اس قدر زیادہ ہے کہ سخت ظلم و ستم سے کام لے رہے ہیں۔

میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل تشویش اور حزن و فکر کی بات یہ ہے کہ ممالک عربیہ اس وقت امریکہ اور اسرائیل کا نشانہ ہیں۔ ان کا یہ حملہ بہت حد تک کامیاب ہے۔ وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ (جو قیادت کے منصب پر عام طور پر فائز ہوتا ہے) جیسا کہ میں نے اوپر واضح کیا، احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا ہے، وہ اسلام کے مستقبل سے گویا مایوس ہوتا جا رہا ہے، خاص کر الجزائر اور مصر پیش پیش ہیں۔ وہاں کی قیادتیں اور حکومتیں دینی دعوت اور حکومت سے بہت زیادہ خائف ہیں۔ وہاں اصل ٹکراؤ دینی نشأۃ ثانیہ کی تحریک و دعوت سے ہے۔ حکومتوں اور دین پسند اور اسلام پسند طبقوں کے درمیان محاذ قائم ہے؛ حالانکہ الجزائر، طرابلس، المغرب اور مصر یہ وہ ملک ہیں جن میں تحریک آزادی کی قیادت علماء نے کی؛ لیکن آج ان ممالک کے حکمران طبقے سب سے بڑا خطرہ دین کے داعیوں اور اسلامی قائدین کو سمجھتے ہیں۔ مصر میں شیخ حسن البنا کو خطرہ سمجھا گیا، وہ شہید ہوئے۔ عبدالناصر کا زمانہ آیا تو سید قطب کو شہید کیا گیا اور کتنی جانیں شہید ہوئیں۔ مصر اور الجزائر کی حکومتیں خاص طور پر دین کے جذبے کے بیدار ہونے، دینی حمیت کو اور یہ کہنے کو کہ "یہ اسلامی شریعت کے خلاف ہے"، "یہ حکومت کیوں کر رہی ہے؟" اس کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتی ہیں۔ ان کو خطرہ نہ اب اسرائیل سے ہے، نہ کسی اور غیر مسلم طاقت سے ہے، اب اگر خطرہ ہے تو صرف دینی عناصر سے، یہ بڑا المیہ ہے۔

برصغیر کے دینی علم اور شعور رکھنے والے نوجوان عربوں کو متأثر کرنے کی صلاحیت پیدا کریں

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک حل یہ ہے کہ برصغیر کے دینی علم اور شعور رکھنے والے نوجوان اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کریں کہ عربوں کو متأثر کرسکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان و ادب پر انھیں مکمل گرفت حاصل ہو۔ ان کی زبان میں وہ تاثیر ہو اور وہ شگفتگی، جاذبیت و ادبیت ہو کہ عرب اسے پڑھ کر متأثر ہوں اور کہیں کہ کیا خوب لکھا ہے!!۔

اہل پاکستان کے لیے خصوصی پیغام

سوال: اہلِ پاکستان کے لیے آپ کا خصوصی پیغام کیا ہے؟

جواب: پاکستان جس مقصد کی خاطر قائم کیا گیا، جو اصل بنیاد ہے، اس پر اس کے معاشرے اور اس کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ کی تعمیر نو کی جائے، یہاں کی معاشرتی زندگی، یہاں کی ثقافت، حتی کہ رسوم ورواج کو اسلام کی تعلیمات اور قرآن وسنت کی واضح ہدایات میں ڈھال دیجیے۔ یہ کام آپ کرلیں گے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اللہ آپ کی خصوصی حفاظت فرمائے گا، غیب سے مدد آئے گی، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ [محمد: ۷] کہ "اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ یقیناً تمہاری مدد کرے گا۔" یہاں اللہ کی مدد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے، صرف زندگی کے ایک گوشے میں نہیں، بلکہ حیات انفرادی اور اجتماعی کے ہر ہر گوشے اور شعبے میں۔

اگر آپ یہ کام کرلیتے ہیں تو میں یقین دلاتا ہوں، "تاریخ دعوت وعزیمت" کے مصنف اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو عالم اسلام کے علاوہ پوری دنیا میں گھوما پھرا ہے، وہاں کے علمی مراکز میں گیا ہے، اصحابِ فکرونظر سے ملا ہے، کہ اسلام پر پورے اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کے نتیجے میں آپ کو کہیں سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اللہ تعالیٰ براہ راست آپ کی مدد اور نصرت وحمایت کرے گا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی نعمت کا تصور کیا جاسکتا ہے؟..!!!

دنیا کو سچے اور باکردار مسلمانوں کی ضرورت ہے!

حضرت مولاناؒ محرم ۱۴۰۰ھ/نومبر ۱۹۷۹ء میں دوحہ (قطر) میں منعقد تیسری عالمی سیرت نبوی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، اس موقع پر مصر کے ایک صحافی جابر رزق نے یہ انٹرویو لیا، جس کو مصر کے مشہور ماہنامہ "الدعوۃ" نے شائع کیا۔ اس کا یہ ترجمہ مولانا خالد صاحب غازیپوری ندوی (استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) کے قلم سے پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/مارچ ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا تھا۔

ہندوستانی مسلمان

سوال: کیا آپ ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلے میں کچھ بتائیں گے؟ نیز فرقہ وارانہ فسادات کی حقیقت اور اس کے اسباب پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب: اس نازک اور دقیق موضوع پر تبصرہ کرنے اور اس کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہوئے کسی قسم کا جائزہ لینے کے لیے ایک طویل وقت چاہیے، تا کہ سیر حاصل گفتگو ہو سکے، جس کے لیے اس موقع پر گنجائش نہیں۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی اسلامی اور دعوتی زندگی کی راہ میں بہت سے ایسے مسائل ومشکلات کا سامنا ہے جس سے گزر جانا بہت دشوار اور انتہائی صبر آزما ہوا کرتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود وہ خدا کے فضل وکرم سے اسلامی اقدار کی حفاظت، ملی تشخص کی بقا کے لیے ہر طرح کی تگ ودو سعی جاں گسل میں مصروف ہیں، اور ان شاء اللہ لاکھوں دشواریوں کے باوجود وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کریں گے؛ بلکہ اس کے لیے وہ اپنے آپ کو وقف کیے رہیں گے۔ اور یہ اسپرٹ محض اللہ رب العزت پر ان کے کامل اعتماد اور نبی عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے گہری عقیدت اور بیکراں محبت، نیز دین وایمان کے مرکز، وحی وقرآن کے مہبط سے والہانہ لگاؤ وتعلق اور غیر متزلزل بے پایاں عقیدت کی وجہ سے ہے، نیز ہر وہ چیز جس کا اسلام یا داعی اسلام (عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ) سے کسی قسم کا تعلق ہے، صبر وتحمل اور استقامت کے ساتھ اس پر پوری قوت کے ساتھ جمے رہنے کی بدولت اور ہر قسم کے طوفان و حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے باعث ہے۔ اگر ان کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی تو کبھی وہ گھٹنے ٹیک دیتی، اس کے شخصی اور ملی اقدار ختم ہو چکے ہوتے، بلکہ اس قوم کا نام ونشان تک مٹ گیا ہوتا؛ لیکن یہ قوم اپنے دین وعقیدہ اور مقصد میں دوسروں سے بہت ممتاز ہے۔

نازک ترین مسئلہ

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کی ناہمواری بلکہ انتہائی کشیدگی ہی سب سے بڑی مشکل اور نازک ترین مسئلہ ہے، اس کے بہت سے ایسے اسباب ہیں جن کی جڑیں ہندوستانی معاشرہ اور اس کی سیاسی تاریخ میں بہت گہری ہیں۔ ان میں اکثر وہ ہیں جو استعماری عفریت کی پیدا کردہ ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں برابر معرکہ آرائی ہوتی رہی؛ بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تیزی آتی گئی اور دلوں میں بغض وحسد، نفرت وکینہ کی بھٹی سلگتی رہی، جس کی وجہ سے اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، لہذا ایک جا رہنے کے باوجود بالآخر دونوں دھڑوں میں تقسیم ہوگئے، اور نتیجتاً برصغیر دو حصوں میں منقسم ہوگیا، اور مستقل طور پر دو جمہوریتیں پاکستان و ہندوستان کے نام سے قائم ہوگئیں۔ اس سیاسی صورت حال نے دونوں کے دلوں میں تلخی وشکر رنجی پیدا کردی، اور آپس میں انس و یگانگت کے بجائے شک وریب کی فضا قائم کردی، اور ہر ایک کو ایک دوسرے کے معتقدات، تہذیب وتمدن اور ثقافت سے بہت دور کردیا، اور گریز ونفرت کو ہوا دی۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس سے ہندوستانی مسلمان آج دوچار ہیں۔

اس کا شمار ان اوّلین اسباب میں ہوتا ہے جس کا براہ راست مسلمانوں کے خلاف ہر کارروائی میں اثر ظاہر ہوتا ہے، خواہ اس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں ہو یا قتل وغارت گری کی صورت میں، خواہ مابین محاذ آرائی، جھڑپوں اور ٹکراؤ کی شکل میں ہو۔ اس ایک مسئلہ نے بہت سے مسائل پیدا کردیے ہیں، مثلاً سرکاری ونیم سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی مشکلات کا پیش آنا، خاص طور پر سرکاری نصاب کی کتابوں کے وہ تاریخی مضامین جن میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف زہرافشانی کی جاتی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے متعلق وہ اعمال واخلاق اور واقعات منسوب کیے جاتے ہیں جو کسی شریف انسان کے شایان شان نہیں، چہ جائیکہ کسی رسول کی نسبت ایسی بات کہی جائے، جس کی وجہ سے ہر مسلمان کا دل ودماغ مجروح ہوتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ ان کتابوں میں ہندوستان کی اسلامی شخصیات کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں ہوتا، خواہ وہ اللہ کے نیک بندے صلحاء واولیاء ہوں یا عدل پرور سلاطین یا دوراندیش منتظمین اور

نامی گرامی عبقری علماء یا اساتذۂ فن شعراء اور ماہرین فن خطباء ہوں، اور اگر کبھی کسی کا تذکرہ ہوتا بھی ہے تو تشنہ و نامکمل، اور بسا اوقات ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جاتی ہیں جو ان کے مقام سے فروتر اور شان و مرتبہ سے گری ہوئی ہوتی ہیں۔

اردو مختلف علوم وفنون اور ثقافت کا خلاصہ ہے

اسی طرح زبان کا بھی مسئلہ ہے، اردو زبان (جو مسلمانوں کی قومی زبان ہے) جو ہندوستانی باشندوں کے مختلف عناصر کے باہم اجتماع سے پیدا ہوئی ہے، دراصل وہ مختلف علوم و فنون اور ثقافت کا خلاصہ اور چار قدیم زبانوں (سنسکرت، عربی، فارسی اور ترکی) کی پیداوار ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں اس نے انگریزی زبان کے بہت سے ایسے مفردات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے جو زبان زد عوام و خواص ہیں۔ اس طور پر ہندوستانی قومیت کی بہترین ترجمان اور نمائندہ زبان ہے، عوام کے اظہار رائے کا ذریعہ ہے، نیز سیاست، صحافت اور بلند علوم و ثقافت کی بھی نقیب ہے۔

اسے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور اس کے مختلف حصوں میں (جہاں کوئی خاص زبان بولی جاتی ہے) اظہار رائے کا ذریعہ اور رابطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یوپی، بہار، دہلی اور اس کے اطراف واکناف نیز حیدرآباد دکن کے عوام اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، یہی وہ واحد زبان ہے جو ہندوستان کے ہر حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان میں بہت سے رسالے، اخبارات اور پرچے شائع ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی تعداد انگریزی کے مشہور اخبارات و مجلّات کے پڑھنے والوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔

اس زبان کی طرف مسلمانوں نے اپنے برادران وطن غیر مسلموں سے کہیں زیادہ توجہ کی، اسی کو تقریر و تحریر کا ذریعہ بنایا؛ کیونکہ مطلوبہ مقصد اس سے پورا ہو جاتا ہے اور مافی الضمیر کی ادائیگی ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے اس میں بہتر طور پر کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں اس کے رواج پانے اور بول چال میں عام طور پر استعمال کرنے کی اصل وجہ یہی ہے۔

اردو اسلامی علوم وفنون اور آداب سے مالا مال ہے

یہ زبان اسلامی علوم وفنون اور آداب سے مالا مال اور اس کے مختلف گوشوں پر حاوی ہے۔ اس سلسلے میں اسے فارسی زبان پر بھی سبقت حاصل ہے، جسے طویل عرصے تک ہندوستان کے

اسلامی دور میں سرکاری سرپرستی حاصل رہی اور اسے بڑھنے سنورنے کا خوب موقع ملا۔ جزیرہ نمائے ہند میں اردو زبان اسلامی علوم وثقافت کی نقیب اور اظہار رائے کا ذریعہ ہے۔ برطانوی عہد میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت حاصل تھی، عدلیہ، دفاتر اور مدارس میں اسی زبان کا چلن تھا، تا آنکہ انگریزوں نے بعض سیاسی اغراض ومقاصد کے تحت ہندی زبان کی تشجیع کی اور دونوں زبانوں میں معرکہ آرائی شروع کرادی، اور اس طرح مسلم وغیر مسلم کی تفریق زبان کی حیثیت سے بھی ہو کر رہی، اور دونوں جماعتوں میں بغض وکینہ اور نفرت کا تخم پرورش پانے لگا۔ ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد اس کا مسئلہ اور سنگین ہو گیا۔

اردو کے ساتھ سوتیلا پن کا سلوک

غیر مسلموں نے تقسیم ہند کے بعد اس کے ساتھ معاندانہ اور سوتیلا پن کا سلوک کیا۔ اس کو ہر طرح اور ہر اعتبار سے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ حساس ونشیط جگہوں اور فعال ومتحرک مرکزوں سے اسے نکال باہر کیا گیا، کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ عملی طور پر صرف مسلمانوں کی زبان ہے؛ لیکن یہ زبان اپنی لطافت وحلاوت، شیرینی وصباحت، ذاتی قوت وعمدہ اسلوب اور سہل الحصول، سہل الأداء ہونے نیز اپنے حسن وجمال کی بدولت نہ صرف باقی رہی؛ بلکہ حیرت انگیز طور پر ترقی کرتی رہی، جس کی مثال دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود وہ تیز گام ہے، اور آج اسے عالمی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

اقتصادی مسئلہ

اسی کے ساتھ اقتصادی مسئلہ بھی ہے، اشیائے خوردنی کی مصیبت، مواقع خدمات سے محرومی، ملازمتوں میں عدم مساوات، پولیس، فوج اور دوسری اہم اور بنیادی سروسوں میں ان کے حق میں طوطا چشمی اور اس جیسی دوسری دشواریوں کا بھی سامنا ہے؛ حالانکہ مسلمان اپنی ذاتی ذکاوت، ذہانت اور استعداد وصلاحیت میں دوسروں سے کسی طرح کم نہیں؛ بلکہ ماضی کی طرح آج بھی اس میں آگے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی مشکلات ہیں، جن کا احصاء مشکل ہے۔

ان مسائل ومشکلات کا واحد حل

لیکن میرا خیال ہے کہ جذبات کے مقابلہ میں اگر عقل سے کام لیا جائے اور مسلمان پورے

اخلاص کے ساتھ اسلامی دعوت کو لے کر عوام کی رہنمائی، نیک بختی، مخلوق کی خدمت اور خیر خواہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اٹھ کھڑے ہوں، اور بنی نوع انسان کے انجام پر ترس کھا کر دنیا و آخرت میں انھیں تباہی سے بچانے کی فکر کریں، اور وہ ایسی کتابیں اور پمفلٹ شائع کریں جن میں علوم اسلامیہ کی تشریح دلنشیں انداز میں کی گئی ہو اور سیرت نبوی کے حسین بابوں کو ہندوستان کی علاقائی زبانوں اور خصوصاً ہندی زبان میں حسین پیرایۂ بیان، خوشنما اسلوب اور ترقی یافتہ شکل میں پیش کرنے کی توفیق ہو جائے، اور ہندوستانی معاشرہ میں وہ اپنی دعوت لے کر گھس جائیں، روحانی و اخلاقی تفوق اور ملک وقوم کے لیے وفاداری، اس کی رفاہیت و ترقی میں اپنی کوشش اور برتری ثابت کر دیں، تو ان مشکلات کو حل کیا جا سکتا ہے۔

تحریک پیام انسانیت کی تشکیل

انھیں سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ''تحریک پیامِ انسانیت'' کی تشکیل کی، اور ہزار دشواریوں، رکاوٹوں، ماحول کی برہمی، زمانے کی کشمکش اور مصروفیات کی کثرت کے باوجود وسیع پیمانے پر دوروں کا اہتمام کیا، تاکہ سیدھے سادے اسلوب، ماہرانہ اور لطیف انداز میں ہندوؤں اور غیر مسلموں کو اسلام کے آفاقی تعلقات سے قریب کیا جائے، اور انسانی قدروں سے روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلے میں مجھے ان کی رغبت و دلچسپی اور انسانی تعلیمات کی پیاس کا مشاہدہ ہوا۔ اور ظاہر ہے یہ ساری چیزیں اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتی ہیں؟

خدا کا شکر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کی طرف سے اس دعوت کا خیر مقدم کیا گیا اور اسے وہ قبولیت حاصل ہوئی جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ اگر موقع محل اجازت دیتا تو اس مبارک تحریک کے چند تأثرات نمونہ کے طور پر پیش کرتا۔ مسلمانوں کو خصوصاً ہندوؤں سے متعارف کرانے کے سلسلے میں ایک کتاب بھی (ہندوستانی مسلمان) کے نام سے لکھی جو ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' (لکھنؤ) سے تینوں زبانوں (اردو، ہندی، انگریزی) میں شائع ہو چکی ہے۔

عالم اسلام کو مضبوط پوزیشن کی ضرورت

سوال: دنیا کے مختلف حصوں میں مسلم اقلیات پر ہونے والے تشدد اور خونریزی کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے، اور اس سلسلے میں عالم اسلام کا اپنے مظلوم بھائیوں کے حق میں کیا رول ہونا چاہیے؟

جــــواب: اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر، ان کی متعدد تحریکیں اور پارٹیاں اسلام اور ایمان کے نام پر متحد ہو جائیں، اور عقیدہ، اصول اور مقصد کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کریں، یہاں تک کہ ان کا ایک ایسا مضبوط بلاک ہو جس سے مشرق و مغرب ہراساں اور دائیں و بائیں بازو کی طاقتیں ہر وقت ترساں ہوں، تمام حکومتیں اپنے فوجی استحکام کے باوجود خائف ہوں، تخریبی طاقتیں، دہشت پسند جماعتیں، گمراہ کن تحریکیں اس کی طرف نظر اٹھانے کی بھی جرأت نہ کر سکیں، خواہ وہ کینہ پرور مسیحیت ہو یا مکروفریب کا پتلا اشتراکیت یا مسلمانوں کی ازلی دشمن صہیونیت یا اور کوئی بھی تحریک ہو، یہاں تک کہ عالم اسلام کا سیاسی، معنوی اور مادی ایک وزن ہو اور وہ ہر چیز میں خودکفیل ہو، وہ دینے کی پوزیشن میں ہو، دوسروں کا دست نگر ہرگز نہ ہو۔

اینٹ کا جواب پتھر سے

الغرض جب کوئی مصیبت زدہ و مظلوم اور مدد و نصرت سے مہجور، کوئی رنجور شخص آبادی سے دور "وَامُعْتَصِمَاہ" کی صدا لگائے، تو دنیائے اسلام پورے اعتماد کے ساتھ لبیک کہہ اٹھے اور اس کی مدد کو علی الفور پہنچ سکے، اور ہر ظلم و زیادتی بغاوت و سرکشی کی کلائی موڑ دے، اینٹ کا جواب پتھر سے دے تاکہ دوسروں کے لیے عبرت ہو اور کوئی شخص مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کی جرأت نہ کر سکے، تب عالم اسلام کی بات سنی اور مانی جائے گی اور دنیا کے نقشہ میں اس کا وزن ہوگا، ایک خوددار عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

وَنُنْكِرُ إِنْ شِئْنَا عَلَى النَّاسِ قَوْلَهُمْ
وَلَا يُنْكِرُوْنَ الْقَوْلَ حِيْنَ نَقُوْلُ

(ہم جب چاہتے ہیں لوگوں کی باتیں رد کر دیتے ہیں، لیکن ہماری بات رد نہیں کی جاتی۔)

میں اس پوزیشن کو ان تمام شر انگیزیوں اور تباہیوں کے لیے، جس سے اسلامی دنیا دوچار ہے، ایک مضبوط بند اور کارگر حربہ تصور کرتا ہوں، اسی طرح اسلام کے مقدس مقامات، مقبوضہ عرب علاقوں کی بازیافت، ظالم سے ظلم کا بدلہ لینے، اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو واپس لانے اور ہر معرکہ میں غلبہ و کامیابی انشاءاللہ صرف اسی طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر عالم اسلام میں کوئی خوددار، غیور، مخلص باکمال، صاحب عزم و حزم اور حطین کے بطل جلیل سلطان صلاح

الدین ایوبی کی سی صفات کا حامل شخص پیدا ہو جائے تو اس قسم کی وحدت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کوئی مشکل امر نہیں۔

فی الحال مسلمانوں کو مختلف ذرائع اور اسلوب سے اپنے مسلم بھائیوں کو مادی اور معنوی تعاون پیش کرنا چاہیے، کیونکہ مسلم اقلیت کو دنیا کے مختلف حصوں میں تبشیری حملوں اور دوسری بہت سی گمراہ کن تحریکوں کا سامنا ہے، اور اکثر و بیشتر انھیں مادی تعاون (کپڑا، دوا اور غذا) کے جال میں پھانسا جاتا ہے، لیکن دنیائے اسلام کے مسلمانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اصحاب کہف کی زندگی مسلم نوجوانوں کے لیے اسوہ ہے

سوال: دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی پیش رفت کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور مسلم نوجوانوں کے حق میں آپ کی کیا نصیحت ہے؟

جواب: ہر وہ شخص جو روئے زمین پر اسلام کو غالب اور نمایاں حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ جب اسلام کو غالب انداز میں اپنا رول ادا کرتے ہوئے اور شیطانی قوتوں کو مغلوب و مقہور ہوتے ہوئے دیکھے تو لازمی طور پر اس سے اس کو خوشی ہوگی، اس کا دل مسرور اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

اور رہے وہ مسلمان نوجوان جو اسلام و دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ان سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اللہ رب العزت نے محمد رسول اللہ ﷺ کو جب مبعوث فرمایا تو آپ نے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی، لہٰذا سلیم الفطرت، پختہ عقل اور ایسے مضبوط دل لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے جو اللہ عزوجل کے سوا کسی سے ڈرتے نہیں تھے۔ ان کی حالت اس سلسلے میں اصحاب کہف سے زیادہ مشابہ تھی، جو ظلم و زیادتی کے باوجود اللہ پر ایمان لائے تھے اور اسی پر باقی رہے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے: ﴿ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنَاهُمْ هُدًى ٥ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلٰهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ٥ هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْ لَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ٥ ﴾ [الکھف: ۱۳-۱۵] ''بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید ترقی دی تھی، ان کے دلوں کو تقویت بخشی جب انھوں نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ ہمارا معبود تو وہی ہے جو آسمانوں

اور زمینوں کا پالنہار ہے، ہم اس کے علاوہ کسی اور کو معبود نہیں پکاریں گے، اگر ایسا ہوا (کسی اور کی پرستش کی) تو بڑی بیجا بات ہم نے کی، یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، پھر یہ ان پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ بھلا اس سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر بہتان باندھے۔!!'' یہ نوجوان ہر قسم کی ستم رانیوں کا نشانہ اور ظلم وزیادتی سے دوچار تھے، اس سے پہلے ان سے کہا گیا تھا: ﴿ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوْا أَنْ يَقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ﴾ [العنکبوت: ۲-۳] کہ ''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر انھوں نے 'ہم ایمان لے آئے' کہہ دیا تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہ ہوگی، حالانکہ ہم نے ان کو آزمایا تھا جو اُن سے پہلے تھے، اللہ ضرور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان میں سے سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟''، تو یہ لوگ ہر مصیبت کے لیے سینہ سپر ہوگئے، اور پہاڑوں کی طرح جم گئے، اور انھوں نے یہ بات کہی کہ ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ﴾ [الأحزاب: ۲۲] ''اس بات کا تو ہم سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔''

زمانہ آج اسی ہیئت پر واپس آچکا ہے جس پر اس کی گردش بعثت کے وقت تھی۔ آج کی دنیا دوبارہ دوراہے پر کھڑی ہوئی ہے، لہٰذا مسلم نوجوان اپنی توانائی، جان و مال کی قربانی، ناز و نعمت، آرام وراحت، خوشحالی و آسودہ حالی کو داؤ پر لگا کر میدان میں اتر آئیں (خصوصاً عرب نوجوان کیونکہ انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کا شرف اور آپ کے خاندان وقبیلہ سے یک گونہ نسبت حاصل ہے) تاکہ دنیا ہلاکت سے بچ جائے اور اس کا قافلہ صحیح سمت میں رواں دواں ہو سکے اور پوری زمین کا نقشہ ہی بدل جائے، یا پھر وہ حرص وطمع کے اسیر اور وظائف ومناصب کے حصول کی تگ ودو، اپنی آمدنی کو بڑھانے، تجارت میں نفع خوری، جائیداد میں پیداوار کی زیادتی اور ناز ونعمت اور راحت وسکون کے اسباب مہیا کرنے میں منہمک رہیں اور دنیا ہلاکت کی گود میں آخری لمحات بھی گزار کر معدوم ہو جائے۔

یقیناً دنیا سعادت سے ہمکنار نہیں ہوسکتی جب تک کہ مسلم نوجوان اپنی جرأت و بیباکی، تگ و دو، ضبط وتحمل اور عزم وحوصلہ سے کام لے کر مشکلات کی خلیج پر آہنی پل نہ تعمیر کردیں۔ بیشک زمین کی روئیدگی کے لیے کھاد کی ضرورت ہوتی ہے، اور انسانی زمین کی کھاد جس سے انسانیت کی کھیتی اگتی اور کونپلیں نکلتی ہیں اور اسلام کی کھیتی ہری وشاداب ہوتی ہے، وہ خواہشات اور ذاتی مفاد کو اسلام کی

سربلندی وسرخروئی کے لیے قربان کرنا ہے تاکہ دنیا میں امن وسلامتی عام ہو۔ یہ صرف مسلم نوجوان ہی کر سکتے ہیں اور یقیناً یہ بہت گراں سودا ہے، جس کی قیمت بہت کم ہے۔

دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں کا اتحاد کب ممکن ہوگا؟

سوال: کیا دنیا کی تمام اسلامی تحریکیں متحد ہو سکتی ہیں اور یہ کس طرح ممکن ہوگا؟

جواب: ہاں! ممکن ہے جب نیت درست ہو اور عمل اخلاص کے ساتھ خدا کے لیے ہو، اس کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کا غلبہ، نیز ایمان وقرآن کی فرمانروائی ہو، اسلامی مصالح کو دوسرے ہر قسم کے مصالح پر برتری اور ترجیح حاصل ہو، آپس میں عفوودرگزر کی روح کار فرما اور کشادہ ذہنی اور وسعت صدری نشان امتیاز ہو، مقیاس و پیمانہ صرف اسلامی تعلیمات ہوں، اور اس کا واحد مقصد خدائے وحدہٗ لاشریک کی رضا ہو۔

سوال: کیا اسلامی حکومتوں کے فرمانرواؤں اور داعیان اسلام کے درمیان اختلاف کی خلیج کو کچھ کم کیا جا سکتا ہے، یا دونوں کا باہم ملنا محال ہے اور باہمی آویزش ہی ان کے لیے مقدر ہے؟

جواب: یہ بہت مشکل ہے، اس لیے کہ حکام میں اکثریت ''اِلا ماشاءاللہ'' ان لوگوں کی ہے جن کے ذہن ودماغ کی تعمیر اور فکر ونظر کی آبیاری مغربی تمدن اور استعماری طاقتوں کی دین ہے، یا ان میں وہ ہیں جنھیں اسلام کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ لہٰذا انھیں اسلامی بیداری اور اپنے نظام اور عقل ودانش کے خلاف ہمہ وقت کسی انقلاب کا خطرہ محسوس ہوتا رہتا ہے، اور یہ صورت حال صرف غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، چنانچہ ایسے وقت میں انتہائی سوجھ بوجھ اور اخلاص نیز مادی اغراض سے پاک وصاف اور قلب وذہن کی یکسوئی، عقل وعقیدہ میں دوررس تبدیلی کے ساتھ ہی کوئی کارروائی کرنی چاہیے، جو اس منحوس صورت حال کو بدل دے جس میں عالم اسلام بری طرح پھنس چکا ہے۔

میں نے سب سے مفید تجربہ، جس نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا اور اس کے رخ کو بدل دیا، اسے پایا ہے جس کو امام سرہندی مجدد الف ثانیؒ (۹۷۱۔۱۰۳۴ھ) مغل شہنشاہیت کے عین شباب کے زمانہ میں لے کر اٹھے، اس کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب "الدَّعْوَۃُ الْاِسْلَامِیَّۃُ فِي الْھِنْدِ وَتَطَوُّرَاتُھَا" میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے، آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

سوال: عالم اسلام میں جاری تحریکوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، خصوصاً پندرہوی صدی ہجری میں؟

جواب: میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ مغربی قیادت کے طفیل میں پوری دنیا ایسے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر پہنچ چکی ہے، جو جلد ہی پھٹنے والا ہے، یا ایسے غار کے کنارے پر ہے جو بس گرنے ہی والا ہے، اور مغرب جب تک اپنی پوزیشن میں رہے گا، دنیا کی صلاح اور انسانیت کی بقاوفلاح خطرے میں ہے، کیونکہ وہی زندگی کا محافظ اور تمام براعظموں میں ارادے اور رہنمائی کا مرکز بنا ہوا ہے، چہ جائیکہ ملک وحکومت؛ بلکہ عالم اسلام کے دور دراز علاقوں اور مشرقی حصوں تک میں ہر قسم کے اضطرابات، انتشار، انارکی، بغاوت اور انقلاب کا ذمہ دار وہی ہے، اس کے غلبہ کے برقرار رہتے ہوئے کوئی اصلاحی کوشش یا تحریک کامیاب اور بارآور نہیں ہو سکتی اور نہ ایسی حکومت قائم رہ سکتی ہے جو اس کے مقاصد ومصالح سے متصادم اور اس کے ارادے کی پابند نہ ہو، اور نہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی صالح نظام پنپ سکتا ہے اور نہ ہی سعادت کی تمنا کی جا سکتی ہے، مگر اسی وقت جب مغرب کے مادی ڈکٹیٹر ہاتھوں سے قیادت (جو انسانیت کو سعادت سے ہمکنار کرنے پر قادر نہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے کوئی دلچسپی اور رغبت ہے) چھین کر اس کو سونپ دیا جائے جو دنیا اور بنی نوع انسان کی سعادت وبھلائی کے لیے نئی روح اور نئے منصوبے کا حامل ہو، اور خدا کے روبرو اپنے آپ کو جواب دہ اور اپنے اعمال کا مکلّف سمجھتا ہو، اور وہ وہی مسلمان ہے جس کا عالم نو منتظر ہے۔ شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبالؔ نے مسلمانوں کو یہی پیغام دے کر ابھارا ہے، وہ کہتے ہیں:

”اے مردِ مسلماں! تو ناموسِ ازل کا امین و پاسباں اور خدائے لم یزل کا راز داں ہے۔ تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے، لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود وبقا متعلق ہے۔ میخانۂ یقین سے پی اور ظن وتخمین کی پستیوں سے بلند ہو جا۔ فرنگ کی دلآویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد، ان بازیگروں سے جو کبھی ناز وانداز سے پکڑتے ہیں اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں، کبھی شیریں کا پاٹ ادا کرتے ہیں اور کبھی پرویز کا روپ بدلتے ہیں، دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویران ہو گئی ہے۔ اے بانیٔ حرم! اے معمارِ کعبہ! اے فرزندِ ابراہیم! ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لیے اٹھ اور اپنی

گہری نیند سے بیدار ہو جا ؤ

ناموس ازل را تو امینی تو امینی	دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی	صہبائے یقیں درکش واز دیر گماں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ	فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ	معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

عالمی اسلامی کانفرنسوں کے نتائج وفوائد

حضرت مولاناؒ کے ۱۹۷۶ء میں سفر حجاز کے موقع پر عربی اخبار "العالم الإسلامي" کے ایڈیٹر نے یہ انٹرویو لیا۔ اس کا یہ ترجمہ رشید بستوی اکرہروی کے قلم سے ہفت روزہ "ندائے ملت"، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/جولائی و یکم اگست ۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا۔

تصنیف وتالیف کانفرنسوں سے زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے

سوال: پچھلے دنوں پاکستان میں جو سیرت کانفرنس منعقد ہوئی، اس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی، آنجناب کا شمار بھی سیرت نبوی کے مؤلفین میں ہوتا ہے، کیا اس موضوع پر اظہار خیال کی زحمت کرسکتے ہیں؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس کہی جاسکتی ہے۔ ہندوستان سے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی، لیکن چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے شرکت سے قاصر رہا، لیکن بعض مشاہدین سے اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ اسلامی ممالک سے بھی کثیر تعداد میں مندوبین تشریف لائے تھے، حرمین شریفین کے دونوں اماموں کی آمد سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی، ان کی امامت میں پاکستانی نمازیوں کا ایک جم غفیر تھا، پاکستان نے اس سے قبل ایسا مجمع نہیں دیکھا تھا، دوسرے اسلامی ممالک بھی اس حیرت انگیز اجتماع کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں، حکومت پاکستان نے اس کانفرنس سے عوام کے دلوں کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا اعتماد بخشا، لیکن یہ ساری جدوجہد صرف ''سیاسی پوزیشن'' کے حاصل کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

میرے خیال میں اس جیسی عظیم کانفرنسیں خاص طور پر مسلمانوں کے اندر سیرت نبوی کے حقائق جاگزیں کرنے میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں، اور یہی چیز لوگوں کے اندر رغبت ونشاط پیدا کرسکتی ہے، جس سے متاثر ہوکر انسان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، اور ان کی کریمانہ وحکیمانہ زندگی کو مشعل راہ بناتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے کے لیے کانفرنسوں اور کنونشنوں سے کہیں زیادہ مؤثر اور کارگر چیز تصنیف وتالیف ہوسکتی ہے، یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے سیرت پاک کے تمام گوشے کھل کر سامنے آجاتے ہیں، اسی مقصد کے پیش نظر میں نے بھی سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی ہے، خدا سے امید ہے کہ اس سے ایک خلاپُر ہوجائے گا، اور ابھی

حال ہی میں رابطۂ عالم اسلامی کی طرف سے سیرت کے موضوع پر عالمی مقابلہ کا جو اعلان ہوا ہے، میرے نزدیک اس سلسلے میں اہم اقدام ہے۔

کانفرنسوں اور کنونشنوں کی زیادتی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے

سوال: آپ نے مختلف نوعیت کی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے، ان کانفرنسوں سے اب تک کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جواب: ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں روز بروز کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں، جن کی حیثیت اپنے لحاظ سے منفرد ہوتی ہے، ایک ہی اسٹیج پر عالم اسلام کے بڑے بڑے مفکرین اور ماہرین علم و فن اکٹھا ہوتے ہیں، یہاں ایک دوسرے کے احساسات و خیالات کے پڑھنے اور سمجھنے کا سنہرا موقع ملتا ہے، غرض کہ ہر کانفرنس اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور نقطۂ نظر کے لحاظ سے کامیاب ہوتی ہے، لیکن کانفرنسوں اور کنونشنوں کی زیادتی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتی ہیں، اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، اور ان نقائص وخرابیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد خوش آئند اور فائدہ مند پہلو سامنے آئیں، جو معاشرے کے لیے بہت دنوں تک سودمند ثابت ہوں، جس سے مؤثر اور فیصلہ کن نتائج برآمد ہوں اور اس امت کے لیے نفع بخش ثابت ہوں، جس سے ان فاسد خیالات کا قلع قمع ہو جو مغربی تہذیب کے اثر سے اسلامی روح کو لاحق ہیں۔

اس دور میں مسلمانوں کو کثرت کلام کی بدہضمی ہوگئی ہے

اس دور میں مسلمانوں کو کثرت کلام کی بدہضمی ہوگئی ہے، وہ اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے ہر میدان میں پیچھے ہیں، ظاہری طور پر تو مسلمانوں کی بے پناہ طاقت وقوت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر درحقیقت وہ برابر پستی کی طرف جا رہے ہیں، اور اس وقت جبکہ میں ان خیالات کا اظہار کر رہا ہوں، اس سے کوئی خاص کانفرنس یا اجتماع - جسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے- مراد نہیں ہے، ہم نے بھی ہندوستان میں تحریک ندوۃ العلماء کا جشن منعقد کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ ایسی کانفرنسوں کے انعقاد کی طرف مبذول کراؤں جس سے عملی نتائج سامنے آئیں۔

جب تک باطنی قوت ظاہر کو پختہ نہ کردے، ظاہری قوت ایک سراب کی حیثیت رکھتی ہے

سوال: ہمارا عالم اسلام اس وقت دشوار گزار مرحلے سے گزر رہا ہے (اعتقادی واجتماعی اعتبار سے)، آپ کے نزدیک مستقبل میں اس کی کامیابی کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ عالم اسلام اس وقت ایک سنگین دور سے گزر رہا ہے، اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ آج کل عالم اسلام زندگی کے مختلف میدانوں میں باوجود اسلامی واخلاقی روح کے مغربی طاقتوں کا سہارا لے رہا ہے، جب تک عالم اسلام اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوتا اور زندگی کے مختلف معاملات میں دوسری دنیا پر اعتماد ترک کر کے خود اعتمادی کے جذبہ سے کام نہیں لے گا، اور اپنے حقیقی ماخذ وسرچشمہ (یعنی اسلام) سے اپنے دل کی سیرابی اور اسی سے زندگی کا استحقاق حاصل نہیں کرے گا، اس وقت تک اس سے کسی کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی، ایسی صورت میں ایک مضبوط وطاقتور ملک کی ذمہ داری ادا کرنا محال ہوگا؛ نیز اسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کی صف میں کھڑا کرنا بیکار ہوگا۔

بے شک ہم نے اب تک بہت سے میدانوں میں پیش قدمی کی، جس سے بظاہر ہم طاقتور ہوگئے، لیکن جب تک باطنی قوت ظاہر کو پختہ نہ کردے، ظاہری قوت ایک سراب کی حیثیت رکھتی ہے، عالم اسلام کا باطن بہت کمزور ہو چکا ہے، اور برابر کمزور ہوتا جارہا ہے، روحانیت پر مادیت نے غلبہ پالیا ہے، حقیقت کمزور اور صورت طاقتور ہوگئی، ہر قسم کے مادی وسائل کی فراوانی کے باوجود ہم بہت کمزور ہوگئے ہیں، اور برابر یہی حالت ہے۔

برابر دیکھا جارہا ہے کہ عالم اسلام ہر حیثیت سے مغرب کی تقلید کررہا ہے، اور اچھے اور برے کی تمیز کے بغیر وہ ہر چیز کو اپنا رہا ہے، باوجود اس کے کہ اگر مغرب سے اس میدان میں استفادہ کیا جائے جس میں وہ ہم سے آگے ہیں، مثلاً سائنس وٹکنالوجی وغیرہ کا میدان، یہ چیزیں عالم اسلام کو اوپر اٹھانے میں زیادہ کارگر ثابت ہوں گی، لیکن اخلاقی وثقافتی میدان میں وہ خود ترقی کرسکتا ہے، کیونکہ اس کے پاس دیا ہوا اسلام کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جس سے وہ معزز اور ہر میدان میں کامیاب ہوسکتا ہے، یہ ایسے بحران کا علاج ہے جس سے ہم دوچار ہیں، اس سے ہماری اخلاقی واسلامی روح مجروح نہیں ہوسکتی، اسی سے عالم اسلام کا مستقبل بھی روشن ہوسکتا ہے۔

عورت کا گھریلو زندگی سے الگ ہوکر شمع محفل بننا قوموں اور ملتوں کے زوال کا باعث ہوتی ہے

سوال: عرب ممالک میں اس وقت عورتوں کے حقوق دیے جانے کی ایک طغیانی لہر بہہ پڑی ہے، اس بارے میں اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

جواب: میں نے مختلف تہذیب وتمدن اور مختلف قوموں اور جماعتوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، مجھے خاص طور پر ان کے عروج وزوال پر کافی معلومات ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب جس سے کوئی قوم دوچار ہوئی وہ خاندانی نظام کا درہم برہم ہونا اور گھریلو زندگی کے توازن کا برقرار نہ رہنا ہے، مرد وعورت کے باہمی تعلقات کی خرابی اور عورت کا گھریلو زندگی سے الگ ہوکر شمع محفل بننا یہی چیزیں قوموں اور ملتوں کے زوال کا باعث ہوتی ہیں، ہم کو نظر آتا ہے کہ ہمارا معاشرہ تیزی سے روبہ زوال ہو رہا ہے، اور یہ بیماری برابر پھیلتی جارہی ہے، عورتیں گھریلو زندگی اور اس کی ذمہ داریوں نیز اولاد اور نئی نسل کی پرورش سے الگ ہورہی ہیں، ان حالات میں یہ ناممکن ہے کہ ایک صالح گھرانا وجود میں آسکے، جس میں آدمی کے لیے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوں، جب وہ گھر میں داخل ہو تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا وہ جنت میں داخل ہو رہا ہے، چونکہ گھریلو زندگی ایسی ہوتی ہے جس کا ہر فرد محبت واخوت کے رشتوں میں بندھا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری ساری سوسائٹی اضطراب و بے چینی اور اجتماعی انتشار و نیز اخلاقی انحطاط کی شکار ہے، اس کی بنیادیں کمزور ہوچکی ہیں، اس میں کوئی پائیداری نہیں رہ گئی ہے، یہی حالت قدیم یونان، روم وفارس کی بھی تھی، مجھے اندیشہ ہے کہ یہی حالت مشرقی اقوام کی بھی نہ ہو، آثار تو یہی بتارہے ہیں۔

جشن ندوۃ العلماء

سوال: جشن ندوۃ العلماء اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہا اور عالم اسلام پر اس کا کیا اثر پڑا؟

جواب: جشن ندوۃ العلماء کے بارے میں اگر آپ کسی دوسرے سے سوال کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا، لیکن ایک حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کچھ عرض کروں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ یہ تعلیمی جشن اپنے مقصد میں خاصی حد تک کامیاب رہا، اس میں

عالم اسلام کے گوشے گوشے سے ممتاز دانشوروں اور اسکالروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی، اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر اور مختلف کالجز اور یونیورسٹیز کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی، اس جشن سے ہم کو جہاں بہت سے فائدے محسوس حاصل ہوئے، وہیں ایک بڑا فائدہ یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان سب سے بڑی اقلیت میں ہیں، اس جشن سے ان کے اندر ایسی اسلامی قوت اور ایسا اعتماد اور ولولہ پیدا ہوا جو ہندوستان کے علماء اور لیڈروں سے مخفی نہیں، ہندوستانی مسلمانوں کو محسوس ہو گیا کہ عالم اسلام میں ان کے کافی ہمدرد و غم گسار موجود ہیں جو ان کی ہر دعوت اور پکار پر لبیک کہہ سکتے ہیں، ان کی کانفرنسوں میں شرکت کر کے مختلف امور میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ندوۃ العلماء نے اس جشن کے ذریعہ اپنے پیغام اور اپنے فکر و نظر نیز تعلیم و تربیت کے میدان میں اسلام کے صحیح نظریہ کو عام کیا، نیز زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق اصلاح و ترمیم میں اس کا کیا نقطۂ نظر ہے، اس کو بھی واضح کیا۔ اس موقع پر بڑے بڑے مفکرین، ماہرین علم و فن کے نظریات و خیالات کے پڑھنے کا موقع ملا۔ جشن تعلیمی کے اختتام کے چند ہی دنوں بعد اس کے نتائج پر غور کرنے کے لیے ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے تاکہ وہ جشن تعلیمی کے نتائج کا جائزہ لے۔ اس کمیٹی نے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے لیے کچھ تجاویز اور قرارداد پاس کیا ہے، اس کا نفاذ بھی عنقریب عمل میں آ جائے گا۔

عالم اسلام کی سطح پر علمی اکیڈمی کے قیام کی ضرورت

سوال: جشن تعلیمی میں قرارداد کے ذریعہ یہ طے ہوا تھا کہ عالم اسلام کی سطح پر ایک اکیڈمی قائم کی جائے گی، اس سلسلے میں آپ کو کہاں تک کامیابی ہوئی؟

جواب: ندوۃ العلماء کے جنرل سکریٹری نے پہلے ہی اعلان کیا تھا کہ ایک مجلس شوریٰ قائم کی جائے گی جس کے ممبران عالم اسلام کی سطح کے ہوں گے۔ میں دو ماہ سے ہندوستان سے باہر ہوں، میرے رہنے تک ممبران کا انتخاب عمل میں نہیں آیا تھا، ہو سکتا ہے اب یہ انتخاب مکمل ہو گیا ہو۔

میرا خیال ہے کہ یہ علمی اکیڈمی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے میدان میں ہر لحاظ سے رہنمائی کر سکتی ہے، عالم اسلام میں تعلیم و تربیت کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں اس کے قیام سے

وہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی، یہ ایسا اہم فریضہ ہے جو ندوۃ العلماء کی طاقت سے باہر ہے، یہ ادارہ حکومت کی مالی امداد سے نہیں بلکہ ہندوستان کے غریب مسلمانوں کے تعاون سے چل رہا ہے، ندوۃ العلماء اس ذمہ داری کو پورا کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتا ہے جو اس کے ناتواں کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ نصرت خداوندی اگر شامل حال رہی تو وہ بہت کچھ کرسکتا ہے، علمی میدان میں ندوۃ العلماء نے جو کارنامے انجام دیے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس علمی اکیڈمی کی وجہ سے ندوۃ العلماء کی سرگرمیاں اور بڑھ جائیں گی، نظام تعلیم کو اس سے مزید غذا حاصل ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسا نظام تعلیم ہو جو تمام اسلامی سوسائٹیوں کے لیے یکساں ہو، جس سے ہم مغربی تہذیب اور اس کی پیدا کی ہوئی تمام خرابیوں کا بھرپور مقابلہ کرسکیں۔

سوال: الهيئة التأسيسية للمؤتمر العالمي للتعليم الإسلامي کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آئندہ سال جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کررہا ہے، اس سلسلہ میں غور کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں ایک نشست ہوئی تھی، تو کیا ندوۃ العلماء کے جشن کی تیسری قرارداد[1] سے اس میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے؟

جواب: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں علمی طور پر کوئی مماثلت ہے۔ اس کانفرنس کے ممبران میں سے دو نے جشن ندوہ میں شرکت کی تھی، جنھوں نے جشن تعلیمی کے مختلف پروگراموں اور مباحثوں میں حصہ لیا تھا۔ امید ہے کہ یہ کانفرنس ندوۃ العلماء کے

(۱) جشن ندوۃ العلماء کی پہلی قرارداد یہ تھی: ”شرکائے اجلاس کو اس بات کا احساس ہے کہ عالم اسلامی کی تمام قومیں جو سامراجی اقوام کی فوجی اور سیاسی بالادستی سے عملاً آزاد ہوچکی ہیں، اب ان کو اس کی شدید ضرورت ہے کہ سامراجی اقوام کی تہذیبی اور فکری غلامی اور بالادستی سے بھی مکمل طریقہ سے آزاد ہوجائیں، اور اس کا واحد طریقہ تعلیم وتربیت کو خالص اسلامی بنیادوں پر قائم کرنا ہے، اور یہ کہ تعلیم کی تمام منزلوں میں اس طرح نصاب تعلیم وضع کیا جائے کہ اسلامی فکر وعقیدہ اور اسلام کے پیام، اس کی انفرادیت، اس کی تربیت سے پوری طرح نہ صرف متفق ہو بلکہ گمراہ کن افکار اور اس میں مدد دینے والی تمام باتوں سے پوری طرح پاک وصاف رہیں، اور اس طرح کہ عالم اسلام میں رائج نصاب تعلیم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ بالکل ختم ہوجائے۔“
جشن کی تیسری قرارداد یہ ہے: ”شرکائے اجلاس سعودی عرب کی یونیورسٹیوں سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسی عالمی کانفرنس منعقد کرنے کی ذمہ داری قبول کریں جو ان وسائل اور طریقوں پر غور کرے جن کے ذریعے سے پہلی قرارداد میں مذکور مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں۔“ مکمل تجاویز کے لیے دیکھیے: ”روداد چمن“ از محمد الحسنیؒ، شائع کردہ: ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ص: ۲۶۲-۲۶۶۔

تعلیمی جشن کی نوعیت کی ہوگی۔اس کی میٹنگ میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی ،مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے حاضر نہ ہوسکا۔ بہر حال میں جامعۃ الملک عبدالعزیز کے اس اقدام پر مبارکباد دیتا ہوں،اور امید کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ اس کے ذریعہ ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

عصرِ حاضر میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حکیمانہ طرزِ دعوت کی ضرورت

حضرت مولاناؒ کے سفر امریکہ کے موقع پر جناب سہیل احمد صاحب (حال مقیم امریکہ) نے ۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ کو شکاگو (امریکہ) کی ایک مجلس میں حضرت مولاناؒ سے کچھ سوالات کیے تھے، جن کا جواب بہت چشم کشا ہے۔ اس مجلس کی یہ گفتگو ذیل میں نقل کی جارہی ہے، جو پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰؍ نومبر ۱۹۹۳ء) سے ماخوذ ہے۔

کہیں ہم نہ چاہتے ہوئے بھی یہودونصاری کی سازش کا شکار تو نہیں ہو رہے؟

شام کی چائے کے بعد علی میاں کی محفل میں حاضری رہی، دیگر حاضرین محفل میں ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن (خلیفۂ مجاز شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)، ڈاکٹر سلمان ندوی بن سید سلیمان ندوی ساؤتھ افریقہ سے، اور ڈاکٹر مزمل صدیقی کیلیفورنیا سے موجود تھے۔

مسلمانوں کی اجتماعی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ''آج یہودونصاری اپنی تمام تر مذہبی دوری اور اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ایک جگہ جمع ہیں، اور عیسائیوں کے وسائل اور یہود کا دماغ اسی کام پر مامور ہے کہ کس طرح مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی سے اسلامی اقدار کو نکالا جائے؛ چنانچہ ہر مسلمان کو اس خطرے سے آگاہ رہتے ہوئے اپنے احتساب کی ضرورت ہے کہ کہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہودونصاری کی اس سازش کا شکار تو نہیں ہو رہا۔''

دنیا میں اسلامی نظام کے نفاذ کے دو طریقے

اس سوال کے جواب میں کہ دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کیسے نافذ ہوسکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ ''دو طریقے ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ دین وایمان والوں کو کرسی تک پہنچایا جائے، یا پھر دین وایمان کو کرسی والوں تک پہنچایا جائے۔ پہلے طریقۂ کار میں خدشہ اس بات کا ہے کہ کرسی والے کرسی چھوڑنے پر کرسی توڑنے کو ترجیح دیں گے اور معاملات احسن کے بجائے ابتر ہو جائیں گے، دوسرا طریقہ مدت طلب ضرور ہے لیکن پائیدار ہے اور شاید اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہ ہو۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک تجدید سے بھی اس طریقۂ کار کا عندیہ ملتا ہے کہ کرسی کرسی والوں کو ہی مبارک ہو، دیندار تو اس کی اصلاح چاہتے ہیں نہ کہ کرسی۔''

آج کے دور کا سب سے بڑا چیلنج

مولانا نے فرمایا کہ ’’ہر دور کا ایک بڑا چیلنج رہا ہے اور بزرگان دین نے ایسے چیلنجوں کا مقابلہ ہمت وحکمت سے کیا ہے۔ آج کے دور کے دنیائے اسلام میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ امت مسلمہ کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ونسل کا دین اسلام پر بحیثیت ایک زندہ وکامل دین کے اعتماد بحال کیا جائے۔ یہ اسی اعتماد کا متزلزل ہونا ہی ہے کہ آج دنیائے اسلام میں ہی اسلام کی عملی حیثیت سے متعلق نظریاتی تصادم موجود ہے، یہ اسی اعتماد کا متزلزل ہونے کا نتیجہ ہی ہے کہ جدید تعلیمی نظام سے فارغ شدہ طبقہ اسلام کو چودہ سو سال پرانا ایک مذہب تصور کرتے ہوئے اسے انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں، اور کہیں تو یہ طبقہ کاروبار زندگی کے نظام کو چلانے والے کی حیثیت سے بہ نفس نفیس اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام میں مصروف ہے۔ چنانچہ سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس طبقہ تک رسائی حاصل کی جائے اور اس کے علمی معیار کے مطابق اس کا اعتماد اسلام پر بحیثیت ایک زندہ ومکمل ضابطۂ حیات کے بحال کیا جائے۔‘‘

نصاب ونظام تعلیم میں اسلامی تعلیمات واقدار ودینی تربیت کو شامل کرنے کی ضرورت

مولانا نے فرمایا کہ ’’اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمان بچوں کے تعلیمی نصاب ونظام کی تطہیر کی جائے، اور اس میں اسلامی تعلیمات واقدار ودینی تربیت اس طرح شامل کی جائے کہ آج کا مسلمان نوجوان علوم جدیدہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک مخلص ودیانت دار سفیر و سپاہی بھی بن جائے۔ اس اہم کام کی طرف سے اسلامی تحریکوں اور مخلص کارکنوں نے اب تک صرف نظر کیا ہے؛ اس کام کے نتیجہ میں ایسی تعلیم یافتہ مسلمان نسل وجود میں آئے گی جو دینی تعلیم و تربیت وحمیت سے آراستہ ہو اور پھر یہ نسل اسلام کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگیوں میں مکمل طور پر نافذ کرنے کی کوشاں ہوں۔‘‘

اسی شام کو بعد از نماز مغرب ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے یورپ وامریکہ میں مقیم مسلمان نوجوانوں کے لیے بالخصوص اپنے پیغام میں فرمایا کہ ’’آج مغرب اپنی بے پناہ مادی ترقی لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے؛ لیکن اس مغربی تہذیب نے انسانیت کی جو اخلاقی و

روحانی ومعاشرتی پامالیٔ اقدار کی ہے وہ اس کی مکمل ناکامی کا ثبوت ہے۔ آج کے مسلمان نوجوانوں کی بالخصوص ذمہ داری ہے کہ اپنی مکمل زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں، اپنی روحانی واخلاقی تربیت اس نہج پر کریں کہ ان سے ملنے والے ان کے طرز زندگی واعمال واخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ نقطہ ان کے لیے اسلام کی ایک پرزور دعوت ہوگا۔"

مولانا نے فرمایا کہ "مسلمان نہ صرف اپنی زندگی کو اللہ والی زندگی بنانے کے مکلّف ہیں؛ بلکہ اسی زندگی سے وہ دوسروں تک دین پہنچانے کا فریضہ بھی ادا کر سکتے ہیں۔ بزرگانِ دین اسلام کی زندگیاں ودعوتِ دین اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔"

۱۹۶۷ء کا المیہ اور ہماری ذمہ داریاں

۵/جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل کے مقابلہ میں مصر کی شکست، بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ، دریائے اردن کے مغربی کنارہ کی پوری عرب پٹی (الضفة الغربية) (جس میں قدس، الخلیل، نابلس وغیرہ شامل ہیں) اور سینا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے، عرب محاذ کے ''ڈھول کے پول'' کھل جانے اور قومیت عربیہ کے پھولے ہوئے بلند پرواز غبارہ کی ہوا نکل جانے کا اور اسی کے ساتھ طویل وعریض عالم اسلام کی بے بسی اور رسوائی کا وہ تاریخی واقعہ پیش آیا، جو اقوام وملل کی تاریخ میں بعض مرتبہ صدیوں کے وقفہ سے پیش آتا ہے، اور جہاں تک ملت اسلامی کا تعلق ہے، اس کی تاریخ میں دو چار ہی مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔ اسی واقعہ کے بعد اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جب حضرت مولاناؒ مکہ مکرمہ گئے، تو سعودی عرب کے کثیر الاشاعت اخبار ''الندوۃ'' کے نمائندے نے حضرت مولاناؒ سے ایک انٹرویو لیا اور اس کے ۱۷/اکتوبر ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا، اس انٹرویو کا ترجمہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۶۷ء کے ''ندائے ملت'' (لکھنؤ) میں شائع ہوا۔ تلاش بسیار کے باوجود ''ندائے ملت'' کا یہ شمارہ دستیاب نہ ہو سکا۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کاروانِ زندگی'' (دوم) [شائع کردہ: مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۵ء، ص ۷۷ تا ۸۱] میں اس انٹرویو کے کچھ حصے نقل کیے ہیں، جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

عالمِ عربی کے المیہ پر ردِ عمل

سوال: عالمِ عربی کے تازہ المیہ نے لوگوں پر مختلف اثرات چھوڑے ہیں، ایک وہ حیرانی ہے جو کسی اچانک دھماکہ سے پیدا ہو جاتی ہے، اس نے بہت سوں کے احساسات میں ایک ہلچل اور عقل وفکر میں تعطل کی کیفیت پیدا کر دی ہے، انھیں ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو، نہ کہ دن کی روشنی میں ہونے والا کوئی واقعہ، دوسرا اثر مسلمات وعقائد میں تشکیک واضطراب ہے، وہ عقائد ومسلمات جو مسلمانوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں، تیسرا اثر یاس اور مستقبل میں تاریکی کا احساس ہے، آپ کا ردِّ عمل اس واقعہ پر کیا ہے؟ میری خواہش ہے کہ صراحت اور وضاحت سے بیان فرمائیں۔

جواب: مجھے آپ کا سوال بہت پسند آیا۔ یہ المیہ خود میرے لیے اسی طرح کا المیہ ہے جیسے کسی مسلمان کے لیے ہو سکتا ہے؛ بلکہ کسی عرب کے لیے، اور مجھے اس پر غور وفکر سے دلچسپی بھی ہے۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق صراحت ہی سے جواب دوں گا، میں تو صراحت اور صفائی کا یوں بھی عادی ہوں، اور یہ تو موضوع ہے ہی صاف گوئی کا، اس لیے کہ مصائب میں تکلف اور تحفظ نہیں نبھتا، عربوں کا محاورہ ہے "اَلرَّائِدُ لَا يَكْذِبُ أَهْلَهُ" (قافلہ کے لیے پڑاؤ تلاش کرنے والا جھوٹی خبر نہیں دیتا)، اور میں اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ تکلف بھی نہیں برتتا اور منہ دیکھی باتیں بھی نہیں کرتا۔

میرے اوپر اس حادثہ کا وہ ردِ عمل نہیں ہے جو کسی غیر متوقع بات سے ہوتا ہے، تمام علامتیں اس بات کی موجود تھیں کہ ایک نہ ایک دن یہ المیہ پیش آنے والا ہے۔ کچھ لوگ جنھیں اللہ نے بصیرت بخشی تھی، ایمانی عقل اور تدبر فی القرآن کی دولت سے نوازا تھا، وہ اس کی پیشین گوئی کر رہے تھے، بالکل اس طرح جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ نبوت والہام، یا

خرق عادت سے اس کا تعلق نہیں تھا، یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے ایک شخص کے سامنے غبارہ آئے، وہ اسے ہاتھ لگا کر دیکھے اور پیشین گوئی کرے کہ اگر اسے سوئی کی نوک لگ گئی یا کانٹا چبھ گیا تو اس کا حشر کیا ہوگا۔

صورت وحقیقت کے مقابلہ کا دائمی انجام

اس معرکہ میں عربی قیادت کی مثال بالکل یہی تھی، وہ دشمن کی جنگی تیاری، مضبوطی اور سنجیدگی کا مقابلہ زبانی جمع خرچ سے کر رہی تھی، صحافت کا طمطراق، ریڈیو کی گھن گرج اور لاف گزاف اس کا کل سرمایہ تھا۔ اس کی صف آرائی دشمن کے خلاف تو بہت کم، اصلاً ان بھائیوں کے مقابلہ میں تھی جو عقیدہ میں بھائی تھے، خون اور نسل میں بھائی تھے۔ قرآن نے مسلمانوں کی صفت بیان کی ﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ [المائدة : ٥٤] ''اہل ایمان کے لیے نرم اور اہل کفر کے لیے گرم''، لیکن انھوں نے اس کو الٹ کر ''أَعِزَّة عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَذِلَّة عَلَى الْكَافِرِيْنَ'' (مومنین کے حق میں سخت، اہل کفر کے معاملہ میں دل نرم اور سرخم) کا حال پسند کیا۔

بہر حال دشمن کے مقابلہ میں ان کا سارا سرمایہ زبان آوری، لن ترانی اور ڈرامہ آرائی تھا، جیسے ''علی بابا چالیس چور'' والا ڈرامہ اسکولی بچے اسٹیج کیا کرتے ہیں، چنانچہ جب حقیقت کا سامنا ہوا، اور واقعی لشکر سے سابقہ پڑا، تو یہ اداکار میدان جنگ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ یہ ''حقیقت'' اور ''صورت'' کے مقابلہ کا دائمی انجام ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کو اس طرح سمجھا ہے اور کتنی ہی مثالوں کے ساتھ ایک بسیط تقریر بھی کبھی اس موضوع پر کی ہے۔ (۱)

سوال: آپ کی آمد اس المیہ کے بعد ہو رہی ہے، کیا آپ نے یہاں کے لوگوں میں اس کا گہرا اثر پایا؟

جواب: آپ نے میرا زخم کرید دیا، میرے رنج بھرے احساس کو چھیڑ دیا، اب میں جو کچھ بھی کہوں اس کو کہلانے کے ذمہ دار آپ ہیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ ناراض نہ ہوں گے۔

---

(۱) تقریر ''صورت وحقیقت'' اور اس کے عربی ترجمہ "بين الصورة والحقيقة" کی طرف اشارہ ہے، اصل اردو تقریر علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے، نیز حضرت مولاناؒ کی کتاب ''اصلاحیات'' میں شامل ہے، جبکہ اس کا عربی ترجمہ " إلى الإسلام من جديد" میں شامل ہے۔

میں نے اس حادثہ کا کوئی خاص اثر اس ملک کی زندگی میں نہیں دیکھا۔ یہاں زندگی کا چکر اسی انداز پر چل رہا ہے، جو اس واقعہ سے پہلے دیکھنے میں آتا تھا، گویا کوئی حادثہ ہی نہیں ہوا، ہماری عزت کو کوئی چوٹ ہی نہیں پہنچی، کوئی مقدس چیز ہم سے نہیں چھنی، نہ ہم نے اپنی عزت اور آبرو میں سے کچھ کھویا ہے، نہ کوئی خطرہ ہمارے وجود اور ہماری غیرت کو چیلنج کر رہا ہے، حالانکہ جو کچھ ہو گیا اور جس کا آگے خطرہ ہے، اس کا حق تھا کہ نیندیں اڑ جائیں، عیش مکدر ہو جائے اور انسان اپنے آپ تک کو بھول جاتا۔

شکست کے آثار ونتائج سے عہدہ برآ ہونے کی واحد سبیل

سوال: اچھا تو اس شکست کے آثار ونتائج سے عہدہ برآ ہونے کی واحد سبیل کیا ہے؟

جواب: واحد سبیل اسلام ہے "إِلَى الْإِسْلَامِ مِنْ جَدِيْدٍ" نئے سرے سے اسلام پر آیئے! میں ان سطحی تجاویز سے بالکل مطمئن نہیں ہوں، جو آج بہت سے اہل قلم اور مفکرین پیش کر رہے ہیں۔ ان سیاسی کانفرنسوں اور ڈپلومیٹک اجتماعوں پر بھی کوئی عقیدہ نہیں رکھتا جن کو ہم بہت آزما چکے ہیں، اور نہ فلسطین اور بیت المقدس کو تکیہ کلام بنانے میں کوئی فائدہ سمجھتا ہوں جس کا ہر خطیب اور ہر صاحب قلم عادی ہو گیا ہے۔

ضرورت جس چیز کی ہے اور جس سے کام چلے گا، وہ ہے ایک نئی مومن نسل، جو نہ ذلت برداشت کرے، نہ بے فکری کے مشغلوں سے دل بہلائے، ایسی نسل جس کی زندگی سنجیدگی اور دلیری کی صفات وعقیدے سے آراستہ ہو، جو "صورت اسلام" کی نہیں "حقیقت اسلام" کی حامل ہو۔ یہی نسل ہے جو فتح ونصرت کی ضامن ہوگی اور عزت و سربلندی اس کا مقدر ہے۔

پس ہماری صحافت وادب، ریڈیو اور نظامِ تعلیم وتربیت اور قومی رہنمائی کی وزارت [1] جیسے ادارہ کو اس نسل کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے، ہم میں جو کچھ دین و کردار و شرافت اور شجاعت کا جوہر باقی ہے، اس کی مکمل حفاظت کی جانی چاہیے کہ اس سے کوئی کھلنڈرا کھیلنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ اگر بالکل رخصت ہو گیا تو لوٹ کر آنے والا نہیں، یہ اس نبوتؐ کی وراثت

(۱) مصر وغیرہ میں "اَلْإِرْشَادُ الْقَوْمِيّ" کے نام سے مستقل وزارت قائم تھی، جس کا اصل کام ذہنوں کی تربیت، رہنمائی اور صحیح اطلاعات بہم پہنچانا تھا۔ (ابوالحسن علی ندوی)

ہے جو حضرت محمد (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ختم کی جاچکی ہے، یہ مصلحین ومرشدین کی باقیات صالحات میں سے ہے اور یہ اس ملک کی وہ دولت ہے جسے یہ اطراف عالم میں برآمد کیا کرتا تھا۔

اسلامی بیداری
داعیوں اور حکومتوں کے فرائض

حضرت مولاناؒ اسلامک سینٹر، آکسفورڈ یونیورسٹی کے ٹرسٹیز کی سالانہ میٹنگ (منعقدہ ۲۷؍ اگست ۱۹۸۷ء) میں شرکت کے بعد کویت دو روز ٹھہرنے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کی اصلاحی انجمن "جمعية الإصلاح الاجتماعي" کے صدر شیخ عبداللہ العلی المطوع نے مولانا کو ایک دعوتی اور فکری مجلس میں مدعو کیا، اس دعوتی نشست میں مولانا سے چند اہم سوالات کیے گئے، حضرت مولاناؒ نے ان سوالات کے مفصل جوابات دیے۔ ان سوالات و جوابات کو ہفت روزہ "المجتمع" (کویت) نے شائع کیا تھا۔ اس کا ترجمہ محمد امین کے قلم سے "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۸۸ء) میں شائع ہوا۔ ذیل میں یہی سوالات و جوابات نقل کیے جا رہے ہیں۔

اسلامی بیداری کو کس طرح مستحکم کیا جاسکتا ہے؟

سوال: بحمداللہ اسلامی بیداری اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہے، ایسے وقت میں امت مسلمہ کے نوجوانوں کو اپنے طریقہائے کار میں استحکام، ان کو صحیح رخ دینے اور ان میں مزید قوت و توانائی پیدا کرنے کے لیے کن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؟

جواب: جہاں تک اسلامی بیداری کی قدر و قیمت کے اندازہ کرنے، اس کو صحیح سمت لے جانے، تقویت دینے اور بنیادی مقصد کی طرف موڑنے کا تعلق ہے، تو میں اپنے ناقص مطالعے و عملی تجربات کی روشنی میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں سب سے پہلا اقدام یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں اوّلاً اسلام کی بقا و دوام، انسانیت کی رہنمائی اور بنی نوع انسان کی قیادت کی اہلیت و صلاحیت پر اعتماد بحال کیا جائے، اور جیسا کہ مشاہدہ بتاتا ہے یہ اعتماد مغربی تربیت کے اثر سے غیر معمولی حد تک مضمحل اور کمزور پڑ گیا ہے، چنانچہ مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ماضی میں اسلام اپنا رول ادا کر چکا ہے، لیکن اب اس ترقی یافتہ دور کا ساتھ دینے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے نوجوان، جن کی نشو و نما مغربی تعلیم کے زیر سایہ اور عصری دانش گاہوں کی چہار دیواری کے اندر ہوتی ہے، کہنے لگے ہیں کہ اسلام سے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی، بزعم خویش جب یہ مذہب عصری مشکلات کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے، تو اس سے بنی نوع انسان کی قیادت کی امید وابستہ رکھنا اضاعتِ وقت کے مرادف ہے...!!! لہذا تین باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:

اسلام پر اعتماد بحال کرنے کی ضرورت

(۱) سب سے پہلا قدم جو ہمیں اور خصوصیت کے ساتھ دینی داعیوں، مفکروں اور مصنّفین کو

اٹھانا چاہیے، وہ یہ کہ نوجوانوں کے ذہنوں میں اس بات کا اعتماد بحال کیا جائے کہ اسلام ایک ابدی و دائمی مذہب ہی نہیں، بلکہ اس کے اندر انسانیت اور انسانی سوسائٹی کو زوال وخودکشی سے نجات دلانے کی اہلیت وصلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس لیے کہ مغربی معاشرہ نہ صرف زوال کا شکار ہے؛ بلکہ وہ خودکشی کی راہ پر گامزن ہے۔

صالح ومثالی معاشرہ کے قیام کی ضرورت

(۲) کسی مخصوص ومحدود علاقہ میں ایک ایسے مثالی معاشرہ کا وجود کہ جب بھی کوئی مشرف بہ اسلام ہونا چاہے، تو اسے متعین طور پر بتایا جائے کہ وہاں اسلامی معاشرہ قائم ہے تاکہ وہ اس کو اپنا آئیڈیل ونمونہ بنا سکے۔

عملی اسلامی تحریک کا وجود

(۳) عملی اسلامی تحریک کا وجود، اور یہ صرف اسلامی معاشرہ کی نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس تحریک کے فقدان کی وجہ سے لوگوں کے ذہن و دماغ میں ایک انتشار برپا ہے، جس کے نتیجے میں کوئی بھی دوسری بے ہنگم، گمراہ کن ومفسد تحریک ذہنوں میں جگہ بنا سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب ایک حساس مخلص اور سنجیدہ معاشرہ کا قیام عمل میں آجائے گا، تو وہ اپنے کام کو اسلامی نہج پر ڈھال سکتا ہے، اور عملی وسیاسی، سائنسی وتہذیبی میدان کا رُخ کرسکتا ہے۔ اسلام میں تمام اصول وضوابط اور قوانین فراہم ہیں، صرف متحد ہوکر علمی ڈھنگ سے کام کرنے کی ضرورت ہے، یعنی زمانے کی روشنی میں اسلامی واقعات وحوادث اور اسلامی روح کے مابین ہم آہنگی وتطبیق پیدا کرنے کے لیے بنیادی نصوص اور مواد موجود ہے، جو امور شریعت سے متعلق ہیں، ان کی انجام دہی کے لیے تحقیقی وعلمی کام کی ضرورت ہے، اس تحقیقاتی وعملی ادارے کا قیام کہیں بھی ہوسکتا ہے۔

میں جس چیز پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس کے قیام میں اخلاص وسنجیدگی کا ہونا ضروری ہے، نیز ایک ایسی اسلامی تحریک کا قیام بھی عمل میں آنا ضروری ہے جو علم وعمل، صحیح تصور وادراک، جاں بازی، خطر پسندی اور مہم جوئی کی روح کی بھی حامل ہو، کسی ایسی تحریک کا فقدان جس میں صحیح

فہم وشعور اور خطر پسندی ومہم جوئی کی صفت نہ ہو، وہ مسلمانوں کے لیے خطرہ ہے، جو خطر پسندی اور مہم جوئی کے پیاسے ہیں، اس لیے کہ ان کی تسکین ان ہی چیزوں سے ہوسکتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ ہم اس سلسلے میں حقیقت پسندی کے ساتھ غور وفکر کریں، جہاں تک دینی مفاہیم کی تشریح اور اسلام کے سیاسی نظریہ کے تفصیلی جائزہ کا تعلق ہے، تو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک تحقیقی وعلمی کام ہے اور اس کے رکن بننے اور اس میں کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں کی بحمد اللہ اچھی خاصی تعداد موجود ہے، ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اصل بنیادی سیاسی نظریات کو پیش کرنے اور ان کو زمانہ سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر ہوسکتا ہے کوئی اسلامی ملک یا اسلامی حکومت اسلامی تحقیقاتی ادارے کی تشکیل پر غور وفکر کرے اور ایسا ممکن ہے۔

پہلے گھر مسلمانوں کی پہلی تربیت گاہ ہوا کرتا تھا

سوال: اسلامی تحریکیں اس دینی بیداری سے کیسے فائدہ اٹھا سکتی ہیں؟ اور اس کو نتیجہ خیز کیسے بنایا جاسکتا ہے تا کہ منزل مقصود مل سکے اور مثبت وتعمیری انداز میں اس کے بقا کی ضمانت بھی مل سکے؟

جواب: ایک پیہم اور مسلسل اسلامی جدوجہد کا وجود ہی صالح اور پاکیزہ عناصر کو یکجا کر سکتا ہے۔ یہی عمل جاں بازی وخطر پسندی کا محرک ہوا کرتا ہے۔ اس کے اندر اس بات کی پوری صلاحیت ہوتی ہے کہ جن عناصر میں اس کے اصول ومبادی، مقاصد اور قدیمی صلاحیت ہو، انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے، اگر ان کے اندر دعوتی وتحریکی صلاحیت موجود ہو اور دوسروں کو اپنی دعوت سے روشناس کرانے کی اس کے اندر قدرت ہو۔

پوری اسلامی تاریخ میں تحریکوں کے متعلق یہی صحیح تجربہ ہے، اور جب ہم اپنی ساری فکری وعملی وعقلی توانائیوں کو سیاسی وعلمی نظریات کی تشریح میں صرف کرنے لگیں، تو ہم ان پاکیزہ عناصر اور عظیم الشان مخفی طاقتوں کو حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔

جی چاہتا ہے کہ کچھ مشاہدات آپ لوگوں کے سامنے پیش کروں، وہ یہ کہ ہماری گذشتہ معاشرتی زندگی میں گھریلو اور مقامی تربیت کا کافی دخل رہا ہے، گھر مسلمانوں کی پہلی تربیت گاہ ہوا کرتا تھا، جہاں وہ اسلام کے متعلق پختہ اعتماد حاصل کرتے تھے، جبکہ آج کل اس تربیت کا وجود

سرے سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ نسلیں گھریلو تربیت سے عاری اور دین اسلام پر اعتماد سے تہی دامن ہونے کی بنا پر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تہذیب وتمدن کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

لہذا ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ہر ممکن طریقہ سے گھروں، مدرسوں اور جہاں بھی ممکن ہو، وہاں ان کو شروع سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش ان کے حق میں نفع بخش ثابت ہوگی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو اور بہت سے لوگوں کو مغربی تہذیب کی مرعوبیت سے نجات دلائے۔

اصلاح وتربیت کا کام مغرب میں بھی کرنے کی ضرورت

ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ اصلاح وتربیت کا کام مغرب میں بھی کریں، جہاں سے یہ خرابیاں اور مفاسد آتے ہیں، ان میں بہت سے تو جان بوجھ کر معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں؛ لیکن ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں جو اسلام کی صحیح حقیقت سے نابلد ہیں۔ لہذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان کو اسلام سے واقف اور صحیح اسلامی اقدار سے روشناس کرائیں۔ اسلام اور اسلامی شخصیتوں کے متعلق ان کو جو غلط فہمی ہوتی ہے اس کا ازالہ کریں۔ لہذا جس طرح ہمیں مشرق میں کام کرنے کی ضرورت ہے ایسے ہی مغرب میں بھی اس کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہماری ثقافت وافکار کا سرچشمہ مغرب ہی اس وقت بنا ہوا ہے، اور ہم خود اس سرچشمہ سے مستفید اور اپنے بچوں کو بھی اس سے فیض یاب کرتے ہیں۔

بلاوجہ کی معرکہ آرائیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے

سوال: اسلامی تحریکیں حکومتوں کی نیت کے متعلق کب تک شک وشبہ میں مبتلا رہیں گی؟ جس کے نتیجے میں حکومتوں اور ان سے متعلق ہر شے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان سے دور رہنے کی کوشش کی جاتی ہے، زمانۂ ماضی میں اسلامی تحریکوں کا یہی معاملہ تھا اور سامراجی وصیہونی اسلام دشمن طاقتیں اس پیچیدگی کو مزید ہوا دے رہی ہیں، آپ کے نزدیک اس دشواری کا کیا حل ہے؟ اسلامی تحریک کے نوجوانوں کی اس سلسلے میں آپ کیا رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب: واقعہ یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے، یعنی دین کے داعی و مبلغین اور حکومتیں دونوں ہی اس کی ذمہ دار ہیں۔ جہاں تک حکومت کے ذمہ داروں کا تعلق ہے، تو ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر اسلامی تحریک کے بارے میں غلط تصور رکھتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تحریکیں ان کے اقتدار کو نیست و نابود کر دیں گی، حکومت کے لوگ اسلامی تحریکوں کے ذمہ داروں سے ملک کے لیے کسی قسم کی کوئی مدد حاصل کرنا پسند نہیں کرتے، اس سلسلے میں ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ لہذا یہ لوگ اپنے اقتدار کے تحفظ و بقا کے لیے اسلامی تحریکوں اور اسلامی نہج پر کام کرنے والوں کو اپنا جانی دشمن سمجھتے ہیں، اور ان کو ہر طرح سے ختم کرنے پر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیتے ہیں۔

ذمہ داری کے دوسرے جزو کا تعلق دینی کام کرنے والوں سے ہے، وہ یہ کہ یہ حضرات ذمہ دارانِ حکومت سے ٹکرانے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں، اور اگر اجازت ہو تو دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ ارباب منصب کو ایمان کی دعوت پہنچائیں، دوسرے یہ کہ خود اہل ایمان اقتدار کی باگ ڈور براہ راست سنبھال لیں۔ بہت سے لوگ اہل ایمان کو منصب حکومت تک پہنچانے کو ترجیح دیتے ہیں، یعنی اپنے علاوہ کسی دوسرے پر اعتماد کیے بغیر براہ راست اقتدار سنبھالنا چاہتے ہیں؛ لیکن اس کے برعکس اہل اقتدار تک ایمان کی دعوت پہنچ جائے اور وہ دین اسلام کے داعی بن جائیں اور اس کے لیے جد و جہد کریں، اس کے بارے میں بہت کم حضرات سوچتے ہیں۔

میں یہ عرض کروں گا کہ پہلی ذمہ داری ہمارے ان حکام پر عائد ہوتی ہے جو اسلام کو ایک مقابل دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، گویا کہ وہ ان کے اقتدار و تسلط اور حکومت کے لیے خطرہ ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ یہ حضرات اسلامی عقیدہ کے حاملین کے ساتھ صلح و آشتی کا برتاؤ کریں، تا کہ ملک اور اس کے باشندے سعادت و کامرانی سے ہم کنار ہوں۔

دوسری ذمہ داری ان داعیانِ دین پر عائد ہوتی ہے جو حکومت سے مقابلہ آرائی میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں، یعنی جو بلا وجہ و بلا ضرورت حکومتوں کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکومتیں کافر ہیں، وہ حضرات ان حکومتوں کے خلاف فتاوی صادر کرتے ہیں اور اسی طرح ان کے ساتھ متشددانہ معاملہ کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات حکمت و دانائی سے کام لیتے اور ایسے ہی اربابِ حکومت ان پاکیزہ و توانا عناصر سے استفادہ کرتے تو بہتر ہوتا۔

ہم کو ان بلا وجہ کی معرکہ آرائیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے کہ درحقیقت آج کل حکومتوں اور دشمنانِ اسلام کی جنگ نہیں ؛ بلکہ حکومتوں اور عوام کے درمیان جنگ برپا ہے۔

۱۹

نوجوانوں کی بے چینی کے اسباب

اور اس کا علاج

۱۹۷۳ء میں ۴؍جون سے ۲۰؍اگست تک حضرت مولاناؒ کی سربراہی میں رابطہ عالم اسلامی کے ایک وفد نے مشرق وسطیٰ کے چھ مسلم ممالک کا طویل دورہ کیا تھا۔ اسی دورہ میں اردن بھی جانا ہوا جہاں عمان کے "الكلية العلمية الإسلامية" کے ہال میں وفد کی آمد کی مناسبت سے ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اسی تقریب میں استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے حضرت مولاناؒ سے چند سوالات کیے تھے، جن کے حضرت مولاناؒ نے تفصیلی جوابات دیے تھے۔ ذیل میں وہ سوالات و جوابات ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' [شائع کردہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۵۱ تا ۲۶۵] سے نقل کیے جاتے ہیں۔

عالم اسلام میں بے چینی کے اسباب

سوال: استاذنا! آج پورا عالم اسلام عقیدہ، فکر اور عمل؛ غرض ہر سطح پر ایک تباہ کن اضطراب الجھن اور بے چینی میں گرفتار ہے۔ یہ بے چینی ہمارے ملک کے مسلم نوجوانوں میں خصوصاً نمایاں طور پر پائی جاتی ہے، تو سب سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اسباب کیا ہیں جن سے یہ بے چینی پیدا ہوئی ہے یا جن کی وجہ سے یہ باقی ہے؟

جواب: یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس علمی مذاکرہ میں مجھ پر اعتماد کیا اور مجھ سے اور میرے رفقاء سے اس سوال کا جواب طلب کیا ہے جو حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور جس صورت حال سے ہم گزر رہے ہیں، اس کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

حضرات! میں آپ سے بہت صفائی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھے بہت تعجب ہوتا اگر مسلم نوجوان اس بے چینی کا شکار اور اس اضطراب سے دوچار نہ ہوتے جیسا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں۔ درخت اگر اپنا پھل دیتا ہے تو وہ قابل ملامت نہیں ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ باغباں کوئی پودا نہ لگائے، لیکن اگر وہ ایک پودا لگاتا ہے، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، وقت پر اس کو پانی دیتا ہے، اس کی حفاظت اور نگرانی کے لیے مسلسل رات رات بھر جاگتا ہے اور چلچلاتی دھوپ اور کڑاکے کی سردی کسی چیز کی پروانہیں کرتا، اس امید میں کہ یہ درخت پروان چڑھے گا، توانا اور تناور ہو کر پھل دے گا، تو یہ نہایت غیر معقول اور غیر فطری بات ہوگی کہ جب وہ درخت اپنا قدرتی پھل دینے لگے تو باغباں درخت کو ملامت کرے، خفا ہو اور اس کے پھل کو ناپسند کرے اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے، اس لیے کہ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے اور جب سے وہ درخت وجود میں آیا ہے، اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، زیتون کا درخت زیتون کا پھل اور انار کا درخت انار ہی کا پھل دے گا۔

بے چینی کا اصل سبب۔ تعلیم وتربیت اور اطلاعات ونشریات کا تضاد

اس الجھن کا جس سے دنیا کے نوجوان خصوصاً مسلم نوجوان دوچار ہیں، سب سے اہم سبب تعلیم، تربیت اور اطلاعات ونشریات کا تضاد ہے۔ ان کے موروثی خیالات کچھ ہیں، ماحول کے تقاضے کچھ ہیں اور علمائے دین کے مطالبے کچھ ہیں۔ اس الجھن اور تباہ کن الجھن کا بنیادی سبب یہی عجیب وغریب تضاد ہے، جو نوجوانوں پر مسلط کر دیا گیا ہے اور اس نے ان کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بچہ ایک مسلمان خاندان اور مسلمان گھر میں پیدا ہوتا ہے، جس کی بنا پر بہت سے اسلامی عقائد سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے، پھر ایک مذہبی اور باشعور ماحول (جو اسلام کے اصولوں پر یقین رکھتا ہے) میں پروان چڑھتا ہے، اور اگر اللہ تعالی نے اسلامی تاریخ پڑھنے کی توفیق دی تو اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اور پھر اس کو جدید تعلیم گاہوں کی طرف ہانک دیا جاتا ہے (اس لفظ کے استعمال پر معذرت چاہوں گا، اس لیے کہ بچہ ابھی کم سن ہوتا ہے اور اس کو کوئی اختیار نہیں ہوتا) جہاں وہ اپنے اساتذہ سے (جن کی وہ تعظیم اور احترام کرتا ہے، اس لیے کہ وہ بہت سے فنون میں ماہر اور صاحب اختصاص ہوتے ہیں) ایسی باتیں سنتا ہے، جو ان افکار وخیالات کے بالکل خلاف ہوتی ہیں جو گذشتہ اسلامی تربیت کی وجہ سے اس کے ذہن ودماغ میں بیٹھ گئے تھے، ہر طرف وہ ایسی چیزیں دیکھتا اور سنتا ہے جو گذشتہ تمام چیزوں کی نفی کرتی یا کم سے کم ان کی تحقیر کرتی ہیں، اب وہ ایک عجیب تضاد اور شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور یہ ذہنی کشمکش سائے کی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی، یہاں تک کہ کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔

واقعہ یہ کہ جس ماحول میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس ذہنی کشمکش سے نجات کسی معجزہ سے کم نہیں ہوگی۔ یہ نازک ترین اور مشکل ترین قسم کی کشمکش ہے، متضاد قوتوں کے درمیان کشمکش، میدان جنگ میں بھی کشمکش ہوتی ہے، مگر جنگ کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مختصر ہوا کرتی ہے؛ لیکن اس کشمکش سے تو انسان ہر وقت دوچار رہتا ہے، خواہ مسجد ہو، خواہ مدرسہ، گھر ہو یا بازار، یہاں تک کہ اپنے اور اپنے نفس کے درمیان بھی اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

اس تلخ، خوفناک، ہلاکت آفریں اور گہری کشمکش کا سرچشمہ اطلاعات ونشریات اور صحافت (وسیع مفہوم میں) کے ادارے اور ٹیلی ویژن ہوتے ہیں، ہمارے نوجوان ہر وقت ایسے پروگرام

سنتے اور دیکھتے ہیں جوان کی قدیم تربیت کے باقی ماندہ اثرات کو بھی ختم کر دیتے ہیں، ان کے دماغوں میں ذہنی بغاوت اور نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتے ہیں، پریس یا جرنلزم جو بہت سے لوگوں کی نگاہ میں (His Majesty) سے کم نہیں ہے، ہمارے نوجوانوں کو صبح سویرے نہار منہ اور قبل اس کے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کریں، فاسد اور متعفن غذا دیتا ہے، اور ان کے سامنے جذبات کو برانگیختہ کرنے والا مواد پیش کرتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے، وہ کسی عورت کی برہنہ تصویر، فحش عنوانات یا ایسے مضامین اور تبصرے ہوتے ہیں، جو ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں، اور ایمان واعتماد کی بنیادوں کو متزلزل کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوان ان چیزوں کو پورے ذوق وشوق اور دلچسپی وانہماک سے پڑھتے اور ان سے متاثر ہوتے ہیں۔

ان کے ہاتھوں میں ایسی علمی کتابیں آتی ہیں، جو مرعوب کن عنوانوں کی حامل ہوتی ہیں، اور جو ایسے مصنفین کا نتیجۂ فکر ہوتی ہیں جن کی ذہانت، عبقریت اور کمال پر ہمارے نوجوانوں کا ایمان ہوتا ہے۔ یہ کتابیں مفسد اور مشکک مواد سے پُر ہوتی ہیں، جو مذہب کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اس امت کی صلاحیتوں اور اس کے ابدی پیغام کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اور عربی زبان کی صلاحیت کو مشکوک قرار دیتی ہیں، علمی نظریات اور ذہن ودماغ کو ماؤف کرنے اور تہذیب واخلاق کو بگاڑنے والے افکار وخیالات کا عجیب وغریب معجون مرکب جب ہمارے نوجوانوں کے دماغوں میں اترتا ہے، تو سخت بے چینی اور پریشان کن الجھن کو جنم دیتا ہے۔ یہ معجون مرکب تو ایسا ہے کہ بڑے سے بڑے پختہ ذہن آزمودہ کار اور بالغ نظر شخص کو الجھن میں مبتلا کر دے، تو ہمارے نرم ونازک نوجوان، یہ نرم ونازک شگوفے جو ابھی کھلے نہیں ہیں، کس طرح اس کو ہضم کر جائیں گے؟ ان سے کیوں کر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان سخت تھپیڑوں کے سامنے ٹکے رہیں گے؟

حضرات! یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کوئی گاڑی یا سواری ہو اور اس کے آگے بھی ایک گھوڑا ہو اور پیچھے بھی، اور دونوں اپنی اپنی سمت گاڑی کو کھینچ رہے ہوں، تو جس طرح اس گاڑی کے سوار سخت کشمکش اور الجھن میں مبتلا ہوں گے، اسی طرح ہمارے نوجوان ایک جھولے میں دائیں بائیں جھول رہے ہیں۔

عرب دارالحکومتوں سے، جن کو فکری اور مذہبی قیادت حاصل تھی، کم سے کم پچاس سال سے جو ادبی سرمایہ ہمارے سامنے آ رہا ہے، اس نے نونہالوں، نوجوانوں بلکہ بعض سن رسیدہ لوگوں کے

دلوں میں بھی شک واضطراب کے بیج بوئے۔ان کو بعض اوقات اپنے وجود پر بھی شک ہونے لگا، اور وہ تمام چیزیں- جو شہرت وتواتر سے آگے بڑھ کر بدیہیات تک پہنچ گئی ہیں- مشکوک نظر آنے لگیں۔ان کتابوں نے جن کے پیچھے دولت، شہرت، فکری قیادت یا نعروں اور تالیوں کی گونج جیسے سستے مقاصد کار فرما تھے، ہمارے نوجوانوں کے دلوں اور دماغوں میں شک وارتیاب، الجھن، کشمکش اور تضاد کی تخم ریزی کی، چنانچہ مجھے موجودہ صورت حال پر کوئی حیرت اور تعجب نہیں ہے، اور یہی نوجوانوں کی الجھن اور بے چینی کا بنیادی سبب ہے۔

نظام تعلیم کی ثنویت کو ختم کرنے کی ضرورت

سوال: نوجوانوں کی اس بے چینی کا علاج کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک نوجوانوں کو اس مہلک الجھن سے نجات دلانے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ نظام تعلیم کی دوئی ختم کردی جائے۔آپ کے سامنے اس نکتہ کی وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت تعلیم دو بلاکوں میں تقسیم ہے: مذہبی بلاک اور غیر مذہبی اور سیکولر بلاک، یا قدیم بلاک اور جدید بلاک۔نظام تعلیم کی یہی ثنویت یا دوئی نوجوانوں کی موجودہ الجھنوں کا اہم ترین سبب ہے۔

سب سے پہلے مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت

اس لیے اگر ان الجھنوں کو دور کرنا ہے، تو سب سے پہلے مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جیسا کہ میں نے کہا: خود تعلیمی مواد میں تضاد پایا جاتا ہے، ایک تعلیم جس چیز کو ثابت کرتی ہے، دوسری اس کی نفی کردیتی ہے، اسی طرح ان علوم کا بھی جو بظاہر عقائد سے تعلق نہیں رکھتے، عقائد سے بہت گہرا تعلق ہے، تعلیم مجرد اور معروضی نہیں رہی، تعلیم کے غیر جانبدار، بے رنگ اور عقائد پر اثر انداز نہ ہونے کا نظریہ بہت پرانا اور کب کا مسترد اور (Out of Date) ہو چکا، اب اس نظریہ میں ذرہ برابر بھی صحت اور واقعیت باقی نہیں رہی۔

تعلیم ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے

پس پہلا انقلابی اور بنیادی قدم یہی ہے کہ نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جاتی، نہ کوئی قدیم ہے نہ جدید، نہ کوئی مذہبی ہے (لاہوتی اور یورپین عیسائی کہنوتی مفہوم میں نہ کہ صحیح اسلامی مفہوم

میں) کوئی تعلیم نہ لاہوتی ہے، نہ دنیوی، نہ عصری، نہ سیکولر، تعلیم ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے، اگر کوئی تقسیم ہوسکتی ہے تو مقاصد اور وسائل کی تقسیم ہوگی، اور ان وسائل کے اندر بھی ایک وحدت ضروری ہے، جو اُن کو باہم متحد اور بنیادی نصب العین کا پابند بنا سکے۔ (۱)

اس تضاد کو دور کرنے کی ضرورت

پھر اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جس کو شریعت اور قرآن کی زبان میں ''نفاق'' کہتے ہیں۔ ہم آہنگی سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے، بلکہ ایک ہی ملک کے نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ بلا شبہ اس کے لیے پورے نظام تعلیم کو از سر نو ترتیب دینا ہوگا اور ایسا نظام تعلیم وضع کرنا ہوگا جو ایک مکمل، مرتب اور باہم پوری طرح سے ہم آہنگ اکائی ہوگا۔ اس کے لیے ایک زبردست انقلاب لانے کی ضرورت ہے، ایسا انقلاب جو جرأت مندانہ، وسیع و عمیق اور ہمہ گیر انقلاب ہو، اور پھر قدرتی طور پر ایسے پختہ فکر اور بالغ نظر افراد کی ضرورت ہوگی جو صرف یورپ کے خوشہ چیں نہ ہوں۔ نصاب تعلیم میں اجتہاد سے کام لینے کی ضرورت ہے، اس کے لیے قدرتی طور پر زبردست منصوبے تیار کرنے ہوں گے، وسیع اور ہمہ گیر سطح پر جدوجہد کرنی ہوگی اور اسلامی حکومتوں اور اہم اسلامی اکیڈمیوں کو ان منصوبوں کی سرپرستی کرنی ہوگی۔ اگر ہم نظام تعلیم کو بدلنے میں کامیاب ہوگئے، اور اگر ہم نے اپنے معاشرے سے یہ تضاد ختم کر دیا تو مجھے پوری امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس ہلاکت آفریں کشمکش اور الجھن سے نجات پا جائیں گے۔

اسلام کی برتری پر حکومت کا غیر متزلزل ایمان اور پختہ عقیدہ ہونا چاہیے

سوال: ان اداروں کے درمیان صحیح ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے حکومت کا کیا مثبت رول ہونا چاہیے؟

جواب: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ہلاکت آفریں عوامل کو دور کرنے اور معاشرہ کو پرامن اور پر سکون زندگی عطا کرنے کے سلسلے میں حکومت کا کردار بہت اہم اور فیصلہ کن ہوتا ہے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب حکومت کے پاس کوئی واضح فکر ہو۔ میں یہاں کسی مخصوص حکومت کا

(۱) تعلیم اور نظام تعلیم کے متعلق حضرت مولانا کی آراء کے لیے دیکھیں: 'اسلام اور علم' اور 'نظام تعلیم۔ مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت' (شائع کردہ: سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی)۔

تذکرہ نہیں کررہا ہوں، نہ کسی پر تعریض مقصود ہے، میں ایک علمی موضوع پر گفتگو کررہا ہوں، اس مذہب کے بارے میں واضح فکر ہو جس پر اس کا ایمان ہے، ان مقاصد کے بارے میں واضح فکر ہو جن کو حکومت نے اپنا نصب العین بنایا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ یہ مقاصد زندہ رہیں، نہ صرف زندہ رہیں بلکہ پھلیں پھولیں۔ اسی کو ہم اسلام کی دینی زبان میں ایمان اور عقیدہ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ حکومت کا غیر متزلزل ایمان اور پختہ عقیدہ ہونا چاہیے اسلام کی برتری پر، ان اعلیٰ مقاصد کی برتری پر جن کی وہ دعوت دیتی ہے اور جن کے لیے وہ زندہ ہے، اسے جبایت [1] (تحصیل وصول) کے بجائے ہدایت کے اصول پر کاربند ہونا چاہیے۔

پھر اخلاص، اولوالعزمی اور جاں نثاری کا جذبہ ہونا چاہیے، یہی تمام عوامل اسلامی شخصیت کی نشوونما، ارتقا، تکمیل اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے مناسب فضا اور مناسب ماحول پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے لیے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کی ضرورت ہے

سوال: آخر میں میں استاذ ابوالحسن سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے تجربوں کی روشنی میں - جن سے وہ اپنی جوانی اور کہولت کے دور میں گزرے ہیں، اور اس وقت بڑھاپے کے دور میں داخل ہو چکے ہیں - اس آخری تجویز پر تبصرہ کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ آخر میں نوجوانوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے نوازیں گے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ استاذ کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے۔

جواب: میں نوجوانوں کی صلاحیت اور ان کے کردار سے مایوس نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ ہمارے نوجوان اسلامی دعوت اور اسلامی فکر کے میدان میں کچھ کرنا چاہتے ہیں، اور اس فکری رزم گاہ میں جس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے، وہ بحیثیت مسلم نوجوان کے اپنا رول ادا کرنا چاہتے ہیں۔

حضرات! نوجوانوں میں مختلف طبقے اور درجے ہیں، ان کی کوئی ایک قسم نہیں ہے۔ ہم نے

---

(۱) اس اصول کی بہترین نمائندگی سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا وہ تاریخی جملہ کرتا ہے، جو انھوں نے اپنے ایک عامل کی اس شکایت پر فرمایا تھا کہ اسلام پھیل جانے کی وجہ سے جزیہ میں کمی ہوگئی ہے، آپ نے فرمایا: برا ہو تمہارا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل نہیں بنا کر بھیجے گئے تھے۔ (ابوالحسن علی ندوی)

بہت سے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جو اپنا رول ادا کرنے کے لیے بے قرار ہیں، ان کے اندر اس کی مکمل صلاحیت بھی موجود ہے، موجودہ صورت حال سے ان کو سخت دکھ اور تکلیف ہے، یہی نوجوان حال کا سرمایہ اور مستقبل کی امید ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی نوجوان موجودہ فکری دھارے کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ میں اپنی معلومات کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ نوجوانوں میں اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے وسیع میدان موجود ہے، ان کے اندر بے چینی پائی جاتی ہے، یہی بے چینی ترقی اور بہتری کی طرف پہلا قدم ہے۔

نوجوان آج پریشان ہیں، بے چین ہیں، مغربی تہذیب ان کو مطمئن کرنے میں ناکام ہوگئی، نوجوانوں کی زندگی میں ایک خلا پایا جاتا ہے، جو نہ پُر ہوا ہے نہ پُر ہوسکتا ہے، جیسا کہ استاذ کامل الشریف نے فرمایا، صرف ایک ہی مذہب اس ہولناک خلا کو پر کرسکتا ہے جو یورپ نے قلب و روح اور جسم و مادہ کے درمیان پیدا کردیا ہے، یہ مغربی تہذیب کی مخصوص چیز تھی جو اپنے طویل سفر میں مخصوص مراحل اور مخصوص تجربوں سے گزری۔

لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے اور اسے انسانیت کی بدقسمتی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب یورپ کو فکری قیادت حاصل ہوئی تو اس کے تجربوں نے ان قوموں کے ذہن پر بھی اثر ڈالا جن کا ان تجربوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا، یہ ایک مخصوص معاشرہ کے تجربے تھے، جس کے مذہب کا ایک خاص مزاج تھا، اس معاشرہ میں کلیسا اور حکومت کے درمیان کشمکش ہوئی، مذہب اور تعلیم کے درمیان کشمکش ہوئی، کہنوت، عقل سلیم اور موجودہ سائنس کے درمیان کشمکش ہوئی، یہ تمام تجربے یورپ کے اپنے مخصوص تجربے تھے، مشرق ان سے بالکل بے نیاز اور ناآشنا تھا؛ لیکن یورپ نے اور مغربی تہذیب نے یہ تجربے، ان تجربوں کے اثرات، ان تجربوں کے نتائج اور ان تجربوں کی قدر و قیمت ہر چیز کو مشرقی قوموں پر مسلط کردیا۔

''مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے،'' ''مذہب و سیاست دو علاحدہ چیزیں ہیں''، اور اس طرح کے دوسرے نظریات مغربی قوموں کے تجربات تھے، جو مخصوص حالات، مخصوص ماحول اور مغرب کے مذہب یعنی عیسائیت کے مخصوص مزاج کی پیداوار تھے؛ لیکن مشرقی قوموں نے بغیر کسی سبب اور وجہ جواز کے ان تجربات کو قبول کرلیا، چنانچہ یہ خلا نوجوانوں میں پایا جاتا ہے اور ان کو اس خلا کا احساس بھی ہوچلا ہے، آج ہم کو نوجوانوں کی زندگی میں جو بے راہ روی، بے اعتدالی اور انتہاپسندی نظر آرہی ہے، وہ اسی احساس کا نتیجہ ہے۔

میں ایشیا اور مشرق میں اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ نوجوانوں کے اندر اس نئی تحریک کی قیادت اور اس فکری معرکہ میں کودنے کی پوری صلاحیت اور قابلیت موجود ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے اور نوجوانوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، ہم ان سے بے تعلق رہتے ہیں۔ ہمارے اندر ان کی طرف سے بہت غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پائی جاتی ہیں، ہم اس صورت حال سے بالکل ناواقف ہیں، جس سے آج کا جوان گزر رہا ہے۔ اگر بوڑھوں اور نوجوانوں، مبلغین اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے، ختم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے نوجوان اس دعوت سے متاثر، اس کے مقاصد سے مطمئن اور اس کو فروغ دینے کے لیے سرگرم عمل نہ ہوں، لیکن اس کے لیے بہت نازک، گہری اور باریک علمی منصوبہ بندیوں کی ضرورت ہے، ایک نئے لٹریچر کی ضرورت ہے، نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے لیے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کی ضرورت ہے، اس حکمت کی ضرورت ہے جس کی جانب قرآن نے اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے: ﴿أُدْعُ إِلَى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵] "آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور (اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجیے (کہ اس میں شدت و خشونت نہ ہو)"۔

اس کے لیے طاقتور، فکر انگیز و گوہر بار قلم کی ضرورت ہے، مافی الضمیر کی ادائیگی پر غیر معمولی قدرت، ادبی چاشنی، شیریں گفتار اور اس پر کشش سحر انگیز اور دلآویز انداز بیان کی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی دعوت نوجوانوں کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتی اور ان کے ذہن و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتی۔

زبان وادب پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت

ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض محترم اور فاضل علماء زبان وادب پر عبور حاصل کرنے اور زور بیان اور بلیغ اور دل نشین اسلوب پیدا کرنے کو فضول، غیر ضروری اور بالکل ضمنی چیز سمجھتے ہیں۔ ان چیزوں کو ہمارے علماء اپنے فرائض سے علاحدہ اور اپنے راستہ سے انحراف سمجھتے ہیں؛ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے خود اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے، اور ہم سب کا اس پر ایمان ہے کہ اللہ سب سے بے نیاز ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی کتاب

کو ایک معجز اسلوب اور عربی مبین میں نازل فرمایا، اور یہی نہیں بلکہ اس پہلو کو ایک سے زیادہ جگہوں پر اجاگر بھی کیا، ارشاد ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِيْنٍ﴾ [الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵] (اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تا کہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِنَّآ أَنْزَلْنٰهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ [یوسف: ۲] (ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تا کہ تم (بوجہ اہل زبان ہونے کے اولاً) سمجھو)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان، اسلوب اور بلاغت کا پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے، اور جب ہم دعوت وعزیمت اور تجدید واحیائے دین کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ و برگزیدہ شخصیات جو اخلاص، انقطاع الی اللہ اور ربانیت صادقہ کے نقطۂ عروج پر تھیں، انھوں نے کبھی اس پہلو کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا؛ بلکہ اس کی طرف پوری توجہ کی اور اس پر پورا زور دیا۔

ہم اس موقع پر نبی کریم ﷺ کی مثال تو نہیں پیش کرنا چاہتے؛ کیونکہ آپ بالاتفاق اور بغیر کسی شک وشبہ کے فصیح ترین اور بلیغ ترین انسان تھے، البتہ ہم حضرت علی بن ابی طالب (كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ) کی مثال پیش کرتے ہیں، جو بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ اور اسی طرح تاریخ اسلام کی آخری صدیوں تک نظر دوڑاتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ جن شخصیات کو بھی اسلامی دعوت وتحریک میں قیادت کا منصب حاصل رہا ہے، انھیں اللہ تعالیٰ نے زور بیان، مخاطب کی نفسیات کی فہم اور فصاحت وبلاغت کا بہرہ وافر عطا کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب میں سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات پڑھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ وہ شخص جو ساری دنیا میں اور ہر دور میں اپنے زہد، قناعت، ربانیت اور تقویٰ کے لیے مشہور رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے دارالحکومت اور عباسی خلافت کے مرکز بغداد میں جہاں حریری، ابن الجوزی اور صابی پیدا ہوئے، جہاں بحتری، شریف رضی، متنبی، ابوتمام اور معری نے نغمہ سنجیاں کیں، وہی شخص اپنے اس معاشرہ کو ایک سحر انگیز انداز بیان میں مخاطب کرتا ہے، ایسے انداز بیان میں جو دلوں کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور جس کی تاثیر اور طاقت آج بھی موجود ہے، اسی تاثیر کے پیش نظر حضرت جیلانی کے خطبات کو جمع کرنے والوں نے کوشش کی ہے کہ بعینہ ان کے الفاظ بھی ہوں، ورنہ اگر معنوی روایت ہوتی تو یہ خطبے اپنی تاثیر بڑی حد تک

کھو دیتے، ان سب باتوں سے ادب اور اسلوب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

نوجوانوں کے لیے لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت

اگر ہم نوجوانوں کی صحیح اور گہری اسلامی تربیت کرنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے ہم کو نئے علمی وادبی اسلحہ سے مسلح ہونا پڑے گا، تیاری کرنی ہوگی، ان تمام شرطوں کو پورا کرنا ہوگا جو ہر زمان ومکان کے لیے ہیں اور جو آج بھی اپنی قیمت، اہمیت اور اثر رکھتی ہیں، یعنی ایک ایسا علمی اور اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہوگا جو نوجوانوں کے ذہن سے قریب ہو، جوان کو اپیل کرے، جسے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہو؛ بلکہ وہ اس کو پڑھنے کے لیے بیتاب اور بے قرار ہوں، اگر ہم نے یہ شرطیں پوری کرلیں تو مجھے یقین ہے کہ نوجوان صرف یہی نہیں کہ اس نظریہ پر ایمان لائیں گے؛ بلکہ اس کو عام کرنے کی ہر ممکن جدو جہد کریں گے اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔

اخلاقی قیادت کر کے ہی مسلمان اس ملک کی ناگزیر ضرورت بن سکتے ہیں!

حضرت مولاناؒ ۱۹۸۳ء میں سہ روزہ دورہ پر پٹنہ تشریف لے گئے، تو ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق بعض سوالوں پر ان کی رائے جاننے کے لیے ''قومی آواز'' کے نمائندے شاہین محسن نے یہ انٹرویو لیا، جو ہفت روزہ ''نقیب''، پٹنہ اور پھر ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا۔

مفکّر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن ندوی ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ملک اور قوم کی اخلاقی قیادت کر کے مسلمان ہندوستان میں اپنا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں۔ مولانا کی رائے ہے کہ دیگر قوموں کے مقابلے، مسلمان اخلاقی قیادت بہتر ڈھنگ سے انجام دے سکتے ہیں؛ کیونکہ وقت کی سب سے بڑی آزمائش دولت کی محبت اور عارضی آسائش کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کر دینے کا رجحان ہے؛ تاہم مسلمانوں میں دولت سے رغبت کے فروغ کے بعد بھی یہ حقیقت ہے کہ مسلمان دولت کو معبود کا درجہ کبھی نہیں دیں گے، اگر ذرا بھی ایمان کی رمق باقی ہے، تو دولت کا ان پر وہ جادو نہیں چل سکتا جو دوسری قوموں کو اپنے جال میں لیے ہوئے ہے؛ نیز مسلمان اس زندگی کو ہی اوّل وآخر نہیں سمجھتے، ان کا ایمان ہے کہ اس کے بعد بھی زندگی ہے جس میں دولت نہیں، اچھے اعمال، اخلاق اور خوف خدا کام آئے گا۔

اور یہی وہ پس منظر ہے جس میں مولانا سید علی میاں ندوی نے ہندوستانی مسلمانوں کو ''اخلاقی قیادت'' کے ذریعے ملک کی ''ناگزیر ضرورت'' بننے اور عزّت واحترام کا مقام حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود مسلمانوں کی زیادہ اہمیت نہ ہونے سے متعلق سوالات کے جواب میں علی میاں نے یہ معنی خیز جواب دیا کہ ''کسی قوم یا فرقے کا وزن اس وقت محسوس کیا جاتا ہے، جب ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ نفع کے علاوہ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

مولانا علی میاں سے ''قومی آواز'' کے لیے جو خصوصی انٹرویو لیا گیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ش. م. : ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ حالت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا علی میاں: میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس نہیں، اس لیے

کہ ملک میں ان کے کرنے کو بہت کام ہیں۔ وہ ان کاموں کے ذریعہ خود کو ملک کی ناگزیر ضرورت بنا سکتے ہیں، اور جب ضرورت ہوتی ہے تو دیر یا سویر کام کرنا پڑتا ہے۔

سب سے بڑا کام اخلاقی قیادت کا ہے

ش.م.: مسلمانوں کے لیے آپ کون سا کام تجویز کرتے ہیں؟

مولانا علی میاں: ''سب سے بڑا کام اخلاقی قیادت کا ہے، جسے صرف مسلمان ہی کر سکتے ہیں، دیگر لوگ اس پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اس ضرورت کو پورا کر کے مسلمان نہ صرف ملک کی خدمت کریں گے؛ بلکہ یہ ان کی اپنی بھی خدمت ہوگی، کیونکہ قربانی، خلوص اور جدوجہد سے آبادی کا کوئی عنصر بشمول اقلیت، عزت کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کی خاص تاریخ گزری ہے، آزمائشوں کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے، اور اس کی روشنی میں میرا یہی خیال ہے کہ مسلمان اخلاقی و روحانی قیادت کر کے ہی ملک میں اپنا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی مسلمانوں کے لیے سیاسی قیادت سے اخلاقی و روحانی قیادت زیادہ آسان ہے؛ کیونکہ ان کے مذہب اور مذہبی پیشوا نے بھی ایسا ہی ان کا مزاج بنایا ہے۔ مسلمانوں کے تمام مذہبی رہنما اسی مشن پر ہندوستان آئے تھے، اور انھوں نے مساوات، اخوت، بھائی چارہ اور عدل و انصاف کی تعلیم دے کر صدیوں یہ خدمت انجام دی، اور ملک میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے گئے، خاص طور سے صوفیائے کرام نے جس بے لوث طریقے سے کام کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔''

مسلمانوں کے لیے اخلاقی قیادت آسان کیوں ہے؟

مسلمانوں کے لیے اخلاقی قیادت آسان کیوں ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے کہا'' کہ اس وقت کی سب سے بڑی آزمائش دولت سے محبت اور عارضی آسائش کے لیے بڑے سے بڑے مفاد کو قربان کر دینے کا رجحان ہے۔''

''مسلمانوں کو دولت سے زیادہ محبت نہیں، ویسے دولت سے بالکل رغبت نہ ہو، یہ کہنا خلاف حقیقت ہوگا؛ مگر یہ بھی سچ ہے مسلمان دولت کو معبود کا درجہ کبھی نہیں دیں گے، اگر ذرا بھی ایمان کی رمق باقی ہے تو دولت کا ان پر وہ جادو نہیں چل سکتا، جو دوسروں کو اپنے جال میں پھنسائے ہوئے ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اس زندگی کو اول و آخر نہیں سمجھتے۔ ان کا ایمان ہے کہ اس کے بعد بھی زندگی ہے، جس میں دولت نہیں، اچھے اعمال، اخلاق اور خوف خدا کام آئے گا۔ اسی لیے اخلاقی و روحانی قیادت کا کام مسلمان زیادہ بہتر ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔"

ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود مسلمانوں کو زیادہ اہمیت کیوں نہیں دی جاتی؟

ش.م.: جمہوریت میں تعداد کی بڑی اہمیت ہے، لیکن ہندوستان میں سکھوں اور دیگر اقلیتوں کے مقابلے مسلمانوں کی زیادہ تعداد ہونے کے باوجود، انھیں زیادہ اہمیت کیوں نہیں دی جاتی؟ اور اس کی تازہ مثال حالیہ فسادات کے دوران سکھوں کے لوٹے ہوئے مال کی برآمدگی میں حکومت کی مستعدی اور بازآبادکاری کے مؤثر سرکاری اقدامات ہیں؟

مولانا علی میاں: "میرے نزدیک اس کی وجہ دنیا کے عملی منطق میں کسی قوم و فرقے کا وزن اس وقت محسوس کیا جاتا ہے، جب ثابت ہوتا ہے کہ وہ نفع کے علاوہ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، خواہ اپنی شرافت یا قابل لحاظ وجہ کی بنا پر صدیوں تک نقصان نہ پہنچائے۔"

مولانا علی میاں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے مزید کہا کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ ماں سے بڑی کوئی ہستی نہیں، لیکن جو بچہ کبھی نہیں روتا، ضد نہیں کرتا، وہ اکثر غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، اور شفیق ماں بھی اپنی اس اولاد کو نظر انداز کر دیتی ہے۔"

مسلمانوں کو بھی اس ملک میں اپنا وزن ثابت کرنا ہوگا

علی میاں نے اپنی مستحکم آواز میں کہا:

"مسلمانوں کو بھی اس ملک میں اپنا وزن ثابت کرنا ہوگا، اور انتخابات کی سیاست اور جمہوری نظام نے ان کو اس کا موقع دیا ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ ہار جیت کے ترازو میں "پاسنگ" کا کام انجام دے سکتے ہیں، اور ان کی واقعی ضرورتوں اور شکایتوں کو زیادہ دن نظر انداز کر کے کوئی بھی پارٹی زیادہ دن حکومت نہیں کر سکتی۔"

مسلم پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کی باتیں کیوں کی جاتی ہیں؟

ش.م.: مسلم پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کی باتیں کیوں کی جاتی ہیں اور اس کے لیے کون

ذمہ دار ہے؟

مولانا علی میاں: ''اس کا محرک ایک تو یہ خیال، جو بہت سطحی ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ملک کی وحدت کا ضامن ہوتا ہے''۔

''یہ بے حد سطحی خیال ہے۔'' مولانا علی میاں نے زور دیتے ہوئے اپنی عالمانہ نگاہیں بلند کر کے کہا: ''آپ جانتے ہیں کہ برطانیہ اور جرمنی دونوں مسیحی مذہب اور پروٹسٹنٹ فرقہ کے ہونے کے باوجود بدترین دشمنوں کی طرح لڑے۔ آج بھی عدالتوں میں دیکھیں کہ لوگ مشترکہ لا ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں، اور حریف کی عزت و دولت کے درپہ ہوجاتے ہیں۔''

مولانا علی میاں نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے مطالبہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی بتائی کہ ''ہمارے اکثر غیر مسلم بھائیوں نے اسلام اور اس کے قانون و معاشرتی نظام کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا، اور یہی کچھ حال مسلمانوں کے اس تعلیم یافتہ طبقہ کا ہے جسے اپنے مذہب کی ضروری حد تک معلومات نہیں۔

مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے والا ایک تیسرا عنصر وہ ہے جو دوسروں کا آلۂ کار بنتا ہے یا اس کے ذریعے سے عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

مولانا علی میاں نے کہا کہ ''مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں اتنا لٹریچر مہیا ہو گیا ہے اور خود انگریزی زبان میں تیار لٹریچر کے ذریعے بھی ان لوگوں کو صحیح معلومات حاصل کرنے کا پورا موقع ہے؛ لیکن لوگ اس دردسری کے لیے تیار نہیں، وہ رٹائے ہوئے طوطے کی طرح سبق پڑھتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا نعرہ بلند ہوتا رہتا ہے۔''

نیا وقف ایکٹ

ش.م.: نئے وقف ایکٹ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا علی میاں: ''نئے وقف ایکٹ میں ایسے کچھ دفعات ہیں، جس سے وقف کرنے والوں کے مقاصد متاثر ہوتے ہیں، اور مسلمان آزادی کے ساتھ، یہاں تک کہ خود وقف بورڈ وقف کے مفاد میں کوئی انتظامی کارروائی نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنجہانی پرائم منسٹر صاحبہ اور پریزیڈنٹ (صدر جمہوریہ ہند) کو تار و خطوط بھیجے گئے،

جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوگی۔

اتفاق سے میں اس کے بعد ہی دہلی گیا، تو آنجہانی وزیر اعظم صاحبہ نے حکومت کے ایک بڑے عہدیدار کو، جو ایک ریاست کے گورنر ہیں، میرے پاس بھیجا تھا کہ وہ مجھ سے اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کریں اور ان کو متعین طریقے پر وہ پائنٹ معلوم ہوسکیں جن کی وجہ سے اس بل سے (جو عجلت کے ساتھ پارلیمنٹ میں پیش ہوا) متعلق اعتراضات معلوم کرسکیں۔"

مولانا علی میاں نے کہا کہ "میں نے پوائنٹس لکھ کر ان کو دیے، اور مجھے معلوم ہوا کہ آنجہانی پرائم منسٹر صاحبہ نے ان کو توجہ سے دیکھا اور اس کی روشنی میں بل کی اصلاح کرنے کا وعدہ کیا۔

وقف بل کے متعلق مسلم جماعتوں کے ذمہ داروں کی طرف سے مفصل بیانات شائع ہوئے ہیں، جن میں امیر شریعت بہار و اڑیسہ مولانا سید منت اللہ رحمانی اور سید شہاب الدین صاحب (سابق ایم. پی.) کے بیانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

مسلمانوں کی تعلیمی سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اہم اقدامات

ش. م.: مسلمانوں کی تعلیمی سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کس طرح کے اقدام ضروری ہیں؟

اس سوال پر مولانا علی میاں کچھ دیر خاموش رہ کر مجھے دیکھنے لگے، تو میں نے کہا کہ "یہ کچھ مادّی قسم کا سوال ہے۔" مولانا علی میاں نے برجستہ کہا کہ "مادی نہیں، وسیع سوال ہے" اور پھر وہ یوں گویا ہوئے:

"پہلے تو مسلمانوں میں تعلیمی، سماجی اور شہری شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور تعلیم کی اہمیت کو دل و دماغ میں بٹھانے کی ضرورت ہے، پھر جو اقلیتی ادارے ہیں، ان کے مخلص ذمہ داروں اور کارکنوں کو چاہیے کہ ان کو ترقی دیں، ان میں اچھا نظم و ضبط اور ڈسپلن قائم کریں، اور ذاتی و محدود مفادات کے لیے ان میں انتشار نہ پیدا کریں، نیز کثرت سے قصبات و دیہاتوں میں تعلیمی ادارے قائم کریں، اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش اور ضروری مذہبی واقفیت کا انتظام کریں۔"

مولانا علی میاں کو اردو اکادمی کے زیر اہتمام مولانا سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی صد سالہ تقریبات ولادت کے افتتاحی جلسہ میں گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی کے ہمراہ جانا اور کلیدی خطبہ پیش کرنا تھا، نیز ٹیلیفون پر پریس سکریٹری مسٹر شفیع جاوید نے اطلاع دی تھی کہ

تقریب میں شرکت کا وقت ہو چکا ہے اور گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی حضرت مولانا سید علی میاں ندوی کے انتظار میں بیٹھے ہیں، اس لیے میں نے دارالعلوم دیو بند اور ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے متعلق سوالات کو چھوڑ کر رابطہ عالم اسلامی (جس کے مولانا علی میاں بھی سرکردہ رکن ہیں) کے متعلق سوال کر کے انٹرویو ختم کیا۔

مولانا علی میاں: ''رابطہ عالم اسلامی جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا، عالمِ اسلام کا سب سے بڑا نمائندہ ادارہ ہے، جس میں تقریباً تمام اسلامی ممالک یا ہندوستان جیسے مسلم اقلیت والے ملکوں کے صاحبِ فکر اور ممتاز لوگوں کو رکن منتخب کیا گیا ہے۔

اس کے بڑے مقاصد میں پسماندہ ممالک کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام، مدارس کی مالی اور اخلاقی مدد، جہاں ضرورت ہو مساجد کی تعمیر اور ان کے حالات اور مسائل سے واقفیت اور قانون کی امکانی حدود میں حل کرنے کوشش ہے۔''

ش. م.: اس سلسلے میں اب تک کتنا کام ہوا ہے؟

مولانا علی میاں: ''رابطہ عالم اسلامی نے مختلف ممالک بالخصوص براعظم افریقہ میں بڑا مفید کام انجام دیا ہے، اس کے وفود بھی جاتے ہیں، علاقوں کا دورہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور رابطہ کی سکریٹریٹ کو رپورٹ دیتے ہیں، اس کی روشنی میں مدد کی جاتی ہے۔''

﴿۲۱﴾

ملک کی خدمت اور اس کے لیے قربانی
مسلمانوں کی ذمہ داری

ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف ملکی اور ملی مسائل کے بارے میں حضرت مولاناؒ سے یہ انٹرویو روزنامہ "قومی آواز"، (لکھنؤ) کے نمائندے حسین امین نے لیا، اور اخبار مذکور کی اشاعت (بابت ۲۳ رمئی ۱۹۸۷ء) میں شائع ہوا۔

ہندوستان کی موجودہ صورت حال اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں

سوال: ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال میں آپ کے خیال سے مسلمانوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے: ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار کرنا بہتر ہوگا یا افہام وتفہیم کا طریقہ بہتر ہے؟

جواب: ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال مختلف طبقوں اور جماعتوں کی باہمی بے اعتمادی اور روز بروز محدود سے محدود ہونے والے دائروں سے پیدا شدہ انتشار کا شکار ہے۔ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی شدید کمی ہے جو وسعت نظر اور وسعت قلب کے ساتھ پورے ملک اور قوم کو سامنے رکھ کر سوچیں اور نفع اندوزی نہیں، بلکہ خدمت کی غرض سے سامنے آئیں۔ یہ بہت بڑا خلا ہے، جو بسا اوقات بڑے بڑے ملکوں اور بڑی بڑی طاقتوں کے لیے بھی ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ ملک کی اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے سامنے آنے اور کام کرنے کا بڑا اچھا موقع ہے۔ ہندوستان کے جمہوری نظام نے ان کے لیے راہیں کھول رکھی ہیں۔ ان کے پاس ایک پیغام ہے، نظام اخلاق ہے، قربانی اور خدمت کا جذبہ ہے، دولت کی یا خدا کے علاوہ کسی کی پرستش ان کے نزدیک ناجائز اور حرام ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے، رحمت عالم ﷺ کی امت کی حیثیت سے اور ہندوستانی شہری کی حیثیت سے بھی ان کی ذمہ داری ہے کہ خدمت کے جذبہ سے، لینے نہیں بلکہ کچھ دینے کی نیت سے، سامنے آکر ہندوستانی قیادت کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کریں، اور ذہن وفکر سے اور اپنے عمل وکردار سے اپنے آپ کو ملک کا سچا ہمدرد اور معمار ثابت کریں۔ ہم تحریک پیام انسانیت کے اجتماعات میں بھی اس پر زور دیتے ہیں، اور ابھی پچھلے دنوں حیدرآباد کے ایک بہت بڑے اجتماع میں مسلمانوں کو اسی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی تھی۔

یہ ہے ہمارے خیال میں مسلمانوں کا منصب اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں ان کی ذمہ داری۔ باقی رہے ایجی ٹیشن یا افہام وتفہیم، تو دونوں کے اپنے مواقع ہیں؛ لیکن ایک مسلمان کو بہرحال ایسی باتوں سے دور رہنا چاہیے جس سے بدگمانی اور انتشار میں اضافہ اور مسلمانوں کی تصویر خراب ہو، ایسے حالات پیدا کرنا صرف مفید ہی نہیں، ضروری ہے کہ لوگ مسلمانوں سے قریب ہوں اور ان کو سمجھ سکیں۔

ہر شخص اپنے میدان اور اختصاص کے لحاظ سے کوشش کرے

سوال: مسلمانوں کے متعدد نوعیت کے مسائل ہیں کچھ معاشرتی ہیں مثلاً پرسنل لا، یکساں سول کوڈ کا مسئلہ، بعض مسائل تعلیم سے متعلق ہیں اور کچھ معاشی حیثیت کے اور کچھ ان کے خالص مذہبی اور جذباتی مسائل ہیں، آپ کے خیال سے کس مسئلہ کو ترجیحی بنیاد پر حل کرانے کی کوشش کرنا چاہیے؟

جواب: آپ کی بات صحیح ہے کہ یہاں مسلمانوں کے مسائل متعدد اور متنوع ہیں، بعض مستقل اہمیت کے حامل اور توجہ کے متقاضی ہیں اور کچھ وقتی طور پر سامنے آجاتے ہیں اور زیادہ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں، جیسے شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے نے ایک اہم مسئلہ پیدا کر دیا اور مسلمانوں کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس وقت یونیفارم سول کوڈ یا بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ یہ سارے ہی مسائل توجہ اور مناسب جدوجہد کے طالب ہیں۔ ان میں سے کسی سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ہونا یہ چاہیے کہ مسلمانوں میں جن لوگوں کا جو میدان ہو اور جن کا اختصاص ہو، ان میں وہ لوگ دوسرے مسائل کی اہمیت کا انکار کیے بغیر اور دوسروں کی جدوجہد کی توہین، تضحیک کیے بغیر اپنی کوششیں جاری رکھیں، اور ضرورت ہو تو دوسروں کی مدد کریں، اختلاف نہ کریں۔

سوال: محترم! اب سے چند برس پہلے تک مسلمانوں کی توجہ تین مسائل پر مرکوز تھی، یعنی اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پرسنل لا۔ ان میں سے اوّل الذکر دو مسائل کا ذکر اب سننے میں نہیں آتا، آپ کا اس مسئلہ میں کیا خیال ہے؟

جواب: وہ مسائل اب بھی زندہ ہیں اور کچھ لوگ ان میں لگے ہوئے ہیں؛ ان کو لگے رہنا چاہیے؛ اگرچہ پرسنل لا کا مسئلہ اس وقت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

سوال: بابری مسجد کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے پرنس انجم قدر نے دونوں فرقوں کے نمائندوں کو ایک ساتھ بٹھا کر بات چیت کی جو تحریک چلائی ہے، تو کیا آپ اس میں شریک ہوں گے؟

جواب: پرنس انجم قدر ایک سمجھدار اور سنجیدہ انسان ہیں، ان کی یہ تحریک مناسب تھی، اور اب تو یہ نشست اور اس کی تفصیلات بھی اخبارات میں آ چکی ہیں۔ افہام و تفہیم کے جذبہ کے ساتھ دونوں فریق مل کر بابری مسجد کا مسئلہ انصاف پر حل کر لیں تو اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔!!

ندوہ کو حکومت سے منظور شدہ یونیورسٹی بنانا کیوں منظور نہیں؟

سوال: دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مزید توسیع و ترقی کے سلسلے میں آپ کے کیا منصوبے ہیں؟ تعلیمی، علمی، درس و تدریس، تہذیب اور مزاج، غرض ہر اعتبار سے دارالعلوم بلند معیار اور اعلیٰ قدروں کا حامل ایک ایسا ادارہ ہے، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں ایک باوقار مقام رکھتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ندوہ کو شمالی ہندوستان میں حکومت سے منظور شدہ ایک عربی یونیورسٹی بنوانے کی کوشش کریں؟

جواب: ندوۃ العلماء کے ایک خادم کی حیثیت سے ہماری یہ خواہش فطری ہے کہ ادارہ مزید ترقی کرے اور مفید خدمت انجام دے۔ اس سلسلے میں مناسب اور ممکن کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ ندوہ کا کوئی شعبہ یا کارگزاری آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چند سال قبل دعوت اسلامی کی تربیت کے لیے ایک شعبہ قائم کیا گیا، رابطہ ادب اسلامی کا مرکزی دفتر ندوہ ہی میں ہے، اس کے اغراض و مقاصد اور سرگرمیوں سے آپ واقف ہیں، آئندہ تعلیمی سال سے اساتذہ کی تربیت کا انتظام بھی زیر غور ہے۔

آزادئ ہند کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مرکزی حکومت کی مدد سے ندوہ کو ماڈل عربک کالج یا یونیورسٹی کی حیثیت دے دی جائے؛ مولانا آزاد اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے اور ندوہ کی مجلس منتظمہ کے ممبر بھی وہ اخیر تک رہے؛ اس وقت کے ناظم ندوۃ العلماء ڈاکٹر سید عبدالعلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے مولانا آزاد کے ساتھ گہرے مراسم بھی تھے۔ ان حضرات نے مولانا آزاد سے کہا کہ ”آپ جیسا وزیر تعلیم ہو تو اس تجویز میں کوئی حرج نہیں، لیکن آپ کے بعد کون آئے؟ اور کیا حالات

ہوں؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' اس پر مولانا آزاد بھی مطمئن ہو گئے اور ندوہ کو آزاد ادارہ کی حیثیت سے باقی رہنے کو ترجیح دی۔

ایجوکیشن، پولیس اور پریس درست ہو جائیں تو اس ملک میں جینا آسان ہو جائے

حضرت مولانا ۲۴؍اپریل ۱۹۹۴ء کو غازی پور تشریف لے گئے، وہاں ان سے ''نئی دنیا'' کے لیے عبید الرحمٰن غازی پوری نے مندرجہ ذیل مختصر انٹرویو لیا، جو پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵؍جولائی ۱۹۹۴ء) سے ماخوذ ہے۔
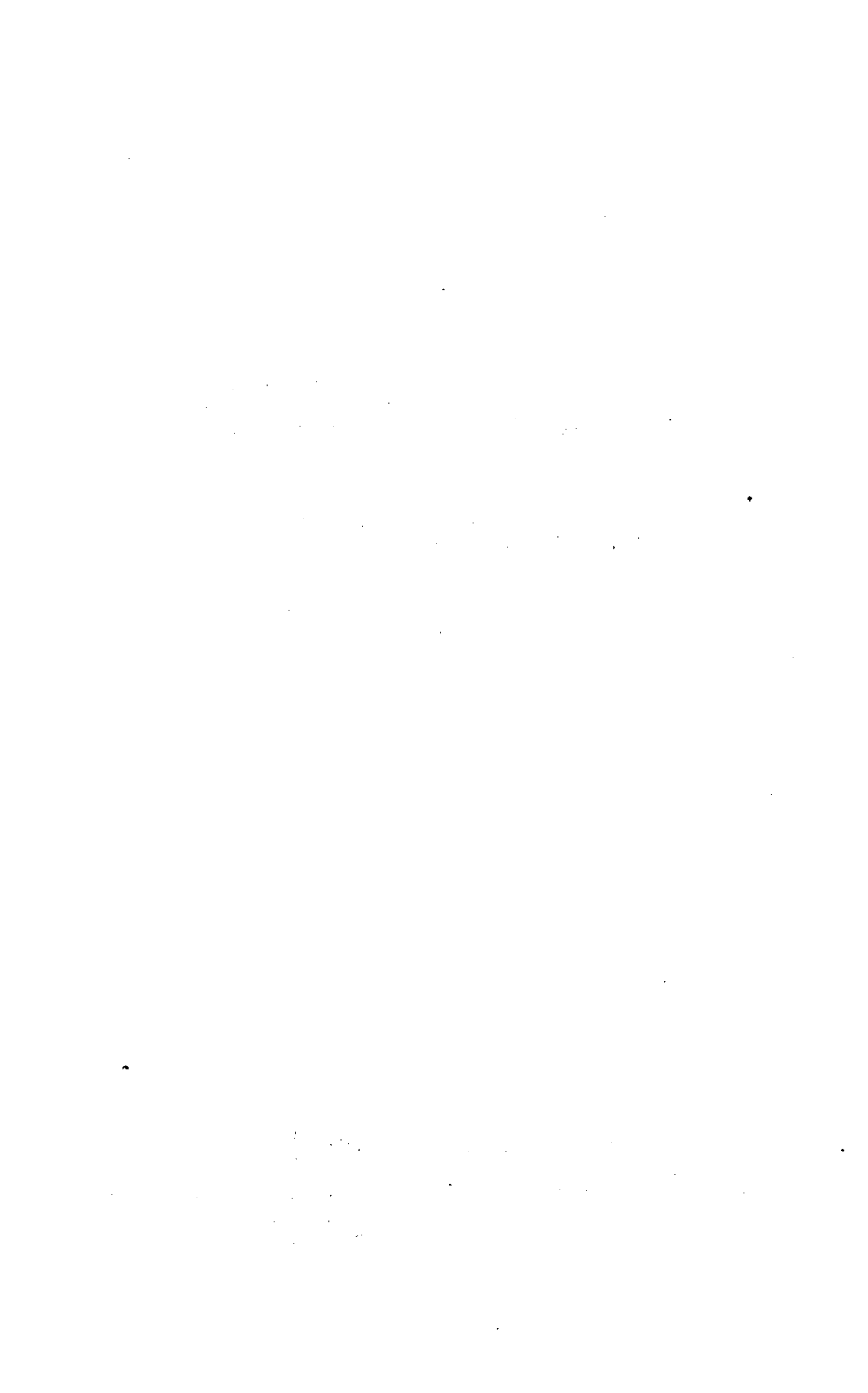
تحریک پیام انسانیت کا مقصد شعور پیدا کرنا ہے

سوال: پیام انسانیت فورم جو آپ کی بہت پرانی تحریک ہے،اس کا کیا مقصد ہے؟ کیا یہاں بھی آپ اسی تحریک کی خاطر آئے ہیں؟

جواب: جی ہاں! یہی جذبہ،یہی مقصد اور یہی تڑپ اس قدیم اور تاریخی شہر میں بھی کھینچ لائی ہے۔ ہمارے ملک میں کبھی کبھی جو جنون کا دورہ پڑتا ہے،آزادی کے وقت بھی اسی دیوانگی اور جنون کا دورہ پڑا تھا،یہ دورہ نہ پڑے،آپس میں میل جول،پیار و محبت بنا رہے،یہی پیام انسانیت فورم تحریک کا مقصد ہے۔ اس وقت علاج کرنے والوں کی ضرورت ہے،جو دیوانہ بن کر اس ملک کے گلی گلی،کوچے کوچے میں پھریں اور گھومیں،جتھے بنا بنا کر دورے کریں،عوام کو جمع کریں،ملک کے نام پر،انسانیت کے نام پر،عقل و انصاف کے نام پر ان سے اپیل کریں کہ اب ختم کرو،اب ٹھنڈے ہو جاؤ،اب جو تعمیری کام ہیں،ترقی کے کام ہیں،وہ کام کرو۔شعور پیدا کرنا ہی پیام انسانیت فورم تحریک کا مقصد ہے۔

اس ملک کی بقا و ترقی کے لیے تین چیزیں بہت ضروری ہیں

سوال: اس ملک کی بقا و ترقی کے لیے آپ کون سے اقدامات ضروری سمجھتے ہیں؟

جواب: اس ملک کی بقا کے لیے صرف تین چیزیں بہت ضروری سمجھتا ہوں: سیکولرزم، ڈیموکریسی اور تیسری عدم تشدد؛ اگر یہ تینوں چیزیں رہیں گی تو ملک زندہ رہے گا۔

سوال: اس وقت ہندوستان بہت خراب پوزیشن میں سانس لے رہا ہے،خاص کر بابری مسجد کے شہید ہونے کے بعد؛ اب امن و سکون کی واپسی کے لیے کیا ہونا چاہیے؟

جواب: صرف تین چیزیں اگر درست یا ٹھیک ہو جائیں: ایجوکیشن،پولیس اور پریس،تو

اس ملک میں جینا بہت آسان ہو جائے۔ بے شک بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہندوستان میں طرح طرح کے دورے پڑے ہیں، اس سے گھبرائیے نہیں، بیماری کے پھیلنے سے گھبرائیے نہیں، آپ انسان ہیں، زندگی میں سب کچھ ہوگا، یہ نشیب وفراز ہیں زندگی کے، اُتار چڑھاؤ ہیں زندگی کے، اس دورے کا علاج کرنے کے لیے، بیماری ختم کرنے کے لیے کوئی ڈاکٹر نہ ہو تو فکر کی بات ہے۔ اگر لوگوں کے دلوں سے ڈر ختم ہوتا ہے تو اعتماد و بھروسہ بڑھے گا، لوگوں کے آپسی تعلقات بہتر ہوں گے، ملک میں پرسکون فضا بنے گی۔

تاریخ کا الٹا سفر کرنا ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا

سوال: تاریخ کی گردان کر کے کبھی کبھی تنازعات کھڑے کر دیے جاتے ہیں، سائنسی دور میں جب کہ دنیا کہاں سے کہاں جارہی ہے؛ تاریخ کا الٹا سفر کرانا ملک کی سالمیت کے لیے کیا خطرہ کا باعث نہیں ہوگا؟

جواب: تاریخ کا الٹا سفر کرنا ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے عزیز اور مقدس مقامات کو اپنی تحویل میں لے لیا، تو یاد رکھیے کہ پھر یہ اختلاف ان کے اندر خود چلے گا۔ ایک وقت آئے گا؛ جینی، بدھسٹ کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ ہماری عبادت گاہوں کو واپس کرو۔ ایک جگہ پڑھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں ساؤتھ میں شنکراچاریہ پیدا ہوئے تھے، انھوں نے تمام بدھ عبادت گاہوں کو ہندو مندروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں نے جا کر وہاں دیکھا ہے کہ جینیوں کے ہزاروں مندر بدل گئے، بدھوں کے سیکڑوں، ہزاروں مندر ہندوؤں کی تحویل میں چلے گئے۔ یہ بات نالندہ کی بدھسٹ یونیورسٹی کی ہے۔ میں نے تاریخ کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے، اس میں پایا ہے کہ جب اس طرح کے حالات کسی ملک میں پیدا ہوئے ہیں، تو خون کی ندیاں بہہ اٹھی ہیں، زبردست ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔

ہندوستان کے لوگوں کے لیے پیغام

سوال: آپ ہندوستان کے لوگوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب: بیمار کی بیماری دیکھ کر تڑپنے والوں کی کمی ہے۔ یہ بات ہر ملک، ہر سوسائٹی، ہر تہذیب اور ہر عہد کے لیے خطرناک ہے۔ یہ دنیا جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ان علاج کرنے

والوں کی بدولت باقی ہے، جنھوں نے اپنا آرام چھوڑا، کھانا پینا چھوڑا، گھر والوں کو بھول گئے اور انسانوں کو انسانوں سے بچانے کے لیے اور انسانوں کو انسانوں کے خنجر سے محفوظ رکھنے کے لیے گھروں سے باہر آ گئے۔ فاقے کیے، جاگ کر راتیں گزاریں، جان کو خطرے میں ڈالا اور دیوانہ وار نکل پڑے۔ آج ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ میرا پیغام ہے کہ لوگ ہمت کر کے باہر نکلیں، لوگوں کے بیچ جائیں، شاید کسی کی بات کسی کو لگ جائے۔

مختلف ملّی مسائل، انتخابات، ایرانی انقلاب، قذافی کی بے راہ روی، اور فیصل ایوارڈ قبول کرنے سے متعلق ایک چشم کشا گفتگو

یہ انٹرویو مولانا ندوی الحفیظ صاحب ندوی ازہری (عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا، ندوۃ العلماء، لکھنؤ) نے لیا، اور "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۰ء) میں شائع ہوا۔

سوال: مولانا! مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ آپ کا وقت اور آپ کے تصنیفی مشاغل کتنے قیمتی اور مفید ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ کا تھوڑا سا وقت انٹرویو کے لیے لینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ بہت سی گرہیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف انٹرویو میں کھل سکتی ہیں، اور اس کے ذریعہ بہت سی ضروری باتیں جن کی شاید برسوں میں نوبت نہ آتی، کاغذ کی سطح پر آ جاتی ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے فروری ۱۹۷۱ء میں آپ سے ایک اہم انٹرویو "ندائے ملت" کے لیے لیا تھا،(۱) جس میں ملی مسائل اور میدانی جدوجہد میں آپ کی دلچسپی کی تاریخ اور اس کے محرکات، مسلم مجلسِ مشاورت کے قیام کا پس منظر اور جن مراحل سے وہ گزری؛ اس کی مختصر معلومات افزا روداد آ گئی تھی، اور وہ انٹرویو بڑی توجہ اور دلچسپی سے پڑھا گیا تھا، اور اس سے خود آپ کی زندگی، مزاج و مذاق اور جذبات پر بڑی روشنی پڑتی تھی۔

اس طرح کے انٹرویو کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے تھا مگر میں اس کے بعد مصر چلا گیا، جہاں چار سال سے زائد میرا قیام رہا۔ اس عرصہ میں جہاں تک مجھے علم ہے، آپ کا ایک ہی اہم انٹرویو شائع ہوا، جو پیامِ انسانیت کی تحریک سے متعلق تھا، اور مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم کا مرتب کیا ہوا تھا، جو علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہو گیا ہے(۲) اور جس نے اس تحریک کی وضاحت اور غلط فہمیوں کے رفع کرنے میں اہم کردار کیا ہے، اور وہ پیامِ انسانیت کے لٹریچر میں ایک اہم اور بنیادی اضافہ ہے۔

آپ اجازت دیں، تو میں وہ سوالات پیش کر دوں جو میں نے از راہِ احتیاط نوٹ کر لیے ہیں۔ ان میں بعض سوالات سیاسی نوعیت کے ہیں، بعض دینی و علمی نوعیت کے اور بعض ذاتی لیکن ہیں سب ضروری، اور معاف فرمائیں آپ کی ذات بھی تو ایسی ہی رنگا رنگ اور مختلف الجہات ہے۔ مجھے اس موقع پر قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کا فقرہ یاد آ گیا، جو شاید کسی تبصرہ میں ان

---

(۱) - (۲) یہ دونوں انٹرویو پیشِ نظر کتاب میں شامل ہیں۔

کے قلم سے نکلا تھا کہ مجھے اس پر تعجب آتا ہے کہ ایک ہی قلم سے ''ارکانِ اربعہ'' اور ''نقوشِ اقبال'' کیسے نکلی!

جواب: بسم اللہ! جس انٹرویو کی تمہید اتنی طویل اور ''عالمانہ'' ہے، خدا خیر کرے اس کے سوالات کیسے ہوں گے...!!

عوام میں اور اکثر خواص میں بھی نہ تو سیاسی شعور ہے نہ اخلاقی ضمیر

سوال: معاف فرمائیے گا! پہلی بات یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پارلیمنٹ کے گذشتہ الیکشن میں اگر چہ آپ نے کسی پارٹی کی غیر مشروط تائید وحمایت نہیں کی تھی؛ بلکہ جیسا کہ مجھے ہندوستان آکر معلوم ہوا، آپ نے کچھ اس طرح کا بیان دیا تھا کہ امیدواروں کی محض صفات اور ان کی افادیت وخلوص کی بنا پر حمایت کی جائے، مگر اس زمانہ میں آپ کے جذبات لوگوں سے چھپے نہیں رہے تھے اور اتنی بات سب کو معلوم تھی کہ جس پارٹی اور اس کے لیڈر کی مطلق العنانی، غیر جمہوری طرز عمل اور بعض ایسے اقدامات کا تجربہ ہو چکا ہے جو انسانی اور اسلامی جذبات اور شخصی آزادی کے منافی تھے، اور لوگ اس دور میں تشدد، خانہ ویرانی بلکہ خانہ براندازی کا شکار ہو چکے ہیں، اس کی حمایت نہ کی جائے؛ لیکن ریاستی مجالس قانون ساز (اسمبلیوں) کے انتخابات میں آپ نے کوئی دلچسپی نہیں لی، اور آپ نے کسی رجحان اور خیال کا اظہار نہیں فرمایا؛ حالانکہ آپ اس پوری مدت میں سب سے اہم حلقۂ انتخاب (رائے بریلی) اور لکھنؤ ہی میں رہے؟

جواب: ہاں! آپ کا یہ مطالعہ مبنی بر حقیقت ہے، اور وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے الکشن کا نتیجہ میرے لیے بڑا ہمت شکن اور مایوس کن تھا۔ اس سے کھلے طریقہ پر اس کا اظہار ہوا کہ ہمارے عوام میں بلکہ سچ پوچھیے، تو اکثر خواص میں بھی نہ سیاسی شعور ہے نہ اخلاقی ضمیر، ان میں سے اگر ایک چیز بھی ہوتی تو مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کسی ملک وقوم کو سیاسی شعور تھامتا ہے، کسی کو اخلاقی حس اور بیدار ضمیر؛ مگر جہاں دونوں کا فقدان ہو اس کا (اردو محاورہ کے مطابق اگر چہ یہاں بے محل ہے) خدا ہی حافظ ہے، شاید آپ کی نظر سے میرا مضمون نہیں گزرا، جو میں نے انتخابات کے شروع ہونے سے چند دن پہلے ملک کی موجودہ تشویشناک صورت حال پر لکھا تھا، جس میں میں نے الیکشن کے موجودہ نظام کی بنیادی خامیاں بیان کی تھیں اور سہ روزہ ''دعوت'' میں شائع ہوا تھا، میں اب بھی اسی خیال پر قائم ہوں۔ بہر حال پارلیمنٹ کے الیکشن کے نتائج نے (جو اکثر لوگوں کے لیے

خلاف توقع تھے) مجھے، اگر مایوس نہ کہوں، دل شکستہ ضرور کیا، اور پوری صورت حال، عوام کی بے حسی و بے ضمیری، ملک کی تیزی سے گرتی ہوئی اخلاقی طاقت، دولت وقوت کی اندھی پرستش (جس کو میں اپنی تقریروں میں ''چڑھتے سورج کی پوجا'' کے الفاظ سے ادا کرتا رہا ہوں)، اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت نے غور کرنے پر مجبور کر دیا، اور اس سے میری نظر میں ''پیامِ انسانیت'' کی تحریک اور جدوجہد کی ضرورت واہمیت اور واضح ہوگئی۔

مسلمان سیاسی بے شعوری اور اخلاقی بے ضمیری کے ساتھ ساتھ دینی بے حمیتی کے بھی شکار ہیں

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ اس بارے میں کسی سے کم نہیں؛ بلکہ ان کے سلسلہ میں سیاسی بے شعوری اور اخلاقی بے ضمیری کے ساتھ ایک اور جملہ کا اضافہ کروں گا، اور وہ ہے: دینی بے حمیتی۔ اُنھوں نے اس سیاسی اور بین الاقوامی سیاق وسباق کا بھی ذرا لحاظ نہیں کیا جس کا خود عالم اسلام سے گہرا تعلق ہے، اور جس میں یہ الیکشن ہو رہا تھا، اور جس کا نتیجہ اب وہ اپنے ملک کی افغانستان کے بارے میں کمزور پالیسی کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

سوال: آپ نے افغانستان کا نام لے کر ایک سوال کا اضافہ کر دیا، جو میری فہرست میں نہ تھا۔ افغانستان کے بارے میں آپ کے جذبات کا اندازہ تو اسی سے ہوتا ہے کہ آپ نے فیصل ایوارڈ کی نصف رقم افغانی پناہ گزینوں اور مصیبت زدوں کے لیے مخصوص کر دی، پھر ۱۸ رمئی کو گنگا پرشاد میموریل ہال (لکھنؤ) کے جلسہ میں میں نے تقریر سنی تھی، لیکن اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ تازہ واقعات کی روشنی میں آپ کہاں تک پر امید ہیں؟

جواب: حقیقت میں افغانی مجاہدین نے پچھلی نصف صدی کی تاریخ میں، جس میں نصف درجن یا اس سے زائد مشرقی و اسلامی ملک بلاواسطہ یا بالواسطہ کمیونزم کے توسیع پسندؔ اور جارحانہ مقاصد کی زد میں آئے؛ مقابلہ، شجاعت اور خودداری کی ایک بالکل نئی مثال قائم کی ہے، جس کا افسوس ہے عرب ممالک بھی کوئی ثبوت نہیں دے سکے۔ افغانی قوم نے اپنے اجتماعی فیصلہ اور اپنی قومی خودداری کا ایسا روشن ثبوت پیش کیا ہے جس کی قدر ہر صاحب ضمیر اور خوددار انسان کو کرنی چاہیے، اور جس کی موجودگی میں کوئی ملک اور قوم ہمیشہ ہی کے لیے نہیں؛ بلکہ طویل مدت کے لیے بھی غلام نہیں رہ سکتی۔

ہماری تمنا ہے کہ روس (جس کو مظلوم و کمزور قوموں اور ملکوں کی ہمدردی کا دعویٰ ہے) حقیقت پسندی اور سیاسی دانشمندی سے کام لے اور اس ''کوہ کندن و کاہ برآوردن'' کے سلسلے کو زیادہ دن قائم نہ رکھے، خدا کرے اس سلسلہ میں ان ملکوں کی مساعی (جن میں خود ہمارا ملک بھی شامل ہونے کا اعلان کرتا ہے) بارآور اور نتیجہ خیز ثابت ہوں، جو روسی فوج کے واپس جانے کے لیے کر رہے ہیں۔

سوال: میری یادداشت میں ایک سوال ایران کے بارے میں ہے، اور افغانستان کے بعد اور بھی اس کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ نے ایران کی موجودہ صورت حال پر ابھی تک کوئی اظہار خیال نہیں فرمایا، آپ کہاں تک وہاں کے حالات سے مطمئن ہیں، کہاں تک غیر مطمئن؟

جواب: یہ سوال ذرا نازک، پیچیدہ اور عربی کی تعبیر کے مطابق "مُحرِّج" یعنی نزاکت اور پیچیدگی میں مبتلا کرنے والا ہے۔ زیادہ تفصیل سے تو اس وقت کہنے کا موقع نہیں اور میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ کوئی بات پورے وثوق اور ذمہ داری سے کہہ سکوں۔ مجھے ایران کے جشن انقلاب کے موقع پر حکومت ایران کی طرف سے دعوت موصول ہوئی تھی لیکن میں اس وقت اپنے کو اس سفر پر آمادہ نہ کر سکا تھا اور ایرانی سفارت خانہ کے شدید اصرار پر میں نے مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی (استاذ دارالعلوم، ندوۃ العلماء) کو اپنی جگہ پر بھیج دیا تھا اور ان سے وہاں کے تازہ حالات معلوم ہوئے تھے؛ لیکن ؎

''شنیدہ کے بود مانند دیدہ''

میں خود جاتا تو اس کی بات الگ تھی۔

کسی ایسے ملک کے بارے میں جو نئے مشکلات و مسائل سے دوچار ہو، اور خون کے دریا سے نہا کر نکلا ہو، کوئی بات کہنا بڑی ذمہ داری کی چیز ہے، اور اس کا غلط فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں اس موقع پر کسی قدر احتیاط و اختصار سے کام لے لوں گا، اور صرف اتنا کہوں گا کہ اسلام کے نام پر جو انقلاب کیا گیا ہے، اس کی ذمہ داریاں بہت عظیم ہیں۔ قیادت و حکومت کا ہر فعل اسلام کے حساب میں محسوب ہوگا، اور اس سے دنیا یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اسلام کے ذریعے جب انقلاب آتا ہے اور اس کی بنیاد پر جب کوئی حکومت قائم ہوتی ہے، تو وہ ایسا کرتی ہے اور وہ اسلام کا قانون ہے۔ اس لیے ایران کے قائدین کو (جن میں خوش قسمتی سے علمائے دین پیش پیش

ہیں)اس کا ہر وقت لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس سے اسلام، اس کے اخلاقی تصورات وتعلیمات اور اس کے مزاج وافتاد کے بارے میں کوئی غلط تصور یا تأثر نہ قائم ہو، اور وہ بجائے نیک نام اور ہمت افزا ہونے کے بدنام اور ہمت شکن نہ ہو، پھر یہ کہ اس کی کسی غلطی ، بے جا ضد یا ناعاقبت اندیشی سے ہمسایہ اسلامی ممالک (جن میں خود جزیرۃ العرب، مرکز اسلام اور خلیج کی عرب ریاستیں ہیں) کسی شدید خطرہ سے دوچار اور کسی مصیبت کا شکار نہ ہوں، جس سے یہ انقلاب ﴿وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا﴾ [البقرة: ۲۱۹] کا مصداق بن جائے۔

معمر القذافی کی بے راہ روی

سوال: ایک دلچسپ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر دور میں عالمِ اسلام کی ایک نہ ایک شخصیت، جو کسی خلافِ اسلام تحریک یا خیال کی علم بردار، لادینیت، الحاد یا غالی قوم پرستی کا نشان بن گئی تھی، یا اس کے افکار میں کوئی نمایاں زیغ وضلال (کجی اور گمراہی) پائی جاتی تھی، آپ کی مخالفت وتردید کا نشانہ بنی رہی، اور آپ نے اس سے شدید بُعد اور انقباض کا اظہار کیا ہے۔ میرے ہوش سے پہلے (جیسا کہ میں نے سنا ہے اور آپ کے مضامین میں دیکھا ہے) آپ کو کمال اتاترک سے شدید اختلاف رہا ہے اور آپ اس کو اپنے عصر کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب آپ ترکی کی سیاحت سے واپس آئے، اور آپ نے اپنے خیالات ومشاہدات کا اظہار کیا، اور کمال کے بارے میں ترکی کے اسلام پسند اور غیور مسلمانوں کی رائے ظاہر کی، تو کمال کے حامیوں کو جو صحیح حالات سے بے خبر تھے، اور جن کی معلومات تحریک خلافت کے زمانہ تک محدود تھیں، سخت ناگواری ہوئی؛ لیکن آپ نے اس کی پرواہ نہیں کی، پھر مصر میں قومیت عربیہ اور اشتراکیت علمیہ کا دور آیا اور جمال عبدالناصر عربی قیادت کے اسٹیج پر نمودار ہوئے، اور سارے عرب پر ان کا جادو چل گیا، اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا (اور یہ میرے شعور کا زمانہ ہے) کہ ساری دنیا ایک طرف ہے اور آپ ایک طرف ہیں؛ آپ نے (مصر کو چھوڑ کر) متعدد عرب ممالک کے اجتماعات میں اس کے خلاف ایسی سخت تقریریں کیں جن کو آج ''عالم عربی کا المیہ'' میں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ندوۃ العلماء کی عربی صحافت نے اس کے خلاف ایسا محاذ قائم کیا جس سے جمال کے حامی چیخ اٹھے، بالآخر آپ کی فراست صحیح نکلی اور بقول اقبال ؎

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے

مسلمانوں اور عربوں کو بیت المقدس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، اور "الضفة الغربية" سے بھی، اب میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کے اس ''بغض فی اللہ'' کا نشانہ کون ہے؟

جواب: آپ نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا ہے، اور داغ کہن تازہ کر دیے۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ بُعد اور انقباض لیبیا کے صدر ''معمر القذافی'' سے ہے، مجھے شروع سے ان سے عدم مناسبت تھی۔ دو مرتبہ اُنھوں نے مجھے خصوصی دعوت دی اور میں نے معذرت کی۔ آخری بار رابطہ عالم اسلامی کے اس وفد میں مجھے جانا تھا جو ''سنت'' کے موضوع پر ان سے گفتگو کرنے والا تھا، لیکن میں نے عین وقت پر معذرت کر دی۔ بعد میں وہ لوگ ملے جو اس وفد میں گئے تھے، انھوں نے کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ نہیں گئے، قذافی صاحب کا ردّ عمل اور گفتگو نہایت نامناسب اور تکلیف دہ تھی، اب خود آپ نے ''تعمیر حیات'' کے ۱۰؍جون ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں ان کے سرکاری ترجمان "اَلزَّحْفُ الْأَخْضَرُ" کا جو اقتباس نقل کیا ہے، اور جس میں صاف صاف خدا کی شان میں گستاخی اور بدتمیزی کی گئی ہے، اس نے تو حد کر دی۔ مجھے بعض ذمہ دار حضرات سے جو وہاں یونیورسٹی میں پروفیسر رہے ہیں، اور جو قریب سے ان کو جانتے ہیں، ان کے ایسے خیالات و حالات کا علم ہے، جن سے ان کے دماغی توازن اور سلامتیٔ ہوش و حواس کے بارے میں شبہ ہوتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ سنوسی مجاہدین کے خون سے لالہ زار خالص اسلامی سرزمین امتحان و ابتلاء کے اس دور سے گزر رہی ہے۔

کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح'' کی تالیف

سوال: ڈرتے ڈرتے ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے لیکن:

کرمہائے تو مارا کرد گستاخ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کی کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح'' آپ کے مزاج اور آپ کے دوسرے تصنیفی و تحریری کاموں سے میل نہیں رکھتی، اس کی تصنیف میں کوئی قابل احترام اشارہ شامل ہے۔ اس لیے کہ آپ کے تعلقات شروع سے جماعت والوں سے دوستانہ و برادرانہ رہے ہیں، اور ملی مسائل میں آپ نے ان کے دوش بدوش کام کیا ہے، اور اب بھی آپ ان سے کھلے دل سے ملتے ہیں۔ بعض جلسوں کی اخباری رپورٹوں سے تو ان کے بارے میں آپ کے نرم گوشہ (Soft Corner) کا پتہ چلتا ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جـــــــواب: سوال تو آپ نے بڑا نازک کیا ہے، لیکن شاید اس تقریب سے بعض غلط فہمیوں کے رفع ہونے اور بعض ضروری پہلوؤں کے واضح ہونے کا موقع ملے، آپ مجھ سے کسی قدر واقف ہیں، اور لکھنے پڑھنے کے کاموں میں آپ نے میری مدد کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کسی موضوع پر اسی وقت قلم اٹھاتا ہوں جب اس کی ضرورت وافادیت کا مجھے پورے طور پر احساس ہو، اور وہ مجھ پر طاری ہو جائے، فرمائشی کام مجھ سے نہیں ہوتے۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ جماعت کے بنیادی خیالات اور رمولانا مودودی مرحوم کے افکار ومضامین پر دینی حلقوں کی طرف سے تنقید کا سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے، اور تنقید کرنے والوں میں متعدد ایسی شخصیتیں شامل ہیں جن کا میں شروع سے احترام کرتا ہوں، اور جن کے خلوص وللّٰہیت کا دل سے قائل ہوں، میرے ان سے نیاز مندانہ تعلقات بہت قدیم ہیں؛ لیکن میں نے اتنی تاخیر سے اس موضوع پر قلم کیوں اٹھایا، اور میرا طرز، میری گرفت اور میرا Approach ان تنقیدات اور ناقدین سے بنیادی طور پر کیوں اتنا مختلف ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ عرصہ سے خالص علمی، دینی اور تعمیری انداز فکر میں جماعت [اسلامی] کے محور فکر اور اس کی اساس پر اپنے خیالات اور مطالعہ وتجربات کا نچوڑ پیش کرنا، اور مخلصانہ ودوستانہ طریقہ پر اپنے اندیشوں اور خطرات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ شروع سے میرا مرکز توجہ مولانا کی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' تھی، میرا پختہ خیال تھا اور ہے کہ اس سے دین کا فہم وادراک اور سعی وجہد، دین کی اس حقیقی پٹری اور شاہراہ سے۔۔جس پر انبیاء علیہم السلام اپنے متبعین کو ڈالنا چاہتے ہیں، اور جس سے عبد ومعبود کا مطلوب اور دنیا وآخرت میں مفید او رضروری تعلق قائم ہوتا ہے، اور پوری زندگی میں محبت الٰہی اور ایمان واحتساب (کسی عمل کو خدا کے وعدوں پر یقین اور اس کے اجر وثواب کی لالچ میں کرنا)، جذبۂ عبادت اور فکر آخرت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ہٹ کر سیاست وتنظیم، حصول اقتدار اور مختصراً مادیت کی پٹری اور شاہراہ پر پڑ جاتی ہے؛ نیز اس سے قرآن مبین کی قدرت تفہیم اور امت داعی کی صلاحیت فہم (جو مسلسل کئی صدی تک ان بنیادی قرآنی اصطلاحات کے فہم سے قاصر اور ان کے بارے میں تاریکی میں رہی) دونوں مشکوک ہو جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ نتیجہ جو کتاب کے مطالعہ سے نکلتا ہے، بڑا سنگین اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔

میں بہت دنوں سے اس موضوع پر لکھنا چاہتا تھا اور مجھے امید تھی کہ یہ ایک ایسی جماعت کی .

عظیم خدمت ہوگی جس میں بڑی تعداد میں طالب حق، فہیم، مخلص اور ایثار پیشہ صاحب صلاحیت تعلیم یافتہ نوجوان شامل ہیں؛ لیکن میں اس پر قلم اٹھانے سے پہلے مولانا کی دوسری کتابوں اور رسائل ومضامین کا ازسرنو مطالعہ کر لینا چاہتا تھا؛ لیکن ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۷ء تک (جب تک میری آنکھ کا آپریشن نہیں ہوا) میں براہ راست لکھنے پڑھنے سے تقریباً معذور تھا۔ دوسرے سے پڑھوا کر سننے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے، اور پھر بھی کمی رہ جاتی ہے۔

جب مجھ میں مطالعہ اور نوٹ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، تو میں نے جہاں تک ممکن ہوا مولانا کا لٹریچر جمع کر کے اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے بعد میں نے مسلسل کئی روز استخارہ کیا، اور پہلی مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کام کے شروع کرنے کے واضح اشارات ملے، میں نے رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ/ اگست ۱۹۷۸ء میں بنام خدا اس کام کو شروع کر دیا۔ لکھنے کے بعد میں نے بار بار نظر ڈالی، اگر کوئی جملہ ایسا قلم سے نکلا تھا جو چبھتا ہوا اور طنزیہ تھا، تو اگرچہ اس سے زور پیدا ہوتا تھا، اس کو اس خیال سے نکال دیا کہ وہ مقصد میں جارح ہوگا۔ خدا شاہد ہے کہ اپنے نزدیک کوئی بددیانتی اور جان بوجھ کر قطع و برید سے کام نہیں لیا، اور میں اب بھی پوری کتاب کے مضامین ومنقولات واقتباسات اور ان سے استخراج کیے ہوئے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، اور اپنے اس کام پر کسی قسم کی شرمندگی یا غلطی محسوس نہیں کرتا؛ بلکہ اس کو جماعت کی خدمت، بلکہ دین کی خدمت سمجھتا ہوں۔ میں اس کو ایک ایسی اصولی اور فکر انگیز کتاب سمجھتا ہوں جس کا مطالعہ جماعت سے باہر کے لوگوں کے لیے بھی مفید اور چشم کشا ہے۔[1] اسی بنا پر میں نے عربی میں بھی اس کو منتقل کرایا۔[2] اس میں مفید اضافے کیے، پھر اردو کا دوسرا ایڈیشن اس عربی ترجمہ کی روشنی میں اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ اور اب بھی جماعت کے مخلص دوستوں کو (جن میں بحمد اللہ بڑی تعداد میں طالب حق اور طالب خدا افراد ہیں) مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ دین وآخرت کا معاملہ بڑا نازک اور اہم ہے، اور رسولِ خدا کے سوا کوئی معصوم عن الخطا نہیں، اور خود مولانا نے بھی اپنے مکتوب میں صاف طریقہ پر لکھا ہے کہ ''میں اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا''۔

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کتاب پر جماعت کا عمومی ردعمل میری توقع اور

---

(۱) کسی عربی عبارت کے ترجمہ میں (جیسا کہ بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ) کوئی ''تسامح'' نہیں ہوا۔ (ندر)

(۲) عربی ترجمہ التفسير السياسي للإسلام في مرآة كتابات الأستاذ أبي الأعلى المودودي والشهيد سيد قطب کے عنوان سے شائع ہوا۔

جماعت کے دستور کی ہدایات اوراس کی روح سے بہت مختلف تھا، اوراس کومحض ایک مخالفانہ و حریفانہ کوشش پرمحمول کیا گیا، اوراس سے بہت سے مصلحین وقائدین کی ان کوششوں کی ناکامی کی وجہ معلوم ہوئی جووہ جماعتی عصبیت اور شخصیت پرستی کے خلاف وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں، اور اندازہ ہوا کہ غلو ومبالغہ اور افراط وتفریط میں فطرت انسانی کے لیے کتنی کشش اور جاذبیت ہے،(إِلَّا مَنْ عَصَمَ رَبُّكَ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ) ۔ باقی میرا یہ مزاج ہے کہ میں ہمیشہ حمایت ومخالفت، تعریف وتنقید، دونوں میں اعتدال وتوازن اور انصاف ملحوظ رکھنے اور حتی الامکان ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾[المائدة:۸] پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لیے اکثر ان دونوں فریقوں کو راضی نہیں رکھ سکتا جو ہر چیز میں غلو ومبالغہ پسند کرتے ہیں۔

جہاں تک میری تقریروں کی اخباری رپورٹوں کا تعلق ہے، تو میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میری ہر تقریر کی رپورٹ کا صحیح اور مستند ہونا ضروری نہیں۔ اس میں دانستہ بددیانتی بھی ضروری نہیں، سیاق وسباق کے پورے طور پر نقل نہ کرنے اور جس تناسب سے باتیں کہی گئی ہیں، ان کو قائم نہ رکھنے سے بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے، رانچی کی ایک تقریر کی رپورٹ میں یہی بات نظر آتی ہے۔ میں صرف ان خیالات کی ذمہ داری لے سکتا ہوں جو میرے کسی تحریری مضمون یا بیان میں آئے ہوں۔

فیصل ایوارڈ قبول کرنے کے اسباب

سوال: ایک سوال بالکل ذاتی نوعیت کا ہے؛ لیکن جس شخصیت کے ساتھ دعوت وپیغام مربوط ہو جائیں اور وہ دوسروں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار اور قربانی وایثار کی تعلیم دیتی ہو، اور بعض اوقات دوسروں کا احتساب بھی کرتی ہو، اس کے ہر عمل اور اقدام کے بارے میں اس کے ناقدین اور نیازمندوں دونوں کو اپنے طرز پر پوچھنے کا حق ہے۔

جواب: آپ کے سوال کی تمہید سے تو میں ڈر گیا، لیکن آپ نے اس کے ایسے قوی وجوہ ودلائل بیان کر دیے ہیں کہ میں اب اس سے گریز نہیں کر سکتا، اس لیے بے تکلف اپنا سوال سامنے لائیے۔

سوال: آپ کا فیصل ایوارڈ کا بے تکلف قبول کر لینا، پھر اس کی مبارکبادی کے لیے جو

جلسے ہوئے ہیں، ان میں آپ کا شریک ہو جانا، بہت سے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا جو آپ کے مزاج و مذاق اور خاندانی روایات سے واقف ہیں، اور جن کے یہ بھی علم میں ہے کہ آپ نے دو بار حکومتِ ہند کے عربی کے اعزاز (ایوارڈ) کے قبول کرنے سے معذرت کی۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی کڑی ہمارے علم میں نہیں ہے جس کی بنا پر آپ نے اس ایوارڈ کے بارے میں ادنیٰ تامل و معذرت سے کام نہیں لیا اور آپ اس کا اظہار فرما سکتے ہیں، تو ہم اس کے سننے کے مشتاق ہیں۔

جواب: جی ہاں! آپ کا یہ سوال حق بجانب ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب یہ سوال آپ کی زبان پر آ ہی گیا ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرز پر سوچنے والے اور بھی احباب ہوں گے، تو اب اس کا بقدر ضرورت جواب دینا میرے لیے ضروری ہو گیا ہے اور شاید میرے لیے مفید بھی ہو۔

صورت حال یہ ہے کہ اگر اس ایوارڈ کے بارے میں عام حالات میں مجھ سے دریافت کیا جاتا اور میری منظوری و نامنظوری لی جاتی، تو اغلب یہ ہے کہ میں معذرت کر دیتا، اور اپنے سے بہتر کسی کا نام تجویز کرتا؛ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کا اس وقت علم ہوا جب اس کا عالمی پیمانہ پر اعلان ہو گیا اور میرے لیے مختلف بیرونی ممالک سے مبارکباد کے تار آئے، اس وقت اس کا مسترد کر دینا ایوارڈ دینے والے ادارے اور حکومت سعودیہ کے لیے ایک توہین آمیز عمل ہوتا، اور میرے لیے آئندہ اس ملک میں دعوتی کام کرنے اور ذمہ داران حکومت کو مشورہ دینے کا موقع نہ رہتا، جس کو میں اپنے تمام دعوتی کاموں اور مشغولیتوں پر ترجیح دیتا ہوں، اور اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ اعلان حرم شریف کے نامبارک واقعہ کے پیش آنے کے بعد (دو مہینے کے اندر اندر) ہوا۔ اس واقعہ سے حکومت سعودیہ کی (جو خادم الحرمین الشریفین اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کا نشان ہے) اخلاقی پوزیشن متاثر ہوتی تھی، اور بہت سے لوگوں کی طرف سے (جن کے احساسات اس بارے میں تیز تھے) نشانۂ ملامت و تنقید بنی ہوئی تھی۔ خود میں بھی وقتاً فوقتاً اس کے اعلیٰ ذمہ داروں کو بعض انتظامی و اخلاقی، تربیتی و تعلیمی خامیوں اور اصلاح و ترقی کے بعض پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتا رہا ہوں، اور اس سلسلے کے مکاتیب و مضامین کا مجموعہ عربی میں "كَيْفَ يَنظُرُ الْمُسْلِمُوْنَ إِلَى الْحِجَازِ وَجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ" اور اردو میں "حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب: امیدوں اور اندیشوں کے درمیان" اس واقعہ سے کچھ پیشتر شائع ہوا

تھا۔ اس صورت میں میرا انکار کرنا اور اس کو واپس کرنا، اس پر بے اعتمادی کے عمومی اعلان کے مرادف ہوتا، اور اس کو نئے نئے معنی پہنائے جاتے، اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، میرے لیے وہاں کسی دعوتی و مشاورتی کام کے امکانات ختم ہو جاتے اور میں وہاں کی زندگی اور اداروں سے (جن کا میں سالہا سال سے رکن چلا آ رہا ہوں) بالکل کٹ جاتا، اور تھوڑی بہت خدمت کا امکان بھی جاتا رہتا۔

اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک اس ایوارڈ کے معنوی و اخلاقی پہلو کا تعلق ہے، اس کو شکریہ کے ساتھ قبول کروں، اور جہاں تک اس کے مالی و مادی پہلو کا تعلق ہے، اس سے کوئی ذاتی یا جماعتی سروکار نہ رکھوں، چنانچہ اسی مضمون کا ایک خط لکھا، جس کو میرے نمائندے ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی نے اس تقریب میں پڑھ کر سنایا اور الحمدللہ اس نے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا اور بات خوبی کے ساتھ نبھ گئی۔ (۱)

جہاں تک تہنیت و مبارکباد کے جلسوں میں شرکت اور ان سے خوشی و فخر حاصل کرنے کا تعلق ہے، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ میں ضرور دو تین جلسوں میں شریک ہوا ہوں، لیکن شرمندگی کے احساس کے ساتھ، اور جیسا کہ دارالمصنفین کے جلسہ اور محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ناظم دارالمصنفین) کے خطاب کے جواب میں مَیں نے کہا تھا کہ ''ایاز قدر خود را شناس'' کی

---

(۱) تقسیم انعام کے جلسہ میں حضرت مولاناؒ اپنی غیر معمولی مصروفیات اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کی وجہ سے تشریف نہ لے جا سکے تھے، البتہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کو مکلّف فرمایا کہ وہ ان کی قائم مقامی کریں۔ ذیل میں حضرت مولاناؒ کے اس خط کا ترجمہ دیا جاتا ہے، جو مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے نیابۃً ایوارڈ لیتے وقت پڑھ کر سنایا، یہ ترجمہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر مارچ ۱۹۸۰ء) سے ماخوذ ہے:

"الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على رسول الله سيّدنا محمد و آله و أصحابه أجمعين.

معزز صدر جلسہ اور حاضرین بزم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ہم آپ کے اور عالمی فیصل ایوارڈ کی اس سلکشن کمیٹی کے شکر گزار ہیں جس کے منتخب انعام یافتہ حضرات میں ہمارا بھی نام شامل ہے۔

آپ حضرات کا یہ انعام اگر کسی بات کی شہادت دیتا ہے تو وہ مکمل اور بھرپور اعتماد ہے جو اسلام کے اس خادم کے ساتھ کیا گیا ہے، جو حسب توفیق الٰہی اپنی مقدرت بھر دین کی خدمت میں مشغول ہے۔ مختلف میدانوں میں اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرنے والوں کی ہمت افزائی و سرپرستی کے لیے جس طرح یہ حکومت اور فیصل ایوارڈ کمیٹی کام انجام دے رہی ہے، اس سے ہم سب خوب واقف ہیں، نیز اس ایوارڈ کی معنوی قدر و قیمت اور اس بلند و پاکیزہ جذبات سے بے خبر نہیں جو اس کی تہہ میں کارفرما ہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیفیت کے ساتھ؛ بلکہ میں نے دارالمصنفین کے سپاس نامہ کے جواب میں ''ایاز کی حقیقت'' پر بھی روشنی ڈالی تھی، اور اپنی علمی بے بضاعتی اور اپنی پرانی حالت کا نقشہ کھینچا تھا، جب میں ۳۴-۱۹۳۳ء میں اپنے استاذ محترم علامہ تقی الدین الہلالی کے خادم ورفیق کے طور پر شبلی منزل آیا تھا اور میں نے علامہ موصوف کے ذریعہ اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ مجھے جونیر رفیق یا زیرِ تربیت لکھنے والے کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے؛ لیکن اس وقت میں اس کا بھی اہل نہیں سمجھا گیا تھا۔ میں نے وہاں یہ بھی کہا تھا کہ اس ایوارڈ سے میرا بڑا نقصان ہوگیا، وہ یہ کہ مرزا غالب کا جب یہ شعر پڑھتا تھا تو مجھے بڑا لطف آتا تھا، اب وہ لطف جاتا رہا اور وہ شعر حسب حال نہیں رہا ـ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) دین کی خدمت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا ہے کہ محض اللہ کی رضا کے حصول کی نیت سے یہ کام بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے تصور کے انجام دیا جائے۔ سلف صالحین اور اللہ کے مخلص بندوں کا طرزِ عمل ہمیشہ اس معاملہ میں یہی رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں دین کی کسی خدمت کا ادنیٰ معاوضہ حاصل کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتے تھے؛ بلکہ اس سے چوکنا رہا کرتے کہ خدانخواستہ ان کے دینی کاموں میں دنیاوی نفع کا شائبہ بھی آسکے، لیکن آج کے دور میں اسلام خود عالم اسلام میں اجنبی بن کر رہ گیا ہے اور جس اسلام نے پوری انسانیت پر احسانات کی بارش کی تھی، اب اسی کے ساتھ احسان فراموشی اور بے مہری سے کام لیا جارہا ہے اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں، اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام کے خلاف سرگرم مخالف طاقتوں کی سرپرستی کی جارہی ہے اور الحاد و بے دینی کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ ان اسباب و محرکات کی بنا پر اسلام کا درد رکھنے والوں نے دینی کاموں میں سرگرمی پیدا کرنے اور علمی و ادبی محاذوں پر کام کرنے والوں کی سرپرستی و ہمت افزائی کے لیے جو چند اقدامات کیے ہیں، ان میں عالمی فیصل ایوارڈ کمیٹی کا قیام سرفہرست ہے، جس نے اس دین حنیف کی خدمت کرنے والوں کے لیے بطور ہمت افزائی ایک مخصوص سالانہ انعام دیے جانے کا فیصلہ کیا؛ یہی احساسات مجھ پر اس وقت غالب تھے جب میں نے اس انعام کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا جو میری ادنیٰ خواہش وطلب کے بغیر بالکل خلاف توقع تھا۔ اس ایوارڈ کا انتساب جس شہید ملک فیصل کے نام نامی سے ہے اور اس کی تہہ میں جو پاکیزہ جذبات کارفرما ہیں، ان سب کا تقاضا تھا کہ میں شکر و سپاس کے جذبات کے ساتھ اس قدر افزائی کو قبول کرلوں، اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ یہ انعام جس نیک نیتی پر مبنی ہے اس کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔

چند ناگزیر اسباب اور پہلے سے طے شدہ ضروری پروگرام کی وجہ سے خود اس انعام کو قبول کرنے اور ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنے سے قاصر رہا، میری طرف سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (ریڈر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی) اس مبارک موقع پر آپ کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں۔ اس انعام کی جو غیر معمولی معنوی قدر و قیمت ہے وہ اس کی مالی حیثیت کے مقابلہ میں بہت بلند ہے۔

جہاں تک اس ایوارڈ کی مادی قدر و قیمت کا تعلق ہے، میں آپ کی اجازت سے اس کو دین وملت کے ان کاموں پر صرف کرنا پسند کروں گا جن کا اعلان ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اس موقع سے ایوارڈ لیتے وقت کریں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''

اس پیغام کو سنانے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی نے کہا:

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

میں نے کہا تھا کہ اشعار کے بجائے میں افکار کہہ دیا کرتا تھا، اور ''نہ سہی'' کے وقت ایک خاص زور اور خود اعتمادی پائی جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ اب اس لذت سے محروم ہو گیا۔ بمبئی کے جلسۂ مشاورت میں بھی میں نے یہ بات دہرائی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس واقعہ کو اتنی اہمیت دی جائے گی اور بہت سے حلقوں اور لوگوں کی نگاہ میں اس اعلان کے ہوتے ہی میری ''اہمیت'' بڑھ جائے گی۔ اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عام لوگوں کی نگاہوں میں اس طرح کے اعزازات کتنی بڑی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

بہرحال جو کچھ ہوا اس میں کسی ارادہ وسعی کو دخل نہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ نفس کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے، جس سے حفاظت فضل الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ﴾۔ [یوسف:۵۳]

سوال: میں نے آپ کا بہت وقت لیا، اب صرف ایک سوال باقی ہے، اس پر اس مکالمہ کو ختم کردوں گا کہ پندرہویں صدی اب دروازہ پر آگئی ہے، کیا آپ نے اپنے قارئین اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے کوئی نیا علمی تحفہ، جس میں اس صدی میں کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی ہو، تیار کیا ہے؟

جواب: جی ہاں! عنقریب میری کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا چوتھا حصہ[1]، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تذکرہ پر مشتمل ہے، پریس سے باہر آنے والا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ)

''ولی عہد معظم! اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ مولانا ندوی کی طرف سے اس انعامی رقم کے مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کا اعلان کروں:

روسی جارحیت کی وجہ سے ہمارے بے شمار افغانی بھائیوں کو گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ سعودی حکومت نے ان بے گھر پناہ گزینوں کی امداد واعانت کے لیے بڑی فیاضی سے امداد دی ہے، اس لیے مولانا ندوی نے انعامی رقم کا نصف حصہ پناہ گزینوں کے فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

بقیہ نصف رقم میں سے ایک ربع مکہ مکرمہ میں حفظ قرآن کے مدارس کے لیے اور باقی چوتھائی رقم مکہ مکرمہ ہی کے مدرسہ صولتیہ کے لیے تاکہ یہ دونوں ادارے دینی تعلیم کے کاموں کو سرگرمی سے انجام دیتے رہیں۔''

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت (جلد چہارم) کا پہلا ایڈیشن ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

پندرہویں صدی کے لیے میری طرف سے یہ بہترین تحفہ ہوگا، اس لیے کہ اس سے معلوم ہوگا کہ ایک مردِ خدا نے ہزارۂ دوم کے شروع ہونے پر کیا انقلابی وتجدیدی کام انجام دیا، اور وہ کن اصولوں اور طریق کار پر مبنی تھا کہ اس کی نظیر پچھلی اور اگلی صدیوں تک دور دور نہیں ملتی، بقول شاعر ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

☆☆☆☆☆☆☆

مولانا! ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں کہ آپ نے اس انٹرویو کے لیے اپنا قیمتی وقت عطا فرمایا، اور مختلف ملی، ملکی اور اسلامی دنیا کے مسائل اور دوسرے نازک اور حساس موضوعات پر آپ نے کھل کر گفتگو کی اور ہمارے تمام سوالوں کے تشفی بخش جواب دینے کی زحمت فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ بغیر اس کے انٹرویو کا مقصد پورا نہ ہوتا اور بہت سے حقائق سے پردہ نہ اٹھتا، شاید اس کی نوبت ہی نہ آتی اگر انٹرویو نہ لیا جاتا۔

ندوۃ العلماء کا طریقِ کار، عالمِ اسلام کی چند قائدانہ کردار کی حامل شخصیات کی وفات اور ہندوستان کا ایٹمی تجربہ

۱۹۷۴ء میں حضرت مولاناؒ جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی "اَلْمَجْلِسُ الْاِسْتِشَارِيُّ الْاَعْلٰی" کی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے بعد ماہ جون میں وطن واپس تشریف لائے، اس کے بعد ہی حضرت مولاناؒ سے یہ انٹرویو ماہ جولائی کے آخر میں مولانا اسحاق جلیس ندویؒ (سابق رئیس التحریر "تعمیر حیات"، لکھنؤ) نے لیا، جو "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/جولائی-۱۰/اگست ۱۹۷۴ء) میں شائع ہوا۔

عرصہ سے خیال تھا کہ عالم اسلام کے قریبی آشنا، مسائل حاضرہ سے گہرے واقف اور اپنی دینی فکر میں معروف شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی سے انٹرویو لے کر بعض مسائل کے سلسلہ میں ان کے خیالات وافکار قارئین "تعمیر حیات" تک پہنچائے جائیں۔

مولانا موصوف ماہ جون میں سفر حجاز سے واپس تشریف لائے مگر مولانا کی علالت اور مصروفیت کی وجہ سے ماہ جولائی کے آخر میں یہ انٹرویو لیا جاسکا، جس میں پانچ متنوع قسم کے سوالات کیے گئے، اور ان کے جوابات بغیر کسی عبارت آرائی، رنگ آمیزی اور حذف واضافہ کے نذر قارئین ہیں۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اجلاس شوریٰ میں شرکت

سوال: جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی سب سے بااختیار کمیٹی "اَلْمَجْلِسُ الْاِسْتِشَارِيُّ الْاَعْلٰی" میں شرکت کے بعد واپسی پر جناب والا کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے یہ انٹرویو خاصی تاخیر سے لیا جارہا ہے۔ اس سفر پر روانگی کے پیشتر بعض قانونی دشواریوں کی وجہ سے آپ کو بمبئی میں رکنا پڑا، اور مدینہ منورہ پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی، تو کیا آپ کا یہ سفر باوجود تاخیر کے اپنے مقاصد اور نتائج کے اعتبار سے سودمند رہا؟

جواب: جی ہاں! میرا مدینہ منورہ پہنچنا چند روز کی تاخیر سے ہوا۔ وہاں کی سب سے بااختیار کمیٹی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوگیا تھا اور مجھے اس میں بہت شبہ تھا کہ میرا پہنچنا کچھ مفید ہوگا؛ بلکہ اس کا بھی خطرہ تھا کہ میں وہاں پہنچوں اور معلوم ہو کہ کمیٹی نے اپنا ضروری کام ختم کرلیا ہے، اور صرف ایک یا دو دن باقی ہے؛ کیونکہ عام طور پر ایسی تعلیمی کمیٹیاں زیادہ دن نہیں چلتیں۔ اس کے سب ارکان بڑے مصروف لوگ تھے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے عظیم ترین تعلیمی اداروں کے ذمہ دار تھے؛ لیکن خدا کی کچھ ایسی مدد ہوئی کہ جب میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کمیٹی نے ابھی تک جو

کچھ کام کیا ہے، وہ تمہیدی ہے، اور اصل کام باقی ہے، اس وقت تک صرف ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی تھی؛ جس کا کام یہ تھا کہ وہ نئے قائم ہونے والے کُلِّیَّةُ الْقُرْآن کے نصاب وتعلیم پر غور کرے۔

میرے پہنچنے کے بعد جامعہ کے چانسلر شیخ عبدالعزیز بن باز نے یہ تجویز پیش کی کہ جامعہ کے پورے نصاب ونظام پر نظر ڈالنے اور اس کا از سرِ نو جائزہ لینے کے لیے تعلیمی تجربات کی روشنی میں ضروری تجاویز اور ترمیمات پیش کرنے کے لیے ایک مختصر ذیلی کمیٹی بنادی جائے، اس میں اُنھوں نے میرا نام بھی رکھا۔ اس کے چار ارکان تھے: ایک استاذ محمد المبارک، جو شام کے سابق وزیر، بڑے ماہر تعلیم اور دمشق کے کُلِّیَّةُ الشَّرِیْعَةِ کے سابق پرنسپل اور اب وہ ملک عبدالعزیز یونیورسٹی کے تعلیمی مشیروں میں سے ہیں۔ دوسرے رباط کے مشہور تعلیمی ادارہ، جو غالباً مراکش کا سب سے بڑا دینی ادارہ ہے "دَارُ الْحَدِیْثِ اَلْمَدْرَسَةُ الْحُسَنِیَّةُ" کے پرنسپل شیخ مصطفیٰ احمد علوی اور ایک میرا نام تھا، چوتھے جامعہ اسلامیہ کے بڑے اساتذہ میں سے شیخ عبدالرؤف، جو شام کے عالم ہیں، ان کو شامل کیا گیا؛ تاکہ اگر ہم جامعہ کے جزئیات اور تفصیلات معلوم کرنا چاہیں اور کس شعبہ میں کتنا کام ہو چکا ہے اور کیا عملی مشکلات ہیں؟ اس کے لیے وہ ہماری مدد کر سکیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کمیٹی سب سے بنیادی کمیٹی تھی، اور سب سے نازک اور ضروری کام اس کے سپرد ہوا تھا۔ میں جب پہنچا تو اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ ذیلی کمیٹیاں صبح کام کرتی ہیں اور مجلس استشاری کی نشست جامعہ میں شام کو ہوتی ہے، تو میرا وقت بھی ضائع نہیں ہوا اور ہم نے کام شروع کر دیا۔

مجھے اس وقت اپنی حقیر تعلیمی خدمات اور علمی تجربوں کی بڑی قدر آئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری علمی زندگی کا آغاز مدرس کی حیثیت سے ہوا تھا۔ دس سال میں نے یہاں تدریسی خدمات انجام دی، اس وجہ سے چیزوں کا مجھے عملی تجربہ تھا، اور پھر اس کے بعد مختلف تعلیمی اداروں کی خدمت کا موقع ملا۔ اِس کمیٹی میں میری تجاویز پر بعض اوقات مجھے تشریح اور وکالت کا موقع دیا گیا اور بعض جزئی ترمیموں کے ساتھ تقریباً سو فی صدی وہ تجاویز منظور کر لی گئیں۔ اس طرح میرا وہاں جانا بے سود نہ رہا، اگرچہ مجھے مشکل سے چار دن کام کرنے کے لیے ملے، مگر خاصا بڑا اور مفید کام ہوا۔

آخر میں اختتامی اجلاس ہوا، اور شیخ عبدالعزیز بن باز کی تجویز سے سب سے آخر میں میری تقریر رکھی گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ سعودی ریڈیو نے اس کو نشر کیا اور یہ اعلان کیا کہ یہ تقریریں بار بار نشر کی جائیں گی۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ میں تاخیر سے پہنچا؛ لیکن میرا جانا خود میرے لیے بھی بہت مفید رہا؛ کیونکہ اِن علمی اور تعلیمی مجالس میں شریک ہونے سے مجھے بھی بہت فائدہ

ہوتا ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد یہ مجلسیں ہوتی ہیں، اوراب کے تو پانچ سال کے بعد کمیٹی ہوئی؛ کیونکہ اس میں بعض بڑے نامور اور ممتاز ماہرین تعلیم اور علماء اور ماہرین فن تھے۔ اس میں مجھے بھی نئے نظریات اور نئے تجربوں سے واقف ہونے کا موقع ملا، اور معلوم ہوا کہ کتنا کام ہو چکا ہے؟ کس طرح سوچا جارہا ہے؟ کیا مشکلات درپیش ہیں؟ میں یہ کہنا بھول گیا کہ میں نے مناسب سمجھا کہ دودن کی شرکت کے بعد اپنے خیالات قلمبند کرلوں اور منضبط طریقے سے ان کو پیش کروں، اس کے نتیجہ میں جو مضمون ترتیب میں آیا، خود آپ کے اخبار ''تعمیر حیات'' میں اس کا ترجمہ شائع ہوا، سعودی عرب اور کویت وغیرہ کے بعض اخبارات ورسائل نے اسے من وعن شائع کیا۔

عرب-اسرائیل جنگ اور شاہ فیصل کا مؤثر کردار

سوال: چونکہ ہمیں انٹرویو کے لیے بہت کم وقت ملا ہے؛ اس مختصر وقت میں چند غیر مربوط سوالات ہی کیے جاسکتے ہیں۔ ایک بات یہ دریافت کرنی ہے کہ عالم عرب-اسرائیل جنگ نے عربوں کا حوصلہ بلند کردیا ہے، ایک عام خیال یہ بھی ہے اور عالمی پریس میں بھی یہ بات آچکی ہے کہ حالیہ جنگ میں سعودی عرب اور اس کے فرمانروا شاہ فیصل نے مؤثر رول ادا کیا ہے، خاص طور پر تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کے سلسلہ میں، اور یہ بھی ایک خیال ہے کہ عربوں کی فکری اور عملی قیادت مصر سے حجاز منتقل ہورہی ہے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اور اس کا خود احساس وہاں کی سوسائٹی کے مختلف طبقات پر کہاں تک ہے؟

جواب: آپ نے بڑا نازک سوال کیا اور اچانک یہ بات میرے سامنے آئی، یہ توصحیح ہے کہ سعودی عرب کے سربراہ شاہ فیصل نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا ہے، اور اس کا احساس اب عام طور پر تمام اسلامی ممالک اور خود مغربی ممالک میں بھی کیا جارہا ہے، اور ان کی قائدانہ صلاحیت، معاملہ فہمی اور شخصیت کا وزن ڈالنے کا ایک تجربہ ہوا ہے۔

جہاں تک سعودی عرب کا تعلق ہے، وہاں عام طور پر اس کی تحسین کی گئی ہے؛ لیکن چونکہ وہاں خاص حالات ہیں، جس کی بناء پر وہاں اس طرح کی مجلسی زندگی نہیں ہے، اور اظہارِ خیال کے اس طرح کے طریقے ابھی تک مروج نہیں ہوئے جیسے کہ نام نہاد جمہوری ملکوں میں، پبلک جلسوں اور کلب وغیرہ کی شکلوں میں مروّج ہیں، جہاں ہر مسئلہ پر فوراً ہی رائے زنی اور اپنے جذبات اور تأثرات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے؛ اس وجہ سے سوسائٹی کے مختلف طبقات کے جذبات وتأثرات کا صحیح اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی وفات

سوال: آپ کی غیر موجودگی میں بعض اہم واقعات پیش آئے۔ ہندوستان میں مسلم قیادت کے فقدان اور اس قحط رجال کے زمانہ میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا سانحۂ ارتحال، پھر عالم عربی کی چند اہم شخصیتیں جن سے جناب والا کے قریبی مراسم تھے، یعنی مراکش کے شیخ علال الفاسی، مصر کے شیخ ابوزہرہ اور مفتی امین الحسینی کا انتقال؛ ان متوفین کے بارے میں جناب سے ذاتی تأثرات ہم جاننا چاہتے ہیں؟

جواب: آپ نے یہ پوچھ کر داغ کہن تازہ کر دیے، خاص طور پر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کا نام سنتے ہی دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ ان کے بارے میں میں اپنے تأثرات کا اظہار ایک مضمون میں تفصیل سے کر چکا ہوں جو ''ندائے ملت'' کے قریبی نمبر میں شائع ہوا ہے؛[(۱)] باقی یہ کہ آپ نے پوچھا ہے، اس لیے تکلیف کے احساس کے ساتھ دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت عرصہ سے اس طرح سے چل رہی تھی کہ کم سے کم ہم قریبی لوگ ہر وقت یہ محسوس کر رہے تھے کہ کسی بھی وقت کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ آخری ملاقات میں بھی اُنھوں نے کچھ اشارے ایسے کیے کہ ہم لوگ سمجھے کہ شاید یہ جلد ہی پیش آ جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب وہ ندوہ آتے تھے تو وہ موٹر سے اتر کر مہمان خانہ چار قدم چلنے سے وہ ہانپ جاتے تھے، جب تک تھوڑی دیر دم نہیں لیتے تھے اور سانس برابر نہیں ہوتی تھی، کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ ان کے پھیپھڑے عرصہ سے بے کار سے ہو گئے تھے، خاص طور پر الیکشن میں اُنھوں نے جس طرح اپنے کو جھونک دیا اور صحت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، اس سے ان کے قریبی دوستوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ زیادہ دن ہمارے درمیان نہیں رہیں گے، اور یہی ہوا کہ مجھے مدینہ طیبہ میں ایک دن اچانک ڈاکٹر اشتیاق صاحب کے تار سے ان کے انتقال کی خبر ملی، اور ایسا محسوس ہوا کہ اپنا کوئی قریبی عزیز بچھڑ گیا ہو۔

آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم لوگوں سے ڈاکٹر فریدی کا معاملہ محض ایک قائد، ایک رفیق، ایک شریکِ سفر کا نہیں تھا؛ بلکہ ایک فردِ خاندان کا سا تھا۔ میرے معالج بھی تھے اور نہایت مخلص دوست بھی۔ خاص طور پر ''مجلس مشاورت'' اور ''مسلم مجلس'' کے قیام کے بعد سے عام طور پر لوگ ہمیں بہت زیادہ قریب سمجھتے تھے، اور یہ ایک واقعہ بھی تھا کہ اُنھوں نے میرے بعض مشوروں کو قبول کیا،

(۱) یہ مضمون اب خفیف ترمیم واضافہ کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی کتاب ''پرانے چراغ'' (جلد اول) میں شامل ہے۔

اور ایک حد تک بعض چیزوں میں قربانی بھی دی۔

ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ملی قیادت کا مسئلہ تو ایک بڑا مسئلہ ہے، ساری ملت کے سوچنے کا؛ لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ لکھنؤ اور یو پی میں بن گیا تھا، اس میں ایک عظیم خلا پیدا ہو گیا؛ لیکن اس موقع پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرے دل میں یہ بڑی چوٹ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں بڑی تنہائی محسوس کرتے تھے، ان کو دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا۔ بہت کم لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، وہ گویا یوسف بے کارواں تھے، اور انھیں اس کا شدت سے احساس تھا، میرے پاس اکثر آتے اور کہتے کہ "میاں! اب بالکل مایوس ہو چکا، میں کیا کروں؟ کوئی ساتھ دینے والا نہیں، تھوڑا سا وقت کوئی لگانے والا ہی نہیں، آپ اجازت دیں تو میں اپنے پیشے میں مصروف ہو جاؤں، میرے لیے بھی کام بہت ہے۔"

یہ تو ان کی خاکساری تھی کہ وہ مجھے یوں کہتے تھے، ورنہ وہ اپنے جذبہ سے اِس میدان میں آئے تھے، سوچ سمجھ کر آئے تھے، میرا یہ کہہ دینا کہ آپ یہ کام چھوڑ دیجیے، اس کا کوئی جواز نہیں تھا، مگر یہ ان کی بڑائی تھی کہ وہ اس طرح سے کہتے تھے۔ بعض اوقات مجھے بھی خیال ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب جس طرح اپنی توانائی صرف کر رہے ہیں، اس سے ان کا پیشہ بھی متأثر ہو رہا ہے اور نتیجہ وہ نہیں نکل رہا ہے جو نکلنا چاہیے۔

ہماری ملت اس حال میں نہیں ہے کہ ٹھنڈی، پرسکون بات، گہری بات سنے اور سمجھے۔ اس کا مزاج خاص طور پر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ جن جماعتوں نے کیا اور جو مسلمانوں کے اعصاب پر حاوی رہیں، اُنھوں نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ مسلمان جس بات میں آگ کی گرمی اور انگاروں کی تپش نہ ہو، تو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، نہ سنجیدہ تقریر اُنھیں پسند آتی ہے، نہ صحیح مشورہ اُن کو پسند آتا ہے، بس جو شخص الفاظ سے کھیلنا جانتا ہو، جو اُن کے جذبات میں تلاطم برپا کر سکے، وہ اُنھیں عزیز ہے۔

چنانچہ یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ لکھنؤ شہر میں، جو اُن کی سیاسی سرگرمیوں اور اُن کی سماجی خدمت کا میدان تھا، وہاں ان کے حادثۂ رحلت کو جتنا محسوس کرنا چاہیے تھا، اور جن جذبات کا اظہار کرنا چاہیے تھا، عوام کی حد تک وہ بات نہیں ہوئی۔ اس میں اس بات کا بہت دخل تھا کہ الیکشن میں اُنھوں نے جو کردار ادا کیا، وہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو پسند نہیں آیا، وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ جذباتی باتیں کہی جائیں اور جو شخص زیادہ سے زیادہ منافرت پیدا کر سکے اور نفرت و غصہ کا اظہار

کر سکے، بس وہی عزیز ہے۔ میں اکثر لکھتا رہتا ہوں اور کہتا رہا ہوں کہ یہ مزاجی اور ذہنی کیفیت بڑی خطرناک ہے کہ جو شخص بالکل عوام کی مرضی کی بات کہے اور جو اُن کے جذبات سے کھیلنا جانتا ہو، بس اُسی کو سینہ سے لگانے کے لیے تیار ہوں، چاہے وہ وقتی طور پر ہو؛ لیکن جو ذرا سوچنے والی بات کہے، جس میں مسلسل کوشش وجد وجہد کرنی پڑے، جس کے لیے قربانی کی ضرورت ہو؛ تو وہ عوام کو پسند نہیں آتی اور سنجیدہ بات کہنے والا نہ ان کا دل جیت سکتا ہے، نہ محبوب قائد بن سکتا ہے۔

یہ عجیب بات تھی کہ یہ مدت جس کا بڑا حصہ مجھے باہر گزارنا پڑا، حوادث سے پُر ہے، اور حوادث بھی معمولی نوعیت کے نہیں؛ بلکہ بہت خاص نوعیت کے ہیں۔ جہاں تک شخصیتوں کا تعلق ہے، اس عرصہ میں عالم اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کی وفات کا واقعہ پیش آیا، ان میں سے ہر ایک کا یہ حق ہے کہ ان کے حالات اور خدمات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

ان میں سے خاص طور پر مفتی امین الحسینی کا مقام تو ایسا ہے کہ ان سے میرا خصوصی تعلق رہا، اگر چہ یہ تعلق خورد و بزرگ کا تھا۔ میں ان کے نیاز مندوں میں تھا۔ وہ میرے بزرگوں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر اقبال وغیرہ کی صف میں تھے؛ لیکن ان کا مجھ سے ایسی شفقت کا تعلق تھا اور ان کی ایسی بزرگانہ ادائیں تھیں کہ جن کی وجہ سے سن وسال کا یہ تفاوت زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا، اور اُنھوں نے ہمیشہ عزیزانہ اور مشفقانہ تعلق رکھا۔

شیخ ابوزہرہ کا تذکرہ

سب سے پہلے شیخ ابوزہرہ کے انتقال کا واقعہ پیش آیا، اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت وسعت نظر، خاص طور پر فقہ اور اصول فقہ میں شاید عالم اسلام میں ان کی نظیر نہیں تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ بڑے متبحر عالم، عمیق النظر مفکر اور مصنف تھے۔ ان کی کتابیں جو زیادہ تر علم آداب اور فقہی مکاتب کے بانیوں پر ہیں، سند کا درجہ رکھتی ہیں، اور اس قابل ہیں کہ بڑے بڑے علماء بھی ان سے استفادہ کریں۔

میرا ان کا غائبانہ تعارف تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ کے میرے طویل زمانۂ قیام میں میری ان سے ملاقات ہوئی ہو یا کسی مجلس میں ہم دونوں شریک رہے ہوں؛ لیکن اب یہ یاد نہیں آتا۔ بہر حال وہ بھی مجھے پوچھتے رہتے تھے، اور میں بھی ان کی قدر کرتا تھا۔ خاص طور پر جمال عبدالناصر کے زمانہ میں، جبکہ کسی کا زبان کھولنا اور اپنا ایسا نقطۂ نظر پیش کرنا جو جمال عبدالناصر

کے رجحانات وخیالات سے مختلف ہو، گویا اپنی موت یا کم سے کم ذلت کو دعوت دینا تھا؛ لیکن تنہا شیخ ابوزہرہ تھے جو اپنے خیالات کا اظہار کردیا کرتے تھے، بہرحال یہ ایک عظیم علمی حادثہ ہے۔

استاذ علال الفاسی کا تذکرہ

استاد علال الفاسی سے مجھے کچھ زیادہ سابقہ پڑا، اگرچہ تعارف بہت بعد میں ہوا۔ رابطہ عالم اسلامی کے ممبر کی حیثیت سے وہ اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی یہ شرکت اپنی صحت کی خرابی یا مصروفیت کی وجہ سے طول وطویل وقفوں سے ہوتی تھیں، وہ "تحریک استقلال مراکش" کے بانی اور رہنما تھے۔ حسن اتفاق کہ وہ اس آخری جلسے میں موجود تھے جس میں مجھے اپنے مضمون کو پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس مضمون پر جن دوتین آدمیوں نے وہاں کے دستور کے مطابق اظہار خیال کیا، ان میں شیخ علال الفاسی بھی تھے، انھوں نے میرے مقالہ پر تبصرہ کیا، اور مجھے یہ معلوم تھا کہ ہندوستان کے علماء اور اہم ترین شخصیتوں کے بارے میں شیخ علال الفاسی بہت واقف ہیں، انھوں نے اپنی تقریر میں شاہ ولی اللہ کا بڑے بلند الفاظ میں تبصرہ کیا، اور اقبال کے بعض اشعار کا عربی ترجمہ بھی سنایا۔

رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی میں تقریباً پچاس ارکان ہوں گے، جو رباط سے لے کر جاکرتا تک ممتاز شخصیتیں ہیں؛ لیکن شاید اس میں مبالغہ نہ ہو کہ استاذ علال الفاسی سے زیادہ پڑھا لکھا، وسیع المطالعہ اور کہنہ مشق ممتاز عالم شاید رابطہ میں کوئی دوسرا نہیں۔

ان کی زندگی کا آغاز مدرسہ کی تدریس سے ہوا، رباط کے مشہور جامعہ قردین کے وہ فاضل بھی تھے اور مدرس بھی۔ اس کے بعد وہ مراکش کی تحریک آزادی کے رہنماؤں میں تھے، مراکش کی آزادی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کا اعتراف مراکش کے شاہ حسن ثانی نے ان کے تعزیتی جلسے میں بلند سے بلند الفاظ میں کیا۔

مفتی امین الحسینی کا تذکرہ

ابھی چند ہی دن ہوئے کہ رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کا تار ملا کہ مفتی امین الحسینی صاحب کا بیروت میں انتقال ہوگیا، اور سکریٹری جنرل شیخ صالح محمد قزاز نے رابطہ عالم اسلامی کے تمام ارکان اور اسلامی تنظیموں اور اداروں کے ذمہ داروں اور ملت اسلامیہ سے تعزیت کی۔ یہ چند الفاظ جو مفتی صاحب کے متعلق تار میں آئے اور سعودی اخبارات میں آئے، یہ الفاظ ان کا حق ادا

کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوگا کہ مفتی صاحب کی بین الاقوامی حیثیت تھی، اور مصروف ترین مسلمان رہنما تھے؛ بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوگا کہ جب ان کی روح نے اِس دارِ فانی کو خیر باد کہا، ملت اسلامیہ نے کیسا مخلص، کیسا باوقار، کیسا دیرینہ کہن سال مسلمان رہنما کھودیا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مفتی صاحب ہمارے اس عہد کے، جو تقریباً نصف صدی سے شروع ہوتا ہے، سیاسی سرگرمیوں اور دینی کوششوں کا، اس کے بزرگ ترین رہنما تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو محبوبیت اور اعتماد عطا فرمایا تھا، عالم عربی اور مشرق وسطیٰ میں وہ کسی اور کو حاصل نہیں تھا۔ مجھے ان سے ذاتی طور پر تعارف حاصل کرنے اور ان کی شفقتوں سے محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ وہ ہندوستان اور اِس برصغیر سے خاص دلچسپی اور تعلق رکھتے تھے؛ شاید ابھی لوگوں کو یاد ہو کہ وہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تدفین بیت المقدس کے خاص داعی اور محرّک تھے۔

جہاں تک قضیہ فلسطین کا تعلق ہے، اگر دوسرے فلسطینی مجاہد رہنما اور مسلمان قائد اس کے خادم، وکیل اور ترجمان کہلانے کے مستحق ہیں، تو مفتی صاحب کو ''پدر مسئلہ فلسطین'' (Father of Palestine Cause) کہنا صحیح ہوگا۔ میں نے ایک بار ان سے کہا بھی کہ آپ کی اِس مسئلہ کے ساتھ ایسی حیثیت ہے، جو کسی خاندان کے سرپرست اور مشفق بزرگ کی افراد خاندان سے ہوتی ہے، یہ صرف دینی اور سیاسی مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو گویا آپ کا ذاتی اور خاندانی مسئلہ ہے۔

اِس میں کوئی شبہ اور ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہوگا کہ کسی نے اتنے طویل عرصہ تک مسلمانوں کے ملی مسائل پر خاص طور پر مسئلہ فلسطین کی ایسی پرزور اور مخلصانہ وکالت نہ کی ہوگی جیسے مفتی صاحب نے کی۔

مفتی صاحب کا تعارف کرانے کے لیے تو درحقیقت ایک کتاب چاہیے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے آخری معرکہ میں اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے کا اہتمام کیا تھا جو "فلسطین" کے نام سے بیروت سے وہاں کی "اَلْهَيْئَةُ الْعُلْيَا لِفلسطين" کے تحت جس کے مفتی صاحب صدر تھے، نکلتا ہے۔ اپنی یادداشت کا یہ سلسلہ اگر اُنھوں نے مکمل کرلیا ہے، اور ابھی منظر عام پر آئے گا، تو نہ صرف ان کی زندگی بلکہ مسلمانوں کی اس آخری دور کی ایک اہم سیاسی دستاویز ہوگی، اور اس سے بہت سی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔

مفتی صاحب کا بدل ملنا مشکل ہے۔ مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو جامعیت، وجاہت، محبوبیت اور خلوص عطا فرمایا تھا، اس کا ثانی عالم اسلام میں کوئی نظر نہیں آتا۔ افسوس ہے کہ ان کی

زندگی میں ان کی قدر بہت کم پہچانی گئی۔ وہ ایک بہت بڑا داغ اپنے دل پر لے گئے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس وقت مسئلہ فلسطین کا جو تصفیہ ہوا ہے، وہ مفتی صاحب کی معلومات، مطالعہ اور جن حقیقتوں پر وہ ایمان رکھتے تھے، اُس سے یہ فیصلہ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ مجھے پورا اندازہ ہے کہ ان کو اس کا بڑا صدمہ ہوا ہوگا کہ اَونے پونے یہ مسئلہ حل ہو گیا، اور خاص طور پر بیت المقدس پر، جو سارے مسئلہ کی روح ہے، اور مسلمانوں کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس کا کوئی حل ابھی تک نہیں نکلا۔ ان کو سب سے زیادہ اسی کی فکر تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی کہ وہ وہیں پیدا ہوئے، وہیں بڑھے اور ان کی ساری زندگی اسی سے وابستہ تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو شادکام اور فائز المرام فرماوے۔

سرکاری امداد اور ندوۃ العلماء کی پالیسی

سوال: آپ کے زمانۂ قیام حجاز میں حکومت اتر پردیش نے اپنے بجٹ میں چند عربی مدارس کی امداد کے لیے رقم منظور کی ہے، ان میں ندوہ بھی ہے، حکومت کی اس امداد کے سلسلہ میں ندوہ کی پالیسی واضح نہیں ہے، کیا اِس پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب: میں ۱۴؍جون کو جب لکھنؤ پہنچا، تو اس وقت مجھے اچانک معلوم ہوا کہ حکومت اتر پردیش نے اپنے بجٹ میں چند اسلامی اداروں کے لیے کچھ رقوم رکھی ہیں، ان میں ندوۃ العلماء بھی ہے، میں اپریل کی آخری تاریخوں میں یہاں سے روانہ ہوا تھا، اور مئی کا پورا مہینہ اور جون کا نصف حصہ میرا باہر گزرا۔ مجھے اس کی اطلاع اسی طرح ہوئی، جیسے اور سیکڑوں اخبار پڑھنے والوں کو ملی ہوگی۔ اس وقت تک بھی مجھے یا ادارے کو ضابطہ کی اطلاع حکومت اتر پردیش کی طرف سے نہیں آئی۔

اگر آپ اس کے متعلق میرے خیالات یا میری معلومات دریافت کرنا چاہتے ہیں تو پہلی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ندوۃ العلماء کے کارکنوں کی طرف سے کسی قسم کی سلسلہ جنبانی نہیں کی گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کا مسلک ابتداء سے، یعنی برٹش گورنمنٹ کے زمانہ سے یہ رہا کہ ہمارا ادارہ حکومت کی امداد سے بالکل مستغنی رہے، اور ایک آزاد قومی ادارے کی حیثیت سے کام کرے، یہ اس ادارے کے بانیوں اور ذمہ داروں کی روشن ضمیری اور فراست تھی کہ ایسے زمانہ میں کہ جب اس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا، انھوں نے یہ اصول بنایا۔ اس سلسلہ میں اور بھی متعدد دینی اداروں کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے سرکاری سرپرستی اور امداد سے گریز کیا۔

ندوۃ العلماء نے، برطانوی عہد میں اس کو جو غیر مشروط اور بے خطر گرانٹ ملتی تھی، اس کو بھی تحریک خلافت کے زمانہ میں مسترد کر دیا اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ اس سے کیا شبہات

پیدا ہوں گے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ اس ادارے کو ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھتی رہی، اس کے نتیجہ میں اس ادارے کے ایک بڑے دیرینہ خادم، جو اس کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے یعنی منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوری و مشیر قانونی "انجمن تعلقداران اودھ" کو نہ صرف لکھنؤ بلکہ ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا، اور مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کرنی پڑی، وہیں انھوں نے انتقال کیا اور بقیع میں دفن ہوئے۔

اِس کے بعد ۱۹۴۷ء کے بعد جب حالات بدل گئے تو آپ کو معلوم ہے، اور شاید آپ نے اپنے کسی مضمون میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جن کا ندوہ سے قریبی تعلق تھا، اور اُنھوں نے مولانا شبلی کے زمانہ میں ان کی صحبتوں اور مجلسوں اور ندوۃ العلماء کے علمی ماحول سے استفادہ کیا تھا، انھوں نے اپنے دورِ وزارت میں اِس کی کوشش کی کہ ندوۃ العلماء ہندوستان میں عربی تعلیم کا ایک نمونہ کا کالج بن جائے۔ اِس کے لیے انھوں نے اِس کی پیش کش کی کہ حکومت ہند اس کی عمارتوں کی تکمیل بھی کردے گی اور اس کے تمام مصارف برداشت کرے گی؛ لیکن ہمارے بزرگوں کے سامنے جب یہ پیش کش آئی، تو انھوں نے مولانا آزاد کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اور ان کے مقام واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی، اور یہ ظاہر کیا کہ جن مقاصد پر اس ادارہ کی بنیاد رکھی گئی ہے اور جو اس کی اصل روح ہے، اس کے لیے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد ملی اور قومی ادارہ کی حیثیت سے کام کرے۔

ابھی حال میں ندوۃ العلماء کو یوپی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم کی طرف سے جو امداد ملتی تھی، جس کی بڑی مقدار نہ تھی، لیکن وہ بلاشرط تھی، اس کو قبول کرنے سے بھی معذرت کردی، اور وہ بند کردی گئی۔

ندوۃ العلماء کی سب سے بااختیار کمیٹی مجلس انتظامیہ ہے اور اسی کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ ناظم کے اختیارات محدود ہیں۔ میں ابھی کچھ تو اپنے سفر کی وجہ سے، کچھ اپنی علالت کی بناء پر اپنے رفقاء سے کوئی رابطہ قائم نہ کرسکا اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کا کوئی جلسہ بھی نہ ہوسکا، میں ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے اِس مسئلہ کو ان کے سامنے لاؤں گا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے؛ لیکن مجھے اس کا اندازہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا اتنا سرسری اور آسان نہیں، خاص طور پر اس کے قبول کرنے کے متعلق ندوۃ العلماء کے مقاصد، اس کی روح، اور اس کی تاریخ کو سامنے رکھنا ہوگا۔

میں اس وقت اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی قطعی بات کہہ سکوں، جہاں تک میرا تعلق ہے میں خود بھی قومی اداروں کو آزاد اور خدا کی مدد اور اپنے دست بازو اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کو زیادہ صحیح سمجھتا ہوں۔ یہی چیز دیرپا ہے اور اسی سے ٹھوس نتائج نکلتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کا آغاز درحقیقت ایک تحریک اور دعوت سے ہوا

سوال: ''ندوۃ العلماء'' کا آغاز ایک تحریک کی شکل میں ہوا تھا۔ ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' اس علمی اور تعلیمی تحریک کا ایک جزو ہے۔ ندوہ کے موجودہ دور میں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ندوہ بتدریج اپنے بنیادی مقاصد کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے، تو کیا اس کا امکان ہے کہ ندوہ پھر ایک بار تحریک کی شکل میں دنیا کے سامنے آئے، اور اس کے ان تاریخی اجلاسوں کا سلسلہ شروع ہو جن سے ایک زمانہ میں اس ملک میں اور عالم اسلام میں بڑی بیداری پیدا ہوگئی تھی؟

جواب: جی ہاں! ندوۃ العلماء کا آغاز درحقیقت ایک تحریک اور دعوت سے ہوا، وہ ایک ہمہ گیر تعلیمی اور دینی تحریک تھی، پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اس کو اپنی ایک تجربہ گاہ قائم کرنے اور ایسے ادارے کی بنیاد ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں وہ اپنے نظریات کو عمل میں لا سکے، اور اپنے عملی و تعلیمی تجربات کو دینی مدارس اور جامعات کے سامنے پیش کر سکے، آپ کو معلوم ہے کہ ہر سال ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہوا کرتا تھا، جو بعض حیثیتوں سے سارے ملک میں ممتاز ہوتا تھا۔

اپنی نوعمری کی وجہ سے مجھے اس کے اکثر جلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ لکھنؤ اور کانپور کے اجلاس میں جو غالباً ۱۹۲۵ء میں ہوئے تھے، مجھے شرکت کا موقع ملا۔

چونکہ گھر میں ان اجلاسوں کا تذکرہ ہوا کرتا تھا، اور ہمارے خاندان کا ندوہ سے قریبی تعلق تھا، اور میں نے ندوۃ العلماء کے اجلاسوں کی رودادیں بھی پڑھیں، اس سے اندازہ ہے کہ یہ اجلاس اپنی شائستگی، پاکیزگی، مقصدیت اور ملک کے ممتاز ترین علماء، مقررین اور اہل فکر کے یکجا جمع ہونے کے لحاظ سے سارے ملک میں ممتاز تھے، اور شاید اس معیار کے جلسے ملک میں بہت کم ہوئے ہیں۔ ان اجلاس سے ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت میں بڑی مدد ملتی تھی اور ایک فضا پیدا ہوتی تھی۔

اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا کہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کا تذکرہ کردیا جائے کہ وہ یہ حسرت لے کر گئے کہ اپنی زندگی کے آخری دور میں ندوۃ

العلماء کا اجلاس دیکھیں، اور اس میں شرکت کریں، مگر افسوس ہے کہ اس کا موقع نہ نکل سکا۔

ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے بعض رفیقوں اور اصرار ہے کہ کیوں نہ اِن جلسوں کا احیاء کیا جائے اور عالمی پیمانے پر ندوۃ العلماء کا اجلاس کیا جائے، اور اس میں اس پورے کام کا جائزہ لیا جائے جو اس وقت تک ہوا، مستقبل کے لیے کام کا منصوبہ بنایا جائے، اور ندوۃ العلماء کی علمی اور فکری دعوت کو نہ صرف اس ملک کے اہل فکر کے سامنے؛ بلکہ عالم اسلام کے مفکرین کے سامنے پیش کیا جائے اور ان کے خیالات سے بھی استفادہ کیا جائے۔ اس اجلاس کے متعلق ہمارے جلسۂ انتظامی کی ایک قرارداد ہے۔ ندوہ کی مجلس انتظامی نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے، اور بات اس سے بھی آگے بڑھ چکی ہے کہ میں بعض اسلامی ملکوں کے اہل فکر اور ماہرین تعلیم اور وہاں کے اداروں کے سربراہوں سے اس اجلاس کے متعلق گفتگو بھی کر چکا ہوں، اور رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کے موقع پر انھیں دعوت بھی دے چکا ہوں۔ ان میں سے بعض اہم شخصیتوں نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس اجلاس کو عملی، علمی اور فکری حیثیت سے مفید سے مفید تر بنایا جائے، اس سے کوئی پیغام ملے، اور کوئی واضح فکر سامنے آئے۔ اس کے لیے ہم کو تیاری کرنی ہوگی، ذرا وسیع انتظامات کرنے ہوں گے۔ ہم نے تو چاہا تھا کہ اسی سال نومبر میں جلسہ ہو جائے؛ لیکن وقت بہت کم رہ گیا ہے اور اس کا امکان باقی نہیں رہا کہ اس سال جلسہ کیا جا سکے؛ لیکن ہم کوشش کریں گے کہ ۱۹۷۵ء میں ایسا بین الاسلامی اجلاس ہو جس میں ممالک عربیہ اور ممالک اسلامیہ کے قائدین، زعماء اور مفکرین جمع ہوں۔ (۱)

یہ میرے خیال میں نہ صرف ندوۃ العلماء، ہندوستان اور اس برصغیر کے لیے مفید ہوگا؛ بلکہ ان ممالک کے لیے بھی مفید ہوگا، جہاں کے علماء اور فکری قائدین اس میں شرکت کریں گے۔

سوال: جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کی اکیڈمک کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد چند ممتاز ماہرین تعلیم سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کے بعد جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا کہ کچھ نئے گوشے سامنے آئے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں جو تعلیمی نظام رائج ہے، اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، تو کیا آج سے بہتر نتائج کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی خاکہ اور کوئی اسکیم ہے؟

---

(۱) ۱۹۷۵ء میں یہ بین الاقوامی کانفرنس ندوہ میں منعقد ہوئی، اس کی روداد کے لیے دیکھیں: روداد چمن از مولانا سید محمد الحسنی، شائع کردہ: مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

جـــواب: آپ نے بڑا اچھا سوال کیا۔ میرا ہندوستان کے جس مکتبۂ خیال اور دبستاں سے تعلق ہے، اس کی بنیاد اس پر ہے کہ علم ایک ترقی پذیر اور نمو کی صلاحیت رکھنے والی چیز ہے، جس میں جمود و تعطل نہیں۔ اور خاص طور پر جس ادارے کی بنیاد ہی غور وفکر، تبدیلی کی ضرورت اور زمانہ کے جائز تقاضوں کو پورا کرنے کی حقیقت پر ہے، اس کے لیے کسی وقت بھی جائز نہیں کہ وہ اپنی کوششوں کے نتائج کا جائزہ نہ لے، اور یہ نہ دیکھے کہ حسب توقع نتائج نکل رہے ہیں یا نہیں، اور کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ بعض اہم کمیٹیوں کا ممبر ہونے کی وجہ سے مجھے بار بار باہر کا سفر کرنا پڑتا ہے، اور ماہرین تعلیم کے ساتھ بیٹھ کر تعلیمی مسائل پر سوچنے اور ان کے تجربات کو سننے کا موقع ملتا ہے۔ میرا ذہن برابر کام کرتا رہتا ہے کہ اپنے ادارے کے لیے اور ہندوستان کے لیے ان چیزوں سے استفادہ کروں، اور میری بھی نظر میں وسعت اور معلومات میں اضافہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے اس محدود میدان میں جو محدود ہونے کے باوجود اچھی خاصی وسعت بھی رکھتا ہے، اس میں جو عرصہ سے تجربہ کر رہے ہیں، اس کے نتائج سے ہم مطمئن نہیں ہیں، اور یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جیسا کہ ندوہ کے بانیوں نے ابتدائی دور میں جرأت مندانہ اور انقلابی قدم اٹھایا تھا، اسی طریقہ سے ہم کو بھی برابر یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز بن سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں چند چیزیں ذہن میں آئی ہیں، انھیں قلم بند کر کے میں اپنے رفقاء کے سامنے پیش کروں گا، اور باہر کے ماہرین تعلیم، دینی تعلیم گاہوں اور شریعت کالج اور جامعات کے بڑے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا جائے گا، اور کوشش کی جائے گی کہ علوم اسلامیہ کو زوال سے بچایا جائے۔

ہندوستان کا ایٹمی تجربہ

ســـــوال: آپ کی غیر موجودگی میں ہندوستان میں ایٹمی تجربہ کا ایک اہم واقعہ پیش آیا، جس کے دور رس اثرات ونتائج مرتب ہوں گے، ہندوستان کے ایٹمی دھماکہ اور نیوکلیائی تجربہ پر انسانی فلاح و بہبود اور اس کے منفی اثر دونوں پہلوؤں پر ہم آپ کا نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

جـــواب: شاید آپ مجھ سے اس کا یہ جواب سننے کے متوقع نہ ہوں کہ اخلاق و مذہب

کے ایک طالب علم اور ان پر عقیدہ رکھنے والے اور کوشش کرنے والے انسان کی حیثیت سے مجھے اس خبر سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی، اگر چہ اس میں اپنے ملک کی بڑائی نکلتی ہے۔ مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی کہ میں سنتا کہ ہندوستان کے انتظامیہ کو صاف ستھرا بنانے، اور فرض شناسی اور انسانی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ایک مہم شروع کی گئی ہے، اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ سارے ملک سے رشوت خوری، منافع خوری، بے انصافی اور کام میں سستی دور کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا ہے۔

میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا کہ اس ملک کی آزادی کے لیے جو جدوجہد کی گئی تھی، اس میں ایک خواہش اور تمنا یہ بھی شامل تھی کہ ہم دنیا کے سامنے ایک نیا تجربہ پیش کریں گے، جس کی بنیاد اخلاق اور اہنسا ہوگی، ہم مشرق کے قائد بن کر یورپ کو بے راہ روی سے بچائیں گے، جو اپنی طاقت کے نشہ میں چور ہو رہا ہے۔

دنیا میں طاقت کے وسائل کے حصول کے لیے جو دوڑ ہو رہی ہے، اس اندھی بہری ریس میں ہم بھی شامل ہو جائیں، تو یہ ہمارے مقام کے زیادہ شایانِ شان نہیں۔!!

دو ہفتے مغرب اقصیٰ (مراکش) میں

۱۹۷۶ء میں حجاز مقدس، مراکش اور لندن کے ایک طویل سفر سے واپسی کے بعد حضرت مولاناؒ سے اس سفر کے متعلق اپنے تاثرات، جن ممالک کی انھوں نے سیاحت کی، ان کی دینی، تعلیمی اور سماجی حالت، نیز جن تنظیموں کے جلسوں میں ان کی شرکت ہوئی، ان کے مقاصد اور سرگرمیوں کے بارے میں یہ انٹرویو مدیر ''تعمیر حیات''، لکھنؤ نے لیا، اور ''تعمیر حیات'' (شمارہ ۲۵/جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

اپنی زندگی کا طویل ترین سفر

اس سفر کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''میرا یہ سفر اپنی زندگی کا طویل ترین سفر تھا جو تین براعظموں پر مشتمل تھا، یعنی ایشیا، افریقہ اور یورپ۔ چوتھا براعظم امریکہ رہ گیا، اس کا امکان تھا کہ میں وہاں جاتا۔

اس سفر کا آغاز حجاز مقدس سے ہوا، یہاں کی جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی المجلس الأعلى للجامعة الإسلامية (جامعہ اسلامیہ کی اعلیٰ بااختیار کمیٹی) کی میٹنگ میں مجھے شرکت کرنا تھی، جس کا میں رکن ہوں۔ پہلے اس مجلس کا نام "المجلس الاستشاري للجامعة الإسلامية" تھا، اس مجلس میں سعودی عرب کی چاروں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ صالح قزاز، حکومت سعودیہ کے وزیر تعلیم شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ اور مراکش، تیونس، ام درمان کی اسلامی جامعات اور ممتاز ترین درسگاہوں کے سربراہ اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، جامعہ ازہر (مصر) کے مدیر (رجسٹرار)، مشہور اخوانی رہنما، مصنف اور مصر کے عالم محمد الغزالی (كلية الشريعة، مکہ مکرمہ کے نمائندے کی حیثیت سے)، استاد یوسف القرضاوی (كلية المعلمين، قطر) بحیثیت ارکان شامل ہیں، اس جدید تشکیل میں زیادہ تر ماہرین تعلیم اور ممتاز دینی درسگاہوں کے سربراہ رکھے گئے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی تاسیس ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۱ھ میں ہوئی، اور میرا اسی زمانے سے اس جامعہ کی مجلس استشاری کے رکن کی حیثیت سے تعلق ہے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ نے تھوڑے ہی عرصے میں خاصی ترقی کر لی ہے، دنیا کے اسّی (۸۰) سے زیادہ ممالک کے طلبہ اس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، طلبہ کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے، امسال اس یونیورسٹی کا جو بجٹ پیش ہوا، وہ ۴۰ کروڑ ریال ہے، یعنی ایک ارب روپیوں سے بھی زائد ہے، ہمارے ملک کی کسی یونیورسٹی کا اتنا بڑا بجٹ نہیں، مسلم

یونیورسٹی (علی گڑھ) جو اپنے اسٹاف، طلبہ کی تعداد اور مختلف شعبوں کی کثرت کے اعتبار سے جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) سے کہیں فائق ہے، اس کا سالانہ بجٹ کل چار کروڑ روپے ہیں۔ اسی ایک مثال سے تعلیم کے لیے حکومت سعودیہ عربیہ کی شاہ خرچی اور دریا دلی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے مملکت سعودی عربیہ کے موجودہ ولی عہد اور نائب وزیر اعظم شہزادہ فہد بن عبدالعزیز خصوصی تعلق رکھتے ہیں، اور اس یونیورسٹی کے وہ وزیٹر (Visitor) بھی ہیں۔

میرا یہ سفر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی المجلس الأعلى کی جس میٹنگ میں شرکت کے لیے ہوا تھا، اس کی افتتاحی نشست سے ولی عہد شہزادہ فہد نے بھی خطاب فرمایا تھا، اتفاق سے میں افتتاحی نشست میں شریک نہیں ہوسکا، کیونکہ سفر کے قانونی مراحل طے ہونے میں دیر لگ گئی اور میں ایک دن تاخیر سے مدینہ منورہ پہنچا، لیکن میں نے اس افتتاحی نشست کی جو روداد سنی، اس میں خاص طور پر شہزادہ فہد کی تقریر کا لوگوں نے تحسینی انداز میں ذکر کیا، اور ان کی تقریر کا وہاں اچھا چرچا تھا۔

مرحوم شاہ فیصل کی شہادت کے بعد مملکت سعودی عربیہ کا یہ میرا پہلا سفر تھا، اس موقع پر میری خواہش تھی کہ میں دار السلطنت ریاض بھی جاؤں، اس کی تقریب یوں ہوئی کہ ۱۵/ اپریل ۱۹۷۶ء سے المجلس الأعلى العالمي للمساجد کے اجلاس مکہ معظّمہ میں شروع ہوئے، جس میں انڈونیشیا سے یورپ و امریکہ تک کے ممتاز علماء اور اسلامی کارکن شریک ہوئے، اس کمیٹی کے جو "مؤتمر رسالة المسجد" سے وجود میں آئی، ہندوستان کی طرف سے میں اور مولانا محمد یوسف صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند) رکن ہیں۔

"مؤتمر رسالة المسجد" گذشتہ سال ماہ رمضان المبارک میں منعقد ہوئی تھی، جس میں دنیا کے مختلف گوشوں سے علماء، اسلامی کارکن، ائمۂ مساجد اور اہم دینی شخصیتوں نے شرکت کی تھی، ان شرکاء کی تعداد تقریباً ۴۰۰ تھی، مجھے اس مؤتمر کا دعوت نامہ ملا تھا، لیکن ماہ رمضان المبارک کی مشغولیت اور ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ اجلاس کی تیاریوں کی وجہ سے (جس کا انعقاد عید بعد ہونا تھا) "مؤتمر رسالة المسجد" میں شرکت نہیں ہوسکی، اس مؤتمر سے المجلس الأعلى العالمي للمساجد وجود میں آئی، اس تنظیم کا مقصد عصر حاضر میں مساجد کو اسلام کے پیام، دین کی مؤثر دعوت اور اور اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا سرگرم و فعال مرکز بنانا ہے، ائمۂ مساجد کے معیار کو بہتر بنانا، ان کی دعوتی تربیت اور اس مقصد میں ہر ممکن تعاون تاکہ مسجد کو مسلم معاشرہ میں وہی حیثیت حاصل ہو جائے جو جسم انسانی میں قلب کی ہوتی ہے۔

المجلس الأعلى العالمي للمساجد کی آخری نشست میں شیخ صالح قزاز سیکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی نے اعلان کیا کہ تمام شرکائے اجلاس کل ریاض جائیں گے اور شاہ خالد کی خدمت میں جلسے کی روداد اور تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اس پروگرام کے مطابق ایک خصوصی طیارے سے تمام اراکین ریاض پہنچے، شاہ خالد کی خدمت میں جلسے کی کارروائی اور تجاویز پیش کی گئیں اور ارکان کا تعارف کرایا گیا۔ شاہ خالد دینی ذہن رکھتے ہیں اور مرحوم شاہ فیصل شہید کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں۔

شاہ خالد کے بعد مجلس استشاری کے اراکین کی ملاقات ولی عہد شہزادہ فہد سے کرائی گئی، جلسے کی روداد اور تجاویز سن کر انھوں نے ایک طویل تقریر کی، اس میں اسلام کی ضرورت اور عہد حاضر میں اس کی قائدانہ صلاحیت کا اظہار کیا۔

حکومت کے تیسرے اہم رکن امیر عبداللہ بن عبدالعزیز "رئيس الحرس الوطني" (نیشنل گارڈ چیف) سے بھی وفد نے ملاقات کی۔ امیر عبداللہ ایک دیندار اور دردمند انسان ہیں، اور شاہ خالد کے قریب ترین معتمد۔

سوال: لندن میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں اپنی شرکت کا ارادہ عین وقت پر آپ نے منسوخ کر دیا، اس کے کیا اسباب تھے؟

جواب: لکھنؤ سے میرے سفر کا پروگرام یہی تھا کہ پہلے حجاز میں المجلس الأعلى للجامعة الإسلامية میں شرکت، اس کے بعد لندن کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے لیے لندن روانگی، وہاں سے واپس آکر المجلس الأعلى العالمي للمساجد کی میٹنگ میں حاضری، مراکش کا سفر اس وقت پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

لندن کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا دعوت نامہ مجھے لکھنؤ میں مل گیا تھا، حجاز میں رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری شیخ صالح قزاز نے مجھے رابطہ کے وفد کے قائد کی حیثیت سے طے کر دیا، میرے اور میرے رفیق عزیز مولوی محمد رابع ندوی کے ٹکٹ بھی آگئے، لیکن میں نے لندن جانے اور اس کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ منسوخ کر دیا، حجاز کے دوران قیام لندن کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے بارے میں متضاد باتیں سننے میں آئیں۔ ان ہی دنوں لندن میں ایک اسلامی فیسٹیول بھی منعقد ہو رہا تھا، اس کی تفصیلات جب علم میں آئیں تو یہ اندازہ ہوا کہ اسلامی ثقافت کے نام سے رقص و موسیقی کو بھی پیش کیا جائے گا، بین الاقوامی اسلامی کانفرنس۔ جس کی مالی ذمہ داریاں جامعۃ الملک عبدالعزیز نے اٹھائی تھیں، اور جس کا افتتاح شہزادہ محمد بن فیصل نے کیا تھا۔

اسلامی فیسٹیول سے بلا واسطہ متعلق تو نہیں تھی، تاہم دونوں کا افتتاح اور انعقاد قریبی تاریخوں میں ہو رہا تھا، اور ہر شخص ان دونوں کے فرق کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا، لہٰذا احتیاط کے پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے میں نے لندن کا سفر ملتوی کر دیا، اس سے مجھے حجاز مقدس میں مزید قیام کا موقع مل گیا، سفر کے پروگرام میں اس تبدیلی کی وجہ سے میرا مراکش جانا ہوا۔

سوال: شاہ فیصل مرحوم کی شہادت کے بعد آپ کا یہ پہلا سفر تھا، وہاں کی قیادت نے شاہ مرحوم کے خلا کو پُر کر دیا، ان کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے؟

جواب: مملکت سعودی عربیہ کے موجودہ حکمراں شاہ فیصل شہید کے خطوط پر گامزن ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی کمی کا عام احساس ہے، شاہ فیصل جیسے باوقار، سنجیدہ، متوازن اور دور بین مدبر کی قیادت کی ضرورت نہ صرف سعودی عربیہ بلکہ پورے عالم اسلام کو تھی، آج کے حالات میں ان کی کمی بڑی محسوس ہو رہی ہے، جبکہ عرب ممالک کا اختلاف باہمی خونریزی تک پہنچ چکا ہے، اور عالم اسلام انتشار کا شکار اور مختلف قسم کے خطرات سے دوچار ہے۔

مراکش کا سفر میرے لیے ایک نئی دنیا کی دریافت تھا

سوال: اس سفر میں آپ پہلی مرتبہ مراکش تشریف لے گئے تھے، اس سفر کی تقریب کیسے پیدا ہوئی، اور اس ملک کو آپ نے کیسا پایا؟

جواب: مراکش کا سفر میرے لیے ایک نئی دنیا کی دریافت تھا، مجھے اس شمالی مغربی علاقہ میں جو لیبیا سے شروع ہو کر مراکش پر ختم ہوتا ہے، اب تک جانے کا موقع نہیں ملا تھا، میری خواہش تو عرصے سے اس کی زیارت کی تھی، مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسی سال اس کی نوبت آئے گی۔

اس سفر کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ اب سے چار پانچ سال قبل جمعية الجامعات الإسلامية کی تشکیل ہوئی، دنیا کی اسلامی یونیورسٹیوں اور اداروں کا یہ ایک وفاق (Federation) ہے، اس وفاق کے تاسیسی جلسہ میں میری شرکت ہوئی تھی، اور اسی وقت سے ندوۃ العلماء کو بھی اس وفاقی تنظیم کا رکن بنا لیا گیا تھا۔

امسال جمعية الجامعات الإسلامية کا جلسہ رباط (مراکش) میں ہونا طے پایا، اس تنظیم کا یہ مرکز بھی ہے، اور اسے شاہ حسن والیٔ مراکش کی سرپرستی بھی حاصل ہے، اس جلسہ کا دعوت نامہ لکھنؤ بھیجا گیا تھا، لیکن وہ غالباً ہماری روانگی کے بعد پہنچا۔

حجاز کے دوران قیام رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ صالح قزاز نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ آپ کو جمعية الجامعات الإسلامية کی میٹنگ میں رابطۂ عالم اسلامی کی نمائندگی کرنا ہے، آپ کے سفر کے انتظامات کر لیے گئے ہیں، میں رابطۂ عالم اسلامی کے نمائندہ، اور عزیزی محمد رابع ندوی ندوۃ العلماء کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کانفرنس کے لیے مراکش روانہ ہوگئے۔ ۱۱ر مئی ۱۹۷۶ء سے اس کا جلسہ تھا، لیکن ہم لوگ چار پانچ دن قبل مراکش روانہ ہوئے، تاکہ اس ملک کی کچھ سیاحت بھی کرسکیں، جس جہاز میں جدہ سے مراکش تک ہمارا سفر ہوا، اس میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر شیخ عبد المحسن بن عباد، مشہور اخوانی رہنما، خطیب اور مصنف شیخ محمد الغزالی، اور كلية الشريعة کے پچاس طلبہ بھی تھے، جو ایک ٹور (Tour) پر مراکش جارہے تھے۔ مانوس لوگوں کی رفاقت میں یہ سفر بہت اچھا گزرا۔ ہمارے سفر کے دوران جہاز تین مقامات پر رکا، طرابلس (لیبیا)، تیونس اور الجزائر، لیکن تیونس کے علاوہ ہمیں جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں ملی۔ بدقسمتی سے مراکش اور اس کی پڑوسی دو مملکتوں یعنی الجزائر اور لیبیا کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہیں کہ مراکش جانے والے مسافروں کو الجزائر اور لیبیا کے ہوائی اڈوں پر اترنے کی اجازت نہیں ملتی۔ ہم جب تیونس پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، ہم نے ہوائی اڈہ کے اس کشادہ کمرہ میں نماز پڑھی جو خاص طور پر نماز پڑھنے کے لیے تھا، اس پر "غرفة الصلاة" کی تختی آویزاں تھی۔ جدہ سے روانگی کے دس گھنٹہ بعد ہمارا جہاز دار البیضاء پہنچا، جو کاسابلانکا کے نام سے مشہور ہے۔

کاسابلانکا کا نام عرصہ سے سن رہے تھے، مگر اس کی عظیم الشان حیثیت کا اندازہ اسے دیکھ کر ہوا، یہ شہر قاہرہ کے بعد براعظم افریقہ کا دوسرا بڑا شہر ہے، اور اس علاقے کا اہم تجارتی مرکز، آبادی بیس لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ شمالی مغربی پٹی بڑی سرسبز و شاداب ہے، اور پورا علاقہ قدرتی مناظر، زرخیز پیداوار اور معدنی دولت سے مالا مال ہے، خاص طور پر مراکش اس لحاظ سے بہت ممتاز ہے، یہ پورا ملک آب و ہوا، پھلوں کی کثرت اور قدرتی مناظر میں کشمیر سے مشابہ ہے۔

مراکش کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مغربی تمدن کے ساتھ یہاں کی معاشرت پر اسلامیت اور عربیت کی چھاپ نمایاں ہے۔

مراکش میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک قدیم استاد شیخ تقی الدین ہلالی سے بھی ملاقات ہوئی، ہلالی صاحب سے ہم نے، خاص طور پر ہمارے رفیق مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے عربی زبان و ادب کی تحصیل میں بہت استفادہ کیا ہے۔

جمعیة الجامعات کے جلسے سے پہلے مراکش کے تین شہروں کی سیاحت کا موقع ہمیں مل گیا، دار بیضاء (کاسابلانکا) سے مکناس جانا ہوا، یہ شہر اس ملک کا دینی اور روحانی مرکز ہے، موجودہ سلطنت کے بانی سیدی ادریس کا بھی یہ مرکز رہ چکا ہے، اس کے بعد فاس کو دیکھا، جو مراکش کا قدیم ترین تعلیمی مرکز ہے، یہاں جامع قروین ایک قدیم جامعہ ہے۔

اہل مراکش کا سادات و اہل بیت سے تعلق

مغرب (مراکش کو المغرب کہا جاتا ہے) کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق ہمیشہ اہل بیت سے رہا ہے، یہاں کے باشندے سادات اہل بیت کے معتقد ہیں، اور اس علاقہ کی حکمرانی کا انھیں حقدار و مستحق سمجھنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، یہاں کی قدیم قوم بربر جو طبیعت کی بڑی سخت اور ارادہ کی بڑی پختہ تھی، اس قوم کو فتح کرنے کے لیے زور بازو سے زیادہ روحانیت اور اخلاق کی ضرورت تھی، ان سادات میں یہ صفات تھیں، اور اسی سے متاثر ہو کر بربر حلقہ بگوش اسلام ہوئے، اہل مغرب کی سیاست اور عقیدت کا محور و مرکز ہمیشہ سے سادات رہے ہیں، موجودہ حکمراں شاہ حسن کا تعلق بھی چونکہ سادات سے ہے، اس لیے ان کے خلاف کی جانے والی ہر سازش کو ان سے اور ان کے خاندان سے والہانہ جذبہ نے ناکام کیا ہے۔

مراکش کے جن شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا، وہاں عوام میں دینی رجحان نظر آیا، مسجدیں آباد ملیں، دینی کتابوں اور اسلامی شخصیتوں سے یہاں کے لوگوں، خاص طور پر نوجوانوں کو واقف پایا، ہمیں مراکش پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ہماری کتابوں کی یہاں کثرت سے اشاعت ہوئی ہے، اور لوگ بخوبی واقف ہیں۔

استاد علال الفاسی کا ذکر

جمعیة الجامعات کے جلسہ سے پہلے ہماری سیاحت کے زمانہ میں استاذ علال الفاسی مرحوم کی برسی کے سلسلے میں یہاں ہفتہ منایا گیا، ملک کے مختلف مقامات پر ان کی یاد میں جلسے ہوئے، جن میں ان کی خدمات اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی، اور اپنے مرحوم رہنما کو خراج عقیدت پیش کیا گیا، استاد علال الفاسی مرحوم مراکش کے دینی و سیاسی رہنما تھا، میرا ان سے شخصی تعارف اس وقت ہوا جب وہ رابطۂ عالم اسلامی کے رکن منتخب ہوئے، رابطہ کے جلسوں میں ان کی نشست میرے قریب ہی رہا کرتی تھی، اس طرح مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، عرب علماء میں ہندوستان کی دینی علمی شخصیتوں اور تحریکوں سے ان سے زیادہ کوئی واقف

نہیں، خاص طور پر حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے وہ بہت متاثر تھے، خاص طور پر ان کی کتاب حجة الله البالغة کے وہ بہت زیادہ قائل اور ثناخواں تھے، ڈاکٹر اقبال کے کلام کا انھوں نے خاصا مطالعہ کیا تھا، اور اپنی تقریروں میں ان کے اشعار کا بکثرت حوالہ دیتے تھے۔ ان کی یاد میں منائے جانے والے ہفتہ کے اختتامی جلسے میں مجھے تقریر کی دعوت دی گئی تو میں نے ان سے قریبی تعلق کا حق سمجھتے ہوئے ان کی شخصیت اور خدمات پر اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں تقریر کی۔ (۱)

جمعية الجامعات الإسلامية کی میٹنگ ۱۱ر مئی ۱۹۷۶ء سے شروع ہوئی، اس میں سعودی عرب، شرق اردن، لبنان، ایران، شام، سوڈان، روس، ہندوستان، پاکستان، ترکی، عراق، تیونس اور مغرب کے علماء اور ماہرین تعلیم، غرض عالم اسلام اور دنیا کے مختلف مقامات کی اسلامی یونیورسٹیوں اور اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی، اس جمعیت کے صدر مراکش کے استاذ محمد الفاسی ہیں۔

جمعیۃ الجامعات کا مقصد

جمعية الجامعات کا مقصد عرب اور مسلم ممالک میں علوم اسلامیہ اور عربی زبان کی تعلیم کو ترقی دینا، اور دنیا کی تمام اسلامی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم اور اس کے فروغ کے سلسلے میں جو رکاوٹیں ہوں، انھیں دور کرنا، جو مسائل و مشکلات درپیش ہوں ان کے حل کی کوشش کرنا ہے۔

اس میٹنگ میں اس سلسلے میں کئی مفید تجاویز پر غور کر کے انھیں منظور کیا گیا۔

میں نے اب تک وہ شہر نہیں دیکھا تھا جس کے نام سے یہ پورا ملک معروف ہے، یعنی مراکش۔

جمعية الجامعات کے جلسوں کے بعد مراکش ایک دن کے لیے جانا طے تھا، لیکن جمعیت کے ذمہ داروں نے اس پر اصرار کیا کہ میں دو روز مراکش رہوں، کیونکہ دوسرے دن شاہ حسن والیٔ مراکش نے تمام مندوبین کو کھانے پر مدعو کیا تھا، اور شام کو ان سے خصوصی ملاقات کا پروگرام طے تھا، مراکش سے لندن آتے ہوئے واپسی کا پروگرام تھا، ٹکٹ بھی آ چکے تھے، اور لندن میں اپنے احباب کو آمد کی اطلاع بھی دی جا چکی تھی، مجھے مراکش ایک روز مزید قیام میں بڑا تردد تھا، لیکن لوگوں کے اصرار پر میں نے اسے قبول کیا، اور بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ قیام بہت مفید تھا، شاہ حسن سے ملاقات کے موقع پر مندوبین کی طرف سے ترجمانی اور خطاب کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی، میں نے مناسب

(۱) تقریر کے خلاصے کے لیے دیکھیے: دو ہفتے مغرب اقصی (مراکش) میں، شائع کردہ: مکتبہ فردوس، لکھنؤ، طبع دوم، ص: ۹۰-۹۱۔

الفاظ میں شاہ کی میزبانی کا شکریہ ادا کیا، اور ان کی دینی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔

تقریر دعوتی تھی، اور شاہ نے جوابی تقریر میں اچھے تاثر کا اظہار کیا، شاہ حسن فصیح علمی زبان بول رہے تھے، ان کی گفتگو اور تقریر سے اندازہ ہوا کہ ان کا مطالعہ وسیع اور متنوع ہے، دینی علوم پر بھی ان کی نظر ہے، انھوں نے اپنی تقریر میں حدیث کی متعدد روایات پڑھیں اور دین کے اخلاقی اور معاملاتی پہلوؤں کی طرف خاص طور متوجہ کیا۔

مراکش کا سفر ہر لحاظ سے مفید اور کامیاب رہا، اس سفر نے مجھے براعظم افریقہ کے اس قدیم اسلامی ملک پر اپنے مشاہدات وتاثرات قلمبند کرنے کی تحریک پیدا کی جو شاید جلد عمل میں آئے۔[1]

سوال: بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے سلسلے میں لندن کا سفر ملتوی کیے جانے کے بعد واپسی میں لندن میں چند روزہ قیام کے کیا اسباب تھے؟

جواب: مراکش سے واپسی کے موقع پر میں نے چند دن لندن میں قیام کیا، اس سے پہلے تین مرتبہ مجھے یورپ کے مختلف ممالک کے سفر کا اتفاق ہوا، اس موقع پر لندن میں کئی کئی ہفتے قیام بھی رہا، اس قیام کے دوران مجھے انگلستان کے مختلف اضلاع اور مرکزی مقامات کے دورے کا موقع ملا۔

دیارِ مغرب میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری

اس مرتبہ مجھے خاص طور پر اپنی آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں ڈاکٹروں سے مشورہ کے لیے بعض احباب نے لندن کے سفر پر اصرار کیا تھا، لندن میں ہندوستان و پاکستان اور دیگر مشرقی ممالک کے تقریباً دس لاکھ مسلمان آباد ہیں، یہاں کے بعض محلوں پر ہندوستان یا پاکستان کے کسی محلّہ کا شبہ ہوتا ہے، معاشرت، زبان، رہن سہن کا طریقہ، کھانے کا ذوق غرض سب کچھ مشرقی ممالک کی طرح، انگلستان کے مختلف مقامات پر بکثرت مسجدیں بن رہی ہیں، اور کئی اسلامک سنٹر قائم ہیں، بڑے بڑے دینی اور تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں، لوگوں میں اسلام سے دلچسپی اور اس کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو رہا ہے، غیر مسلموں کے قبول اسلام کے واقعات بھی نادر نہیں رہے، ایک دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی کہ گرجا مسجد بن رہے ہیں، غیر آباد گرجاؤں کو مسلمان انجمنیں خرید کر وہاں مسجد بناتی ہیں، اور عیسائی لوگ اس مقصد کے لیے گرجا فروخت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، یہ سب باتیں جہاں خوش آئند ہیں، تو اس کا دوسرا پہلو بڑا نازک ہے۔

---

(۱) یہ مشاہدات وتاثرات بعد میں کتابی شکل میں ''دو ہفتے مغرب اقصی (مراکش) میں'' کے عنوان سے مکتبہ فردوس، لکھنؤ سے شائع ہوئے۔

مجھے اس سفر میں انگلستان کے کئی شہروں اور لندن کے مختلف مقامات پر لوگوں سے خطاب کرنے کا موقع ملا، میں نے انھیں خصوصی طور پر اس اجنبی ملک میں ان کی نازک اور اہم ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی، میں نے انھیں کہا کہ آج سے صرف ۴۰ یا ۵۰ سال پہلے اگر کوئی بزرگ یہ پیشین گوئی کرتا کہ وہ انگریز قوم جن کے ہم آج غلام ہیں، ان کے ملک میں گرجا مسجد میں تبدیل ہو جائیں گے، اور وہاں مسلمان آزادی کے ساتھ اپنے دینی شعائر ادا کرسکیں گے، تو ہم اس بزرگ کی بزرگی سے انکار کردیتے، بدظن ہوجاتے اور مضحکہ اڑاتے، لیکن آج ہم اپنی آنکھوں سے یہ انقلاب دیکھ رہے ہیں کہ یہاں قلب یورپ میں مسجد بن رہی ہے، اور اتنی بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اب مسلمانوں پر یہ نازک ذمہ داری ہے کہ وہ ہر وقت اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ یہاں کے غیر مسلم باشندے ان کے اخلاق، معاملات اور معاشرت سے اسلام کی صحیح نمائندگی کریں، انسان کتاب سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا عملی نمونہ سے اثر قبول کرتا ہے، آپ کو اس ملک میں اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار و روایات کا امین و وارث بن کر رہنا ہے۔

ایک افسوس ناک بات جس کا کسی قدر اندازہ مجھے لندن کے گذشتہ سفروں میں بھی ہوا تھا، اس بار کھل کر ہوا، وہ یہ کہ بعض ناخدا ترس، ناعاقبت اندیش لوگوں نے مسلک وعقائد، فروعی مسائل اور دقیق کلامی بحثوں کو یہاں بھی چھیڑ دیا ہے، جو فروعی اختلافات اور دقیق کلامی بحثیں ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں باہمی نفرت و دشمنی کا سبب بن گئی ہیں، ان بحثوں کو اس اجنبی ملک میں بھی ہوا دی جارہی ہے، جہاں مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی شدید ضرورت ہے۔

عالم عربی کے مسلمانوں کا ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے تعلق ودلچسپی

سوال: برصغیر کے مسلمانوں کی یہ روایت رہی ہے کہ انھوں نے دنیا کے مسلمانوں کے درد وغم اور مسرت وخوشی میں ہمیشہ اپنے کو شریک سمجھا، کیا عالم عربی اور دنیا کے مسلم ممالک کے عوام بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں؟

جواب: آپ نے ایک اچھا سوال کیا، مسلم ممالک میں دینی لٹریچر نے یہ شعور پیدا کردیا ہے کہ وہ دنیا کے مختلف مقامات پر بسنے والے اپنے دینی بھائیوں کے مسائل ومشکلات سے باخبر اور فکرمند ہوتے ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے انھیں دلچسپی ہے، پہلے ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کے نقصانات سے انھیں تشویش رہتی تھی، اب مسلم پرسنل لا، خاندانی منصوبہ بندی، اور اس سلسلے میں مرکزی حکومت کی پالیسی اور خواہش کے علی

الرغم ہمارے ملک کی بعض ریاستوں میں خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں جس جبر اور ترہیب کا طریقہ اپنایا جارہا ہے، اس پر مسلم ممالک کے دانشور، علماء اور وہاں کی حکومت کے ذمہ داروں کو تشویش ہے، مجھ سے مختلف مسلم ممالک کے کئی بااثر حضرات نے اپنی فکر و تشویش کا اظہار کیا، ان لوگوں نے اس بات پر بھی اپنی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں بعض مسلم ممالک کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ وہاں بھی جبری نس بندی کا قانون ہے، اور مسلم پرسنل میں اس طرح ترمیم ہورہی ہے جس کا ہندوستان میں منصوبہ ہے۔

ان حضرات نے اس پروپیگنڈے کی پرزور تردید کی، دنیا کے دور دراز ممالک آج اس قدر قریب آگئے ہیں کہ ایک دوسرے کے صحیح حالات و واقعات سے کوئی بے خبر نہیں، دہلی کے ترکمان گیٹ کے حادثہ کے موقع پر میں وہیں تھا، پولیس کی فائرنگ اور شہریوں کے جان و مال کے نقصان کے واقعات کا وہاں خاصا چرچا تھا، اور عوام و خواص اپنے غم وافسوس اور فکر و تشویش کا اظہار کیا کرتے تھے۔

لبنان کے تشویشناک حالات

سوال: لبنان کے تشویشناک حالات کے سلسلے میں آپ کا کیا اندازہ ہے؟

جواب: مراکش میں جمعیۃ الجامعات کی میٹنگ میں لبنان سے تعلق رکھنے والے مندوبین سے ملاقات ہوئی تھی، ان کے مشاہدہ میں لبنان کی خانہ جنگی میں مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا، اور وہ عیسائی جنھوں نے عرصۂ دراز سے مسلمانوں کو دبا کر رکھا تھا، ان کا استحصال کرتے تھے، بڑی تعداد میں بھاگ کر قبرص میں پناہ لے رہے تھے، ان مندوبین کا خیال تھا کہ لبنان کی مسلمان اکثریت جلد ہی عیسائیوں کے مظالم و چیرہ دستی سے محفوظ ہوجائے گی، اور تقسیم لبنان کا منصوبہ بھی ناکام ہوجائے گا، لیکن شام کی مسلح مداخلت سے صورت حال بدلتی نظر آرہی ہے، شام کے دروزی حکمراں نے جو مسلمان نہیں ہیں، عیسائیوں کی مدد اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے اپنے ہزاروں فوجی بھیج دیے ہیں، لبنان کی صورت حال اب اس قدر پیچیدہ اور غیر یقینی ہوگئی ہے کہ اس کے بارے میں کوئی متعین رائے قائم کرنا بڑا دشوار ہے۔

دیارِ مغرب میں چند روز

حضرت مولاناؒ نے ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر سعید رمضانؒ کی دعوت پر جنیوا کے اسلامک سینٹر کے اجتماعات میں شرکت کے لیے یورپ کا سفر کیا۔ اس سفر میں جنیوا، لوزان، برن، پیرس، لندن، کیمبرج، آکسفورڈ، گلاسکو، ایڈمبرا، اسپین میں ٹولیدو (قدیم طلیطلہ)، سولہ (سابق اشبیلیا)، قرطبہ وغرناطہ بھی جانا ہوا۔ اس سفر سے ہندوستان واپس آنے پر ہفت روزہ ''ندائے ملت''، (لکھنؤ) کے نمائندے نے حضرت مولاناؒ سے اس سفر کے تأثرات کے متعلق یہ انٹرویو لیا، جو ہفت روزہ مذکور کی اشاعت ۱۵؍نومبر ۱۹۶۳ء سے ماخوذ ہے۔

''اسپین کو دیکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہاں مسلمانوں کے زوال میں قدرت کی طرف سے خدانخواستہ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی؛ بلکہ عالم اسباب کے اصولوں کے مطابق ہر وہ سلطنت تباہ ہو جائے گی جہاں افتراق اور خود پسندی کا راج ہوگا۔ آج بھی جس ملک میں انتشار و خلفشار نظر آ رہا ہے، وہ سب اسی لعنت کی بنا پر ہے۔''

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''ندائے ملت'' کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے مندرجہ بالا تأثرات اسپین کے تذکرہ کے دوران ظاہر فرمایا۔

اسلامک سینٹر کے پانچ بانیوں میں حضرت مولانا کے علاوہ جنوبی ہند کے مشہور فاضل ڈاکٹر حمیداللہ (مقیم پیرس)، ایران کے نامور نقاد، ادیب اور مؤرخ ڈاکٹر رضا زادہ شفق، مصر کے ادیب اور اخوانی رہنما ڈاکٹر سعید رمضان، افغانستان کے مدبر اور سابق سفیر حیدر بامات اور پاکستان کے مولانا ظفر احمد انصاری ہیں۔

اسلامک سینٹر اور اس کے مقاصد

مولانا نے اسلامک سینٹر، اس کے مقاصد اور طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ:

''اسلامک سینٹر کے دو بنیادی مقصد ہیں: ایک تو اسلام کے بارے میں مشنری اور مستشرق جو تحریریں شائع کرتے رہتے ہیں، ان کا جائزہ لیا جاتا رہے اور کوئی بات غلط فہمی کا نتیجہ یا غلط بیانی کا نمونہ سامنے آئے تو مناسب ازالہ کی کوشش کی جائے، نیز اسلام کے بارے میں جو شبہات مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو رفع کیا جائے۔''

مولانا نے فرمایا کہ ''اسلامک سینٹر کا دوسرا بنیادی کام ان بے شمار طالب علموں سے رابطہ پیدا کرنا ہے جو دیارِ مغرب میں زیرِ تعلیم ہیں اور ان کی ایک تعداد تعلیم پا کر دیارِ مغرب میں اقامت گزیں ہو چکی ہے۔ ان میں خاص طور پر سابقہ فرانسیسی نوآبادیات کے باشندے قابلِ ذکر ہیں۔

اقامت اختیار کرنے والوں نے ملازمتیں اختیار کرلی ہیں اور وہیں شادیاں بھی کرلی ہیں؛ لیکن ان کے اوپر اخلاقی، تہذیبی اور دینی کس مپرسی کا عالم ہے۔''

حضرت مولانا نے فرمایا کہ ''اسلامک سینٹر (جینوا) سے پہلے کوئی تنظیم ایسی نہیں تھی جو زیر تعلیم مسلم طلبہ یا اقامت گزیں مسلمانوں کے دینی مسائل کی فکر کرے۔ ورکنگ مشن وغیرہ کی قسم کے چند سلسلے یورپ میں مخصوص گروہی پروپیگنڈہ کررہے ہیں اور ان کا مطمح نظر غیر مسلم ہیں۔ دیارِ مغرب کے نوجوان طالب علموں اور اقامت گزیں مسلمانوں کے خاص حالات و مسائل ہیں، اسلامک سینٹر نے یہ کام سنبھال لیا ہے۔ وہ دینی مسائل، سماجی مسائل، حلال وحرام، مخلوط تعلیم، شادی بیاہ کے مسائل اور عام اسلامی موضوعات پر کتابچے شائع کرتا ہے، اس کا ترجمان ''المُسْلِمُوْن'' ایک منفرد دینی و علمی رسالہ ہے، جو عربی، انگریزی اور فرنچ میں شائع ہوتا ہے۔ اسلامک سینٹر کا کام عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اب اسپینی زبان میں بھی لٹریچر تیار کیا جارہا ہے۔

جینوا کے مرکز میں نماز باجماعت اور درسِ قرآن کا بندوبست ہے، اور صلاح مشورے کا دفتر قائم ہے، جہاں دیارِ مغرب میں زیرِ تعلیم مسلمان نوجوانوں کے صدہا خط آیا کرتے ہیں، اور روزانہ سیکڑوں نوجوانوں کو ان کے مسائل کا نفسیاتی اور فقہی پہلو سے جواب دیا جاتا ہے، خودِ ''المُسْلِمُوْن'' میں سوال وجواب کے تحت اس طرح کی الجھنوں میں دینی رہنمائی کی جاتی ہے۔

دینی اجتماع

مولانا نے فرمایا کہ ''اسلامک سینٹر میں میری آمد کے سلسلے سے ایک سہ روزہ اجتماع کیا گیا تھا، خاص دعوت ناموں پر فرانس، جرمنی اور یوگوسلاویہ سے نوجوان جینوا آئے تھے۔ بعض نے موٹروں کے ذریعہ سفر کیا۔ مرکز میں ہمہ وقتی دینی فضا، نماز اور اذان، شریعت کی پابندیوں کا اہتمام دیکھ کر ان پر بڑا اچھا اثر پڑتا رہا اور انھوں نے واپسی کے بعد جو خطوط لکھے، ان میں اجتماع میں شرکت سے ذہنی اور روحانی فائدہ پہنچنے کا اعتراف کیا۔ دیارِ مغرب کی گمراہیوں اور انحراف کے درمیان، یہ اجتماع دل و دماغ کو نئی حرارت اور روشنی عطا کرنے والا ثابت ہوا۔

جینوا کے اسلامک سینٹر میں پانچ کارکن رہتے ہیں۔ ان کے سرکردہ جزیرہ ماریشس کے رہنے والے محمد راجا ہیں۔ ایک عرب تحیی سلمہ باسلام اور سوڈان کے سابق جج عثمان ہیں، جو عربی

اور انگریزی میں بڑی مہارت کے مالک اور ذی علم آدمی ہیں۔ سوڈان کے ایک اور مسلمان بھی وہاں محکمہ تعلیم کے ایک ذمہ دار عہدے سے سبکدوش ہو کر اپنی زندگی کو اس کام میں لگانے یہاں آرہے ہیں۔"

اندلس میں

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے دیارِ مغرب کے بعد سرزمین یورپ پر عربوں کی تہذیب و تمدن کے مفتوح قلعہ اندلس کے سفر کا ذکر فرماتے ہوئے کہا کہ "وہاں جانے کے بعد میری طبیعت بے حد متاثر اور اداس ہو گئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے تحریر کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے ہر مقام سے کئی کئی خط لکھے؛ لیکن غرناطہ سے ایک خط لکھنے کے بعد، اندلس کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے طبیعت آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی۔"

"اسپین میں آج بھی مشرقیت اور عربیت کے آثار ہیں۔ چہروں پر یورپ کا پھیکا پن نہیں، مشرقی ملاحت کا اثر باقی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ جنرل فرانکو عرب دوست ہے، گو ملک میں مسلمانوں کے خلاف قدیم عصبیت کا زور باقی ہے، مجریط اور قرطبہ میں عرب ممالک اور مصر کے تہذیبی ادارے قائم ہو گئے ہیں، جو "محاضرات في الدراسات الإسلامية" کے نام سے اندلس کی قدیم اسلامی تاریخ کی سمت توجہ دلاتے ہیں۔ ان کے ناظم ڈاکٹر حسین مؤنس، اندلس کی تاریخ اور ادبیات کے ماہر ہیں۔ ابھی حال ہی میں قرطبہ میونسپلٹی کے تعاون سے مشہور اندلسی عالم علامہ ابن حزم اندلسی کی نو سو سالہ یادگار کا جشن منایا گیا، جس میں محاضرات کے ارکان کے علاوہ، یورپ کے مستشرقوں نے شرکت کی۔

قرطبہ میونسپلٹی کے چیرمین، "محاضرات في الدراسات الإسلامية" اور یونیورسٹی کے پروفیسروں نے اس جشن کی یادگار کے طور پر علامہ ابن حزم کا ایک مجسمہ نصب کرنے کی تجویز پہلے مسجد قرطبہ میں رکھی، بعد میں پوپ کے اعتراض پر وہاں نصب کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ پوپ کا کہنا تھا کہ گرجا میں کسی مسلمان کا مجسمہ نصب نہیں ہو سکتا۔ مسجد قرطبہ کے اندر نماز پڑھنے کی آج بھی اجازت نہیں ہے، اور معلوم ہوا کہ مسجد میں موجود پانچ گرجاؤں کو مسجد کے باہر بنانے کے لیے پوپ نے حکم دے دیا ہے، پوپ کے اعتراض کے بعد علامہ ابن حزم کے اس مجسمہ کو "باب اشبیلیہ" پر نصب کیا۔ یہ ایک ایسی بدعت ہے جس سے احتراز واجب تھا اور کم از کم مسلمانوں کی

جانب سے اس کی پرزور مخالفت لازم تھی۔اہل یورپ کے نزدیک کسی بڑے آدمی کا یادگاری مجسمہ نصب کرنا اس کی تعظیم واحترام ہے؛ لیکن یہ اسلامی اعتبار سے ہرگز جائز نہیں، اور اسلام میں اس کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔

فنِ تعمیر

اندلس کی مشہور تعمیرات، قرطبہ کی جامع مسجد اور غرناطہ کا قصر الحمراء دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ان کی خوبصورتی کے مقابلے میں نفاست کے اعتبار سے تاج محل فائق تر ہے؛ لیکن تناسب، استحکام اور باوقار سنجیدگی کے لحاظ سے ان دونوں کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے۔

''مدینۃ الزہراء'' کے کھنڈر بھی دیکھے، جو اَب چھوٹے سے رقبہ میں ہیں۔ یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ تھا، جب وہ آباد و شاداب تھا، تو اس کے اندر جو حوض تھے، ان کی مچھلیوں کے لیے روزانہ بارہ ہزار روٹیوں کا راتب مقرر تھا۔ بادشاہوں کے اصراف بے جا اور اپنی یادگار اور نام ونمود کے قیام کے جذبہ کی طرح، یہ خوبصورت عمارتیں آخر زوال وفنا کا شکار ہوئیں اور ویران ہوگئیں۔ان کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ کتب خانہ ایسکوریال دیکھنے کا موقع نہیں ملا، جہاں ایک بحری جہاز سے لوٹی ہوئی عربی کتابوں کا ذخیرہ ہے اور بعض بہت نایاب نسخے محفوظ ہیں۔

سفر یورپ کے تاثرات

مولانا نے فرمایا: ''میں عرصے سے یورپ کے ایک سفر کی ضرورت محسوس کرتا تھا، کیونکہ میرے علمی کاموں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کے لیے صرف کتابی مطالعہ کافی نہیں۔ میں یورپ کی تہذیب اور زندگی کی روانی اور حرکت کا قریبی مشاہدہ کرنے کا خواہش مند تھا۔ مرکز اسلامی کی دعوت کو میں نے اسی لیے قبول کیا، ورنہ صرف مرکز اسلامی کے اجتماع میں شرکت کے لیے شاید میں یہ سفر نہ کرتا۔ یورپ کے اس سفر سے مجھے خاطر خواہ علمی بلکہ دینی فائدہ ہوا۔''

مولانا نے سفر یورپ کے تأثرات کا ماحصل یہ بیان فرمایا کہ ''یورپ اور مسیحیت کے بارے میں سابقہ تصور کی تصدیق ہوئی، اور اسلامی طرز زندگی کے موافق تأثرات اور خیالات میں مزید استحکام پیدا ہوا۔ یورپ میں مشینوں نے احساس مروت کو واقعی کچل کر رکھ دیا ہے، اور زندگی وہاں اس قدر تیز رفتار بنا دی گئی ہے کہ باطنی طلب اور خلش انسانوں میں نظر نہیں آتی۔ ہر شخص نے

ہفتے کے پانچ دن اپنے پیشے میں مشغولیت اور محنت کے مقرر کر رکھے ہیں، اور دو دن تفریح کے نام پر عیاشی اور بدمستی کے۔ پیشہ ورانہ مصروفیت ہو یا تفریح، ان کے انہماک اور ان کی توجہ کا حال یہ رہتا ہے کہ وہ کچھ اور سوچتے ہی نہیں۔ یورپ میں اہل فکر کا ایک چھوٹا سا حلقہ ضرور ہے، جو بنیادی سوالات اٹھاتا ہے، ان پر غور کرتا ہے اور کتابیں لکھتا ہے؛ لیکن یہ کتابیں ایک محدود حلقہ تک رہتی ہیں، اور عام انسان ان کتابوں اور ان کے ذریعہ اٹھائے گئے بنیادی مسائل سے بے خبر رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اہلِ فکر وہاں سماج سے بالکل الگ ہو کر رہ گئے ہیں۔"

مستشرقین سے ملاقات

مولانا نے فرمایا کہ "ہماری ملاقات یورپ کے بعض مستشرقین سے بھی ہوئی۔ ہم نے ان کے اندر علم اور عمل کا واضح تضاد پایا۔ ان کی زندگی میں ان کے وہ افکار و خیالات، جن کو وہ اپنی کتابوں کے ذریعہ پیش کرتے ہیں، کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ شاید یہی سبب ہو کہ ان سے مل کر نہ صرف یہ کہ ہم متأثر نہیں ہوئے، بلکہ مایوس ہوئے۔"

انگلستان

مولانا نے فرمایا کہ "انگلستان کی ایک بات جس سے مجھے دلچسپی تھی، وہ یہ کہ ہندوستان کے ہاتھ سے نکل جانے کا اثر یورپ والوں پر کیا پڑا ہے؟

میرا پہلا تأثر تو یہ ہے کہ جس سلطنت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، اس کے خاتمہ نے اہل برطانیہ کی حوصلہ مندی، مستعدی اور خوش باشی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ حالات کا خندہ پیشانی سے سامنا کرنے کی یہ جرأت قابل تعریف ہے۔ پھر بھی احساس ہوتا ہے کہ اس قوم کا اقبال رخصت ہو گیا ہے۔ یہ سر برہنہ ہو چکی اور اب حاکم قوم کی شان اور اطوار ان میں محسوس نہیں ہوتے۔"

نئے وزیر اعظم کے متعلق مولانا نے فرمایا کہ "لندن میں ان کو "مسٹر میکملین" کا کوئی اچھا جانشین نہیں کہا جا رہا؛ بلکہ ان کے ماضی کو خدمات اور کارناموں سے خالی کہا جا رہا ہے۔"

یورپ کے علمی کتب خانوں کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"برٹش میوزیم کے کتابی ذخیرے میں بہت کچھ کام کی کتابیں ملیں۔ یہاں سلطنت برطانیہ سے شائع ہونے والی ہر مطبوعہ کتاب موجود ہے، اور ڈیڑھ دو سو سال سے کوئی کتاب کتب خانے سے باہر نہیں گئی۔ حد یہ ہے کہ برطانیہ کے وزیر اعظم بھی کوئی کتاب نہیں نکلوا سکتے۔ کبھی ایک کتاب

گم ہوگئی تھی، جب سے یہ سختی ہے۔ ہندوستان سے متعلق کتابوں کا بہتر ذخیرہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے؛ لیکن اب اس کے اہتمام و نظم میں ایک بے دلی سی پائی جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان اس کتب خانے کی واپسی کا جو دعویٰ کر رہا ہے، اس کو تامل اور ٹال مٹول کی پالیسی کے باوجود برطانوی حکومت نے اصولی طور پر درست مان لیا ہے۔"

مولانا نے فرمایا کہ "پیرس میں ببلوتیک نیشنال کا ذخیرہ بھی قابل دید ہے۔"

انگریزوں کی قدامت پرستی

انگریزوں کی قدامت پرستی کے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

"انگریزوں کی قدامت پسندی بھی ایک نمایاں صفت ہے، تخت نشینی کی ساری پرانی رسمیں، واہمے اور تعلیمی نظام کی اولین روایات قائم ہیں، اور اخلاقی زوال کے سامان حسب دستور معاشرے پر مسلط ہیں۔ شراب نوشی اتنی عام ہے، جس کا یہاں سے اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بے حجابی اور وہ سب برائیاں جو معاشرے کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں، علیٰ حالہ برقرار ہیں؛ بلکہ ان میں اور اضافہ ہو رہا ہے۔

جو عام ہندوستانی، پاکستانی باشندے وہاں ہیں، وہ چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں، مگر انگریزوں کی طرح ہفتے میں دو دن چھٹی نہیں مناتے؛ بلکہ ان دنوں میں بھی پیسہ کماتے ہیں۔ انگریز یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آدمی مسلسل کام کیسے کر سکتا ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ دو دن کی چھٹی کے بغیر وہ بقیہ دنوں میں کام کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نچلے طبقہ کے ملازموں میں ہندوستانی انگریز سے زیادہ پیسے پیدا کر لیتا ہے۔"

ہمارے نوجوان

مولانا نے یورپ میں زیر تعلیم ہندوستانی طالب علموں کے بارے میں اپنا یہ تأثر بیان فرمایا کہ "وہ ہندوستان میں تعلیم پانے والے طلبہ سے زیادہ مغربی ماحول میں تعمیری صفات رکھنے والے نظر آئے۔ وہ زیادہ متین، محنتی ہیں، اور ان میں ایک طلب ہے، اور اکثر و بیشتر طلبہ میں مغربی ماحول کے ردعمل سے دینی جذبہ شدت سے بیدار ہو گیا ہے۔"

عرب طالب علم

مولانا نے فرمایا کہ "عرب نوجوانوں میں عرب قومیت کے نعرے کا اثر پایا جاتا ہے؛ لیکن

ایک بڑی تعداد عرب قومیت کی انتہا پسندی سے متفق نہیں۔ ہمارا رابطہ جن نوجوانوں سے رہا، وہ قومیت کو نہیں، اسلام کو اپنی فکر کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

ناصریت اور بعثیت کی کشمکش کے متعلق ان کا عام تأثر دونوں سے بے اطمینانی اور ناگواری کا ہے، اور جن نوجوانوں نے بعثیوں کی فکر و عمل کا تجربہ کیا ہے، وہ اس کو ناصریت سے بھی زیادہ مہلک تصور کرتے ہیں۔

اس زمانے میں الجزائر اور مراکش کا تصادم عرب نوجوانوں کے لیے بے حد شرمندگی کا باعث ہوا۔ ان کو اس بات پر اور بھی ندامت ہوتی تھی کہ مولائے حسن اور صدر بن بیلا کے درمیان مصالحت کا فریضہ حبش کے شہنشاہ ''ہیل سلاسی'' نے انجام دیا جو حبشی مسلمانوں سے ناانصافیوں اور اریٹیریا اور صومالیہ کے مسلمانوں پر ظلم ڈھانے کی وجہ سے افریقہ میں انتہائی بدنام ہے۔''

جلاوطن الجزائری

مولانا نے بڑے تأسف سے ان دو ڈھائی لاکھ الجزائریوں کا تذکرہ کیا جو فرانس کے حامی تھے، اور آزادی کے بعد ان کو الجزائر کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب وہ فرانس میں ہیں اور ان کا مستقبل تاریک ہے۔ ان کے بچے عربی اور اسلامی تعلیم سے محروم ہو کر فرانسیسی اسکولوں میں مسیحی تعلیم پا رہے ہیں۔

ظاہر ہے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ ہندوستان آزاد ہوا تو انگریزی اقتدار کی فوج کے عملے کو کسی طرح کی تفریق کا شکار نہیں بنایا گیا۔ الجزائر کو بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا تھا، یا اب تلافیٔ مافات کرنا چاہیے، ورنہ اس بات کا خطرہ ہے کہ ان کی آنے والی نسل ارتداد کا شکار ہو جائے۔

واپسی

مولانا نے فرمایا کہ ''واپسی میں ''شام'' میں تھوڑی دیر رکنے کا ارادہ تھا؛ لیکن وہاں کے حالات بڑے غیر یقینی تھے، اور ہماری واپسی سے شاید دو دن پہلے ہی سرحد پر گولیاں چل چکی تھیں۔ پھر ہم نے یہ بھی سوچا کہ وہاں اپنے دوستوں سے ملنا، نہ ہمارے بس میں ہے اور نہ ان کے اختیار میں، اور اس ملاقات کا ان پر برا اثر بھی پڑ سکتا ہے، کیونکہ ہمارے افکار اور نظریات عالم اسلام میں کوئی ڈھکے چھپے نہیں۔''

ہمارے نمائندے نے مولانا سے پاکستان کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔

مولانا نے فرمایا کہ ''کراچی میں میرا تمام وقت صرف عزیزوں اور دوستوں سے ملنے میں گزرا؛ لیکن اس بے تعلقی کے باوجود میرا چھچھلتا ہوا اندازہ یہ ہے کہ وہاں سیاسی حالات میں استحکام نظر نہیں آتا اور کسی وقت بھی کوئی خبر آسکتی ہے۔''

حضرت مولانا علی میاں ندوی ۹ر نومبر کو کراچی سے روانہ ہو کر ۱۰ر نومبر کی صبح کو بعافیت لکھنؤ تشریف لے آئے، اور مولانا نے اسی دن ندوہ میں ہونے والے تبلیغی اجتماع کو بعد مغرب خطاب بھی فرمایا۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی، شیخ حسن البنا شہید، علامہ اقبالؔ اور مولانا مودودی کے بارے میں تأثرات

تیسری عالمی سیرت کانفرنس محرم ۱۴۰۰ھ/نومبر ۱۹۷۹ء میں دوحہ (قطر) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں حضرت مولاناؒ نے بھی شرکت کی تھی۔ اسی موقع پر ایک پاکستانی صحافی ''زاہد عباسی'' نے حضرت مولاناؒ سے ایک تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ہفت روزہ ''انقلاب''، مظفرآباد (پاکستان) میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو کی یہ صرف دوسری قسط ہی دستیاب ہوسکی، جو ہفت روزہ مذکور کی اشاعت بابت ۷/اپریل ۱۹۸۱ء سے ماخوذ ہے۔

سوال: دوسرا سوال، ندوی صاحب! میں آپ سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ چودہویں صدی میں بہت سے مسلم اسکالر ہیں، جنہوں نے دنیا کے مختلف گوشوں میں خدا کے دین کے لیے کام کیا ہے، اور برصغیر ہند و پاک بھی ان سے خالی نہیں، صوفیائے کرام ہیں، علمائے کرام ہیں، جن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبالؔ بھی ہیں، جن کا تعلق مشرق سے ہے، اور ہماری سرزمین سے ہے؛ میں دنیا بھر کے آئے ہوئے لوگوں سے ان کے بارے میں رائے جاننا چاہتا تھا کہ دنیا کے مفکرین اور اسلام کے محققین، اسلام کے ان دو عظیم میناروں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

علامہ اقبالؔ کا آپ نے اپنی تقریر میں بھی ذکر فرمایا تھا، اور آپ بھی اقبالؔ کے چاہنے والوں میں سے ہیں، اور اقبالؔ کے پڑھنے والوں میں؛ بلکہ ان پر بہت کچھ لکھنے والوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے، تو آپ کیا فرمائیں گے اس سلسلے میں، چودہویں صدی ہجری کی کون سی عظیم ہستیاں ہیں؟ خصوصاً ان دو ہستیوں کے بارے میں آپ کے کیا تأثرات ہیں؟

جواب: آپ نے بڑا نازک سوال کیا ہے، اس میں بالکل مخلصانہ اور اپنے یقین اور اندرونی جذبات کے متعلق بات کہنا بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر آپ صفائی کے ساتھ پوچھنا چاہتے ہیں، تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس صدی میں میرے نزدیک یعنی مجھ پر جن شخصیتوں کا اثر ہے، کہ انہوں نے بہت ٹھوس کام کیا، اور انہوں نے انقلاب انگیز تحریک پیدا کی، اور ایسی جماعتوں کی تشکیل کی کہ جو اسلام کا جو وسیع مطمح نظر ہے، اور اس کا نقشۂ کار ہے، اس کے متعلق کام کیا، تو ذاتی طور پر اپنی ذمہ داری ہے۔ آپ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ ہر ایک آدمی کا ہر ایک آدمی سے متأثر ہونا ضروری نہیں، اس تأثر کے خاص اسباب ہوتے ہیں، کوئی مناسبتیں ہوتی ہیں، کوئی ذاتی مطالعہ ہوتا ہے، کچھ اس سے قریب رہنے کے مواقع ہوتے ہیں، تو میں دو شخصیتوں سے بہت متأثر ہوا ہوں، جنہوں نے جماعتوں کی تربیت کی اور انہوں نے زندگی پر اثر ڈالا۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی

ایک مولانا الیاس دہلویؒ جو تبلیغی تحریک کے بانی ہیں، ان کی عہد جدید کی تمام مروجہ تنظیم کے طریقوں سے بالکل بے نیاز ہوکر اور جو زمانے کے معیار اور پیمانے ہیں، ان سے بالکل الگ رہ کر انھوں نے اتنے بڑے رقبے میں اثر ڈالا ہے اور ایسی جماعت پیدا کی ہے جو مشرق سے مغرب تک اس وقت حرکت میں ہے، اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں آدمیوں کی زندگی بدل گئی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور عقیدہ ہے کہ لاکھوں آدمیوں کی زندگی بدل گئی ہے اور ان کے اندر وہ دینی جذبہ اور روح پیدا ہوگئی ہے جو قرون اولی کی یاد دلاتی ہے۔

شیخ حسن البنا شہید

دوسری شخصیت جس کا اسلامی جدوجہد کا تصور اور اسلامی انقلاب کا تصور بڑا وسیع اور ہمہ گیر تھا، اور جس نے پڑھے لکھے طبقہ کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا، وہ امام شہید امام حسن البنا مصریؒ ہیں۔ انہوں نے بھی مشرق وسطی میں جو ایک ذہنی اور دینی انقلاب پیدا کیا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اس کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ میرا مصر میں اپنے طویل قیام کے دوران، مجھے ان کی اخلاقی کوششوں اور انقلابی کوششوں کے اثرات کو قریب سے دیکھنے کا خاصا موقع ملا، اور میں نے دیکھا کہ مصر کے جیسے پیچیدہ اور نازک ماحول میں، معاشرے میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کیا، اور ایک ایسی قوم کو، جو مغربی تہذیب سے بالکل مسحور ہو چکی تھی، اور اس کے قوائے عمل بالکل سرد ہو چکے تھے، اس میں کیسے انہوں نے نوجوان پیدا کر دیے ہیں اور اقبالؔ کے مصرع کے مطابق کہ ''کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر'' پیدا کیا۔

علامہ اقبالؔ اور مولانا مودودی

ان دو کے بعد ذہنی اور فکری طور پر جس سے بہت زیادہ متاثر ہوں، وہ علامہ اقبالؔ ہیں۔ اگر آپ نے میری کتاب ''نقوش اقبال'' پڑھی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں اقبالؔ سے کتنا متاثر ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اور جو جو حضرات ہیں، خود مولانا مودودی ہیں کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں انیس بیس کا فرق ہوتا ہے، یعنی وہ جن مآخذ سے کام لیتے ہیں، وہ میرے سامنے ہیں، اور میرے ایسے بہت سے لوگوں کے سامنے ہے، جو عربی زبان سے براہ راست واقف ہیں۔

میں ان کا جوہر یہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے دینی حقائق کو ایک نئے اسلوب اور نئی زبان میں، اور ایک دل نشیں انداز میں اور عصری انداز میں پیش کیا، تو ان کا جو اصل کارنامہ ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے دینی حقائق اور اسلام کے زمانۂ حاضر کی قیادت کرنے کی صلاحیت کو بڑے کامیاب اور بڑے دلکش انداز میں پیش کیا، اور جو مسلمان نوجوان طبقے کے دلوں میں اسلام کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہوگئی تھی، اور ان کے ذہن میں یہ بات جم گئی تھی کہ اسلام نے کسی زمانہ میں بڑا مفید کام دیا تھا، خدا اس کا بھلا کرے، اس کے کام کرنے والوں کو جزائے خیر دے، کہ وہ ایک ایسے پسماندہ ماحول میں اور ایک پچھڑے ہوئے زمانے میں، جب تمدن اور علم اپنے گویا طفولیت میں تھا، تو کچھ مفید اصلاحی کام سرانجام دیے، مثلاً لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا، بت پرستی تھی، بہت بھدی قسم کی بت پرستی تھی، عورت کے کوئی حقوق نہیں تھے، اس کا کوئی احترام نہیں تھا، معاشرے میں انسانی جان و مال محفوظ نہیں تھے، اس زمانے میں اسلام نے مفید کام انجام دیا، گویا وہ ایک کڑی ہے، دنیا کی اصلاحی طویل زنجیر کی ایک کڑی ہے، اور وہ کڑی مفید بھی ہے اور ضروری بھی، لیکن اب عہد حاضر کے لیے اس کا کوئی پیغام نہیں ہے۔ تو مولانا مودودی کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس اعتماد کو بحال کیا، اور اسلام کے متعلق یہ خیال تھا کہ Spent Force ہے یا ایک ایسا ٹارچ ہے، جس کے سیل ختم ہو گئے ہیں، یہ بات نہیں ہے، بلکہ وہ ٹارچ اب بھی، اس کے اندر تازہ سیل بھرے ہوئے ہیں، اور وہ دنیا کو روشن کر رہے ہیں۔ لیکن میں ان کی تحریروں کو پڑھ کر مرعوب نہیں ہوتا، اس لیے کہ میرا تھوڑا بہت اشتراک ہے ان چیزوں میں جو چھوٹے بڑے میں ہوتا ہے، بہرحال ان کے مقابلے میں ایک طالب علم ہوں، لیکن بہرحال ان مآخذ سے واقف ہوں، قرآن و حدیث کا میں نے بھی مطالعہ کیا۔ تو میں صرف متأثر ہوں کہ ایک چیز کو وہ ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا نئے انداز میں وہ چیز پیش کی گئی۔

لیکن جب میں علامہ اقبالؔ کا کلام پڑھتا ہوں، تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی اور دنیا کی باتیں ہیں، اور یہ کچھ ایسے واردات ہیں کہ ایک شخص کی اندرونی کیفیت ہے، عشق کی کیفیت ہے، اور اس کی سطح کچھ اور ہے، تو اقبالؔ کے کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اور عالم سے کوئی چیز آرہی ہے، اور اس میں ان کے قلب پر ورود ہو رہا ہے، اور اس میں شریک نہیں ہوں، یعنی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اور دنیا کی بات ہے، وہ بات خاص علماء کے، مولانا آزاد ہیں، مولانا مودودی ہیں، سید جمال الدین افغانی ہیں، شیخ محمد عبدہ ہیں، ان لوگوں کی کتابیں پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہم سے

زیادہ ذہین، ہم سے زیادہ قابل ہیں، اوران کو مثلاً زبان پر زیادہ قدرت ہے، تحریر پر زیادہ قدرت ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ بالکل الگ ہی قسم کی چیز ہے، لیکن اقبالؔ کے ہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل نئی قسم کی چیز ہے، یہ فرق ہے!۔

اور میں نے مولانا مودودی کے انتقال پر جو ''مضمون تعمیر حیات'' میں لکھا تھا، [1] وہ میں آپ کو بھی پیش کروں گا، اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں ان کو کیا مقام دیتا ہوں، اوران کے کمالات کا کتنی فراخ دلی سے اعتراف بھی کرتا ہوں، اس کے ساتھ ساتھ مجھے ان کی دینی تعلیم سے تھوڑا سا اختلاف بھی ہے، یعنی ان کی دینی تعلیم میں یہ عنصر غالب آ گیا ہے کہ خدا کی حاکمیت کا، تو گویا یہی نقطہ مرکزی ہے اور خدا حاکم ہے، اور باقی جتنی صفات ہیں اس کی، گویا ثانوی درجہ کی ہیں، اس سے مجھے اختلاف ہے، چنانچہ میں نے ایک مستقل کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے نام سے لکھی ہے، اس کے ساتھ میں ان کی ذہانت اوران کی دینی حقائق کو پیش کرنے کے سلیقے اور قدرت کا پورا اعتراف کرتا ہوں، اوراس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ صرف برصغیر پاک وہند ہی میں نہیں، بلکہ مشرق وسطی کے بھی ہزاروں نوجوانوں کے دل میں انھوں نے اسلام کا اعتماد بحال کردیا، اوران کا نقطۂ نظر اس کے بارے میں بدل گیا۔ وہ اسلام کو بالکل ایک ماضی سمجھنے لگے تھے، وہ بات جاتی رہی، اور وہ اب سمجھ رہے ہیں کہ اسلام زمانے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ زمانے سے آگے بھی ہے۔

(۱) یہ مضمون ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵/ستمبر ۱۹۷۹ء) میں شائع ہوا تھا، اب ''پرانے چراغ'' حصہ دوم میں شامل ہے۔

رابطہ عالم اسلامی-خدمات واقدامات

رابطہ عالمِ اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۶۵ء) میں شرکت کے لیے روانگی سے قبل حضرت مولاناؒ و مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے یہ انٹرویو ہفت روزہ ''ندائے ملت''، (لکھنؤ) کے نمائندہ نے لیا، اور ہفت روزہ مذکور کی اشاعت بابت ۲۶ / مارچ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

رابطہ عالم اسلامی کا قیام

''ندائے ملت'' کے نمائندہ خصوصی نے مولانا علی میاں اور مولانا نعمانی سے ایک انٹرویو میں یہ جاننا چاہا کہ رابطہ عالم اسلامی، جس کے ہندوستان سے صرف آپ دو حضرات رکن اساسی ہیں اور جس کی میٹنگ ۲۷/مارچ سے ہو رہی ہے، اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور رابطہ کی مؤتمر جو ۱۵/اپریل سے منعقد ہوگی، اس کا مقصد اور اس کی حیثیت کیا ہے؟

مولانا علی میاں نے فرمایا کہ: ''سب سے پہلے ہم لوگوں کی روانگی ہی کا مسئلہ ہے، جو ابھی طے نہیں ہے، کیونکہ (پی فارم) جو انٹرنیشنل پاسپورٹ کے ذریعے غیر ممالک کا سفر کرنے والوں کے لیے ضروری ہے، وہ حاصل نہیں ہوا ہے، اور ہمیں بار بار کا تجربہ ہے کہ اس کے حصول میں کس درجہ زحمتیں اور کس قدر صبر آزما انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

نمائندہ نے دریافت کیا کہ ''کیا خدانخواستہ اس کا بھی امکان ہے کہ آپ حضرات یہ سفر ملتوی فرمادیں؟''

مولانا نعمانی نے فرمایا کہ ''ہم لوگوں نے اپنے طور پر اب تک یہی طے کیا ہے کہ اگر پی فارم کے حصول میں اتنی تاخیر ہوئی جس سے ہم ۲۷/مارچ کو مکہ معظمہ نہ پہنچ سکیں، تو ہم شاید یہ سفر ملتوی کردیں؛ لیکن آپ ہمارے سفر کے اِلتوا اور عدمِ اِلتوا سے قطع نظر جو کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ معلوم کرلیجیے!''

نمائندہ نے مولانا علی میاں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

جواب میں مولانا علی میاں نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ ''رابطہ عالمِ اسلامی اور اس کی مؤتمر (یا رابطہ کانفرنس) دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی ایک مستقل تنظیم ہے، جس کا قیام ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء عمل میں آیا تھا۔ اس کا مقصد ایشیا، افریقہ اور یورپ کے

مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوت اور دینی و مذہبی امور پر باہمی تعاون کو فروغ دینا ہے، اور اس کے ارکان اساسی مستقل طور پر نامزد ہیں، جن کو ہر سال اجلاس کے موقع پر رابطہ اپنے اخراجات پر بلاتا ہے، چنانچہ ہمارے سفر کا بندوبست بھی رابطہ ہی نے کیا ہے۔"

مولانا علی میاں نے فرمایا: "یہاں یہ واضح کر دوں کہ اس سے پہلے دو بار رابطہ کے جلسوں میں میں نے شرکت کی ہے؛ لیکن میں مدینہ یونیورسٹی کے دعوت نامہ پر وہاں گیا تھا، اور دونوں بار میرے سفر کے اخراجات مدینہ یونیورسٹی نے اٹھائے تھے۔

رابطہ کے اہتمام میں ہر پانچ سال بعد حج کے موقع پر عالم اسلام کے نمایاں افراد، علماء اور رہنماؤں کو ایک موتمر میں بھی مدعو کیا جاتا ہے، اس مؤتمر میں جس کا اجلاس اب کی بار ۱۵؍اپریل کو ہو رہا ہے، ہر اسلامی ملک سے تین نمائندے مدعو کیے گئے ہیں۔ اس میں رابطہ کے مستقل ارکان، اسلامی تنظیموں کے سربراہ اور علماء بھی شامل ہوں گے۔ ہندوستان سے ایک سرکاری وفد بھی مؤتمر میں شرکت کرنے کے ارادے سے جا رہا ہے۔"

رابطہ کی مستقل سرگرمیاں

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کہا کہ "جہاں تک رابطہ عالم اسلامی کا تعلق ہے، وہ مستقل سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے، اور مختلف ممالک کے دینی اور تبلیغی اداروں کی امداد و معاونت کرتا ہے۔

رابطہ نے افریقہ میں اسلام کی تبلیغ پر خاص توجہ کی ہے، اور افریقہ کی کئی زبانوں میں قرآن شریف کے مستند ترجمے کرا رہا ہے، افریقی مسلمانوں کی دینی تنظیموں اور علماء کو رابطہ نے اسلام کی تبلیغ و تعلیم کے سلسلہ میں مفید مدد دی ہے۔

رابطہ انگریزی زبان میں قرآن شریف کا ایک مستند ترین ترجمہ جرمن نومسلم عالم محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ویس) سے کرا رہا ہے۔ اس کی پہلی جلد جو گیارہ پاروں پر مشتمل ہے، شائع ہو چکی ہے۔ جاپانی زبان میں بھی رابطہ نے ایک ترجمہ جاپانی فاضلوں کی خدمات حاصل کر کے کرایا ہے۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ "اگر تبلیغی اور تعلیمی امور میں عالم اسلام کے ادارے رابطہ سے امداد لینا چاہیں تو اس کا بڑا امکان ہے، ایک تو مکہ معظّمہ کو مرکزی اور مقدس عظمت حاصل ہے، دوسرے ہر سال حج کے موقع پر عالم اسلام کے نمایاں صاحب اثر افراد کے درمیان مشترکہ

دینی اہمیت کے مسائل پر تبادلۂ خیال اور تعاون سے تعمیری کام کے بڑے مواقع نکل سکتے ہیں۔‘‘

مؤتمر کی افادیت

نمائندہ ’’ندائے ملت‘‘ نے اس سلسلے میں مختلف ممالک میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنسوں کی افادیت کے متعلق بھی سوال کیا، جو مختلف انجمنوں کے تحت خصوصیت سے ادھر دو سال کے اندر منعقد ہوئی ہیں۔

اس کے جواب میں دونوں حضرات نے وضاحت کی کہ ’’ایسے اسلامی اجتماعات کی افادیت میں کوئی شک نہیں ہے، اور دنیا میں اسلام اور عالم اسلام سے تنفر اور بعد میں جو محسوس حد تک کمی ہوئی ہے، اس میں ان عالمی اجتماعات کا بہت بڑا حصہ ہے، جن سے دور رہنے یا جن کو حقیر سمجھنے کے بجائے دنیا کے بڑے بڑے ملک ان میں اپنے وفود کی شرکت کے لیے دوڑ لگانے لگے ہیں۔ یوں بھی یہ ظاہر ہے کہ بین الاسلامی اتحاد ایک ایسا گراں قدر اثاثہ ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو عزیز ہے۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ ابتدا ہی سے اسلامی اتحاد وتعاون کے داعی رہے ہیں۔‘‘

نمائندہ ’’ندائے ملت‘‘ نے پوچھا کہ اس اتحاد کے قیام واستحکام کے لیے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ رابطہ عالم اسلامی جیسی تنظیموں کو تمام متنازعہ سیاسی مسائل سے دور رکھا جائے؟

دونوں حضرات نے نمائندہ ’’ندائے ملت‘‘ سے وضاحت چاہی کہ متنازعہ سیاسی مسائل سے کیا مراد ہے؟ نمائندے نے ہندوستانی مسلمانوں، ذیلی براعظم کی اقلیتوں اور کشمیر کے مسائل کا نام لیا، جو اکثر پاکستان نے ایسے بین الاسلامی اجتماعات میں اٹھائے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے نمائندے کو بتایا کہ ’’جہاں تک رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کا تعلق ہے، اس کے ۱۹۶۲ء کے پہلے اجلاس میں مولانا مودودی نے مسئلہ کشمیر پر ایک ریزولشن پیش کیا تھا۔ جس نشست میں یہ ریزولشن پیش ہوا اور اس پر بحث ہوئی، میں اس میں شریک نہیں تھا، جس کی وضاحت میں ۶۲ء ہی میں کر چکا ہوں، لیکن ۶۳ء میں رابطہ عالم اسلامی کے اساسی ارکان کا جو اجتماع ہوا، اس میں نہ اس قسم کی کوئی قرارداد پیش ہوئی اور نہ کسی نے ان مسائل کو اٹھایا، اس کے بعد ۶۴ء میں جو اجلاس ہوا، اس میں میں شریک ہی نہیں ہو سکا تھا۔ لہٰذا اس کی تفصیلات پر میں روشنی نہ ڈال سکوں گا۔‘‘

نمائندہ نے دریافت کیا کہ ’’اس قسم کے خالص اسلامی اجتماعات میں ایسے متنازعہ مسائل کو اٹھانے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟‘‘

مولانا نے فرمایا کہ ’’ہمارے نزدیک بین الاسلامی اجتماعات میں ایسے مسائل کا اٹھانا مفید نہیں ہے۔ اب تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ پاکستان نے مسائل اٹھائے ہیں، تو ان کے جواب میں ہندوستان نے بھی اپنے سرکاری وفد بھیج کران کا جواب دینا شروع کر دیا ہے۔‘‘

نمائندہ ’’ندائے ملت‘‘ نے سوال کیا کہ ’’اگر اس بار وہاں مؤتمر میں کشمیر یا ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اٹھائے گئے تو آپ حضرات کا رویہ کیا ہوگا؟‘‘

مولانا نعمانی نے فرمایا کہ ’’ہمارا موقف واضح ہے، ہم ان مسائل پر اپنی رائے کا بار بار اظہار کر چکے ہیں، کشمیر ہو یا دونوں ملکوں کی اقلیتوں کے مسائل، ہمارے نزدیک ان کا حل وہی ہے جس کی سمت شری جے پرکاش نرائن اور خود شیخ عبداللہ نے بھی بار بار اشارہ کیا ہے، یعنی مسئلہ کا حل ایسا نکالا جائے جس سے دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ موجودہ حالات میں ذیلی براعظم کی اقلیتوں کو، جن میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا ہے اور اکثر و بیشتر ان کے ساتھ انصاف و مساوات کا سلوک نہیں کیا جاتا، ہم ان مسائل پر جو کچھ یہاں کہتے ہیں، وہ ہماری سوچی سمجھی ایماندارانہ رائے ہے، اور دنیا کے جس حصہ میں بھی ہمیں ان مسائل پر رائے ظاہر کرنے کی ضرورت ہوئی، ہم وہاں یہی رائے ظاہر کریں گے، اس کے سوا ایک صاحبِ ضمیر اور با اصول شخص سے کسی اور بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔‘‘

اشاریے

شخصیات

(آ - ا)

کتابیں اور جرائد

(ہ۔و۔ی)

(دیگر)

مقامات

(آ۔ا)

(ب۔پ۔ت۔ٹ)

(س-ش-ص-ض)

(ط-ع-غ)

(ف-ق-ک-گ)

(ل-م-ن)

(ہ-ی)

ادارے، تنظیمیں اور تحریکات

(آ-ا)

(ب-پ-ت)

(ج-خ-د-ر)

(س-ش)

(ع-ک)

(ل-م-ن)

متفرقات